امیر تیمور

اس کا نام تیمور تھا — امیر تیمور جس کی ...
سے زمین و آسمان لرزاں تھے - وہ کسی بادشاہ کا
بیٹا تھا نہ کسی قوم کا سردار ، اس نے جو کچھ
کیا اپنے زورِ بازو سے کیا ؛ اس نے نصف دنیا
کی افواج کو شکست دی ، پے در پے شہروں کو
برباد کیا اور اپنی خواہش کے مطابق انہیں دوبارہ
تعمیر کیا - اس کے تصرف میں دنیا بھر کے
خزانے تھے ، دنیا بھر کا حُسن اس کے قدموں
میں تھا - اپنی چند روزہ زندگی میں جو کارنامے
اس نے انجام دیے وہ شاید ھی کسی اور انسان
کو میسر آئے ہوں ؛ اس نے ایک خاندان کی بنا
ڈالی ، تاج و تخت کی بنا ڈالی ، ایک نئے طرزِ تعمیر
کی بنا ڈالی ، ایک پائدار تہذیب کی بنا ڈالی -
اس کی ہر دم تازہ و جواں ، پیہم رواں دواں
زندگی کو لفظوں میں ڈھالنے کے لیے ہیرلڈلیمب
جیسے بلند منزلت مصنف کے قلم کی ضرورت تھی
جو، حرکت میں، اس کے تُندخُو اور گرمِ جولاں
گھوڑوں کا ساتھ دے اور ، سکون میں ، اس
کی ہنگامہ خیز مجلسوں کا امین ہو -
اس کتاب کا ترجمہ پاکستان کی بیدار مغز اور
بیدار دل شخصیت ، ماہر سیاسیات حرب ،
بریگیڈیر گلزار احمد نے کیا ہے -

سرورق ٭ حنیف رامے

7/-

امیر تیمور

"لرزندۂ جہان"

سلسلۂ تاریخ و سوانح

۵

سلسلۂ تاریخ و سوانح

مدیر • حنیف رامے

۱، الحسین

۲، الہارون

۳، خالد، سیف اللہ

۴، چنگیز خان، فاتح عالم

۵، امیر تیمور، لرزندۂ جہان

۶، عمرو بن العاص، فاتح مصر

۷، الزہرا

۸، محمد، رسول اللہ

۹، ابوبکر، صدیق اکبر

۱۰، عمر، فاروق اعظم

۱۱، پہلی صدی کے مسلمان

۱۲، عالم عرب

امیر تیمور

مصنف : ہیرلڈ لیمب

مترجم : (بریگیڈیئر) گلزار احمد

امیر تیمور

"لرزندۂ جہان"

مکتبۂ جدید (انارکلی) لاہور

بالاشتراک مکتبہ فرینکلن لاہور ، نیویارک

بار اول : ۱۹۵۶ء

ناشر : رشید احمد چودھری، مکتبۂ جدید لاہور ● طابع : سویرا آرٹ پریس ، لاہور

"از ہیبتِ شاہِ جہاں، لرزد زمین و آسماں"

ترتیب

دوسرا حصّہ

تیسرا حصّہ

چوتھا حصّہ

حواشی

کتب نامہ

ماخذ

یورپی ماخذ اور سیاح

ثانوی مشرقی مآخذ،

عام تواریخ،

سمرقند اور آثارِ قدیمہ،

متفرق،

فوجی اصطلاحات (غیر مانوس)

آرام گاہ
شہنشاہِ دوران، سلطان جہاں پناہ
صاحب سیف، تیمور پادشاہ
فاتح عالم

(سمرقند میں مقبرۂ تیمور کی ڈیوڑھی کا کتبہ)

پیش لفظ

پانچ سو پچاس سال کی بات ہے کہ ایک شخص نے دنیا کو فتح کرنے کی کوشش کی۔ اس نے جو بھی کام کیا کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ اس کا نام تیمور تھا۔

اس کا وطن ایشیا تھا۔ وہ سرزمین جس نے دنیا کے مشہور ترین فاتح پیدا کیے۔ اپنے وطن میں اس کا تمام تر اثاثہ چند مویشی تھے اور تھوڑی سی اراضی۔ اس کا خاندان بھی چنداں معروف نہ تھا۔ سکندر اعظم ایک بادشاہ کا بیٹا تھا اور اس کی فتوحات کا انحصار اس فوج پر تھا جو اسے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ چنگیز خاں ایک قبیلے کے سردار کا لڑکا تھا اور اس کے تصرف میں مغلوں کی لاتعداد قوم تھی۔ قدرت نے تیمور کو اس وراثت سے محروم رکھا تھا مگر اس نے اپنی ہمت و ذہانت سے اپنے گرد قوم کو اکٹھا کر لیا جس کا مرکز اس کی ذات تھی۔

یکے بعد دیگرے اس نے نصف دنیا کی افواج کو شکست دی۔ پے بہ پے وہ آباد شہروں کو برباد کرتا اور اپنی خواہش کے مطابق انھیں دوبارہ آباد کرتا۔ جن شاہراہوں پر اس کا تسلط تھا وہ دو برّاعظموں کو ملاتی تھیں۔ اس کے تصرف میں عظیم الشان مملکتوں کی دولت تھی اور وہ اسے اپنی خواہشات کے مطابق صرف کرتا تھا۔ دشوار گزار پہاڑیوں کی چوٹیوں پر وہ مہینوں میں عالیشان محلات تعمیر کراتا اور وہاں عیش و عشرت کی داد دیتا۔ اس چند روزہ زندگی میں جو کچھ اس نے انجام دیا وہ شاید ہی کسی اور انسان کو میسّر ہوا ہو۔

تیمور کو ہم آج بھی تیمور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آج یورپ کی کتابوں میں اس کی

مملکت کو تیموری مملکت کہا جاتا ہے۔ گو یورپ کے باشندے جو اس کے ہمعصر تھے، آج سے پانچ سو سال قبل اس کی مملکت کو تاتاری ملک کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں انھیں صرف ایک موہوم سا خیال تھا کہ یورپ کی حدود کے اُس پار سنہری خیموں میں ایک مطلق العنان اور ظالم بادشاہ اپنے گرد و پیش پر حکومت کر رہا ہے۔

اس کے برعکس ایشیا اس سے پوری طرح آشنا تھا۔ ایشیا والوں کو اس پر فخر بھی تھا اور اس سے وجہ پرخاش بھی۔ اس کے دشمن اسے بھیڑیا سمجھتے تھے جو دُنیا کو کھائے جا رہا تھا اور دوستوں کی نگاہ میں وہ شیرِ نر فاتح تھا (اور ملٹن نے قصے کہانیوں سے سنے ہوئے حالات کے رنگ میں اپنی نظم میں تیمور کے کردار کا ایسا بھیانک تصور قائم کیا کہ اس نے وہ جامہ شیطان کو پہنایا)۔ عجیب بات یہ ہے کہ شاعروں کے تخیلات کا جواب تاریخ دان نے خاموشی سے دیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ "جواب جاہلاں باشد خموشی"، بلکہ صرف اس لیے کہ وہ کسی خاندان سے متعلق نہ تھا۔ اس نے خاندان کی بنا ضرور ڈالی تھی مگر وہ اس خاندان کی پہلی کڑی تھا اور پہلی کڑی پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس نے تاج و تخت کی بنا ڈالی مگر اپنی عمر اسپِ تازی کی پیٹھ پر گزار دی۔ اور جب اس نے تعمیرات کی طرف توجہ کی تو اس نے کسی سے درس نہ لیا بلکہ اپنے ذہن کی تخلیق سے ساختمانی کے ایک نئے اور اچھوتے طرز کو وجود میں لایا۔ دمشق کو جب اس نے نذرِ آتش کیا تو شاید وہاں کے واحد گنبد نے اس کے دل میں اپنے وطن کی فلک بام چوٹیوں کی یاد تازہ کر دی تھی اور اس کے تخیل نے ان چوٹیوں اور گنبد سے جو نقشہ بنایا اس سے اس نے نئی طرز کی ساختمانی تشکیل دی۔ یہی نقشہ آج روس کی تمام عمارتوں کا ماخذ ہے اور یہی تصور دُنیا کی عجیب ترین عمارت تاج محل کی ساخت میں کارفرما ہے۔ ایک مغل کے ذہن کا شاہکار، آلِ تیمور کی لافانی یادگار۔

پیش لفظ

تاریخ نے تیموری عہد کے یورپ پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ تاریخ دان ہمیں بتاتا ہے کہ اس زمانے کے وینس میں کس طرح مجلسِ عاشرہ برسرِ اقتدار تھی۔ ڈانٹے سے تقریباً ایک پُشت بعد پیٹرارچ اس زمانے کا مسولینی بننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پیٹرارچ ان دنوں اپنی تحریروں میں مصروف تھا۔ فرانس میں صد سالہ جنگ طول کھینچے جا رہی تھی۔ خاندانانِ آربین و برگنڈی نیم پاگل چارلس ششم کی نگاہوں کے سامنے پیرس کے فصیلوں سے نبرد آزما تھے۔ یورپ ابھی کم سن تھا اور وسطی دور کی جہالت کا پردہ اس کی آنکھوں سے نہ ہٹا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کی شوخ چنگاریاں ابھی شعلہ بار نہ ہوئی تھیں۔

تہذیب و تمدن کی آسائشوں کے لیے یورپ ابھی مشرق کا مرہونِ منت تھا۔ حریر و دیبا، چاندی اور سونا، لونگ، الائچی، دارچینی اور زیرہ، لوہا اور فولاد بلکہ چینی کے دیدہ زیب برتن مشرق کے گوداموں سے نکل کر یورپ کی منڈیوں میں خشکی کے راستے آتے تھے۔ اس بڑی تجارت کی وجہ سے وینس اور جینوا کو دولت کی فراوانی نے چار چاند لگا دیے تھے۔ یورپ پر مشرق کا ایک اور احسان بھی تھا۔ ہسپانیہ میں تمدن و علم و ہنر کے مرکز اشبیلیہ اور قرطبہ کی صورت میں عربوں نے تعمیر کیے تھے اور انھیں کے ہاتھوں نے غرناطہ میں الحمرا جیسا اعجوبۂ روزگار محل تکمیل کو پہنچایا تھا۔ اور تو اور قسطنطنیہ بھی نیم مشرقی تھا۔

سائبیریا کی ریل پر ایک چھوٹا سا الحاقی سٹیشن ہے جہاں آج ایک کتبہ نظر پڑتا ہے۔ اس کے ایک طرف یورپ اور دوسری طرف ایشیا لکھا ہوا ہے۔ تیمور کے زمانے میں اگر کسی کو یہ کتبہ نصب کرنے کا خیال پیدا ہوتا تو وہ اسے وینس میں نصب کرتا۔ اس زمانے میں یورپ کی اہمیت ایشیا کے ایک صوبے سے زیادہ نہ تھی۔ ایک ایسی ولایت جہاں چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور جاگیرداروں کی کارفرمائی تھی۔

جہاں کے شہر قصبوں سے بھی کم تر تھے۔ تاریخ دان کہتا ہے کہ وہاں کی زندگی شکستہ جھونپڑوں میں آہ و بکا اور نالہ و فریاد کے سوا کچھ نہ تھی۔

تعجب ہے کہ ہم اس دور کے یورپ سے تو آگاہ ہیں مگر ہمیں اس صاحب عزم انسان کے حالات کا علم نہیں جس نے تسخیر عالم کا بیڑا اٹھایا۔ اس دور کے یورپی جب اس کے کارناموں کو سنتے تو انھیں یقین نہ آتا۔ وہ انھیں ناممکن قرار دیتے اور جب انھیں ان کارناموں کی صحت کا یقین ہو جاتا تو اسے فوق الانسان قرار دے کر خاموش ہو جاتے۔ جب وہ یورپ کی دہلیز پر نمودار ہوا تو شاہان یورپ نے "شہنشاہ تاتار عظیم الشان تیمور لان" کی خدمت میں سفیر روانہ کیے۔ انگلستان کے ہنری چہارم نے جو پرشیا کے شہزادوں کے ساتھ دور دراز ممالک میں جنگیں لڑ چکا تھا، تیمور کی فتوحات پر اسے مبارک باد پیش کی۔ فرانس کے چارلس ششم نے "فاتح تیمور" کی تعریف میں قصیدے ارسال کیے۔ دور اندیش جینوی نے اپنا علم قسطنطنیہ کے باہر بلند کیا۔ اور شہنشاہ یونان مینوئل نے امداد کی گزارش پیش کی۔ ڈان ہنری "خدا کی رحمت سے کیسٹیل کے بادشاہ" نے تیمور کے دربار میں شہزادہ روئی دی گونزا لینز کلاویخو کو سفیر بنا کر بھیجا جو سمرقند تک تیمور کی بارگاہ میں باریابی کے لیے گیا اور واپسی پر یورپ کو اپنے انداز میں آگاہ کیا کہ تیمور کون تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"تیمور، بادشاہ سمرقند جب مغلوں کی تمام سرزمین کو فتح کر چکا اور ہندوستان بھی۔ تو اس نے سرزمین آفتاب پر جو وسیع مملکت ہے، توجہ کی اور اسے بھی سر کیا۔ شاہ خوارزم کو بھی زیر کیا۔ پورے ایران و مازندران کو فتح کیا جن میں تبریز اور سلطان کا دار الخلافہ بھی شامل ہیں۔ ملک رشیہ اور باب الابواب کو بھی تہ تیغ کیا۔ ساتھ ہی آرمینیا کو چاپ۔ ارض روم اور بلاد کرد بھی۔ جنگ میں شہنشاہ ہندوستان کو جب شکست دے چکا اور اس کی وسیع مملکت پر قابض ہو چکا اور جب دمشق کو برباد کر چکا اور

پیش لفظ

حلب، بابل اور بغداد کے شہروں کو تسخیر کر چکا ۔ تو بہت سے ممالک کو فتح کرنے اور بہت سی جنگوں میں کامیاب ہونے کے بعد وہ ترک بایزید کے مقابلے میں آیا جو بہت ہی بڑا بادشاہ تھا اور اس سے جنگ کر کے اسے شکست دی اور اسے اپنا اسیر بنا لیا ۔"

یوں کالویخو رقمطراز ہوا ۔ وہ کالویخو جو تیمور کی بارگاہ میں باریاب ہوا اور جس نے سمرقند کے دربار میں ملک ملک کی شہزادیوں اور مصر و چین کے سفیروں کو دست بستہ دیکھا ۔ وہ خود بھی فرنگی سفیر کی حیثیت سے دربار میں شرف باریابی حاصل کر سکا تھا اور اس کے ساتھ مشفقانہ سلوک روا رکھا گیا تھا، شاید اس لیے کہ "سمندر میں چھوٹی مچھلیوں کی جگہ بھی ہوتی ہے ۔"

یورپ کے شاہوں کی فہرست میں تیمور کو شامل نہیں کیا گیا ۔ تاریخ میں بھی تیمور کے پیدا کردہ دبدبے اور خوف کی ایک ہلکی سی لہر نظر آتی ہے مگر ایشیا والوں کی نگاہ میں آج بھی اسے شہنشاہیت کا مقام حاصل ہے ۔ آج پانچ صدیوں کے بعد ہم پر عیاں ہو رہا ہے کہ وہ دنیا کا آخری فاتح تھا ۔ نپولین اور بسمارک اپنی اپنی جگہ ہیں ۔ ہم ان کے حالات کی تفاصیل سے آشنا ہیں ۔ نپولین کی موت ناکامی کی ظلمت میں واقع ہوئی اور بسمارک کو ایک ملک کی سیاسی رہنمائی سے زیادہ کچھ نصیب نہ ہوا ۔ اس کے برعکس تیمور نے ایک وسیع و عریض مملکت قائم کی ۔ اس نے جتنی جنگوں میں قدم رکھا ان میں سے فتح مند و کامران ہو کر لوٹا اور آخری مہم جس میں اس کے مقابلے کی تاب تھی اسے زیر نگیں کرنے کی غرض سے جو سفر اس نے کیا اس کے دوران میں داعیِ اجل کو لبیک کہی ۔

اس کے کارناموں کی عظمت اور اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی زندگی کے حالات کو دیکھیں اور تیمور کا مطالعہ اس نگاہ سے کریں جس

نگاہ سے اسے وہ شاہسوار دیکھا کرتے تھے جنھیں اس کی ہمرکابی کا فخر حاصل تھا۔

ہمیں وہی کچھ کرنا چاہیے جو کلاویخو نے کیا۔ خوف وہراس کے پردے کو چیر کر ہولناک کلہ میناروں کے ماوراء دیکھیں۔ قسطنطنیہ سے گزر جائیں۔ سمندروں کے اس پار ایشیا تک پہنچیں۔ اس راستے پر نظر ڈالیں جو سرزمین آفتاب کی طرف لے جاتا ہے، یعنی سمرقند کی شاہراہ اور اپنے ذہن کو پانچ صدیاں پیچھے لے جا کر ۱۳۳۵ء پر مرکوز کر دیں۔

اب ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دریا ہے۔

ماوراء النہر

ہمارا بہادر نائٹ کلاویخو کہہ اٹھا:

”یہ اُن چار دریاؤں میں سے ہے جو جنت میں سے بہہ کر آتے ہیں“

اور پھر: ”یہ ملک حسین، خوشنما اور خوش باش ہے۔“

دُور اُفق پر پہاڑوں کے سلسلے جو بلند ہوتے ہوتے برف پوش کوہِ سلیمان نام کی چوٹی تک پہنچتے تھے۔ اُبھرتی اور دبتی ہوئی دامنِ کوہ کی پہاڑیاں سبز سبز گھاس سے ڈھکی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان سے صاف شفاف سرد پانی کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ بلندیوں کے اس سرسبز خطّے میں بھیڑیں اپنے چرواہوں کی زیرِ نگرانی بے تکلف چر رہی ہوتی تھیں اور ذرا نیچے کو ہٹ کر دیہات سے قریب گھنی گھاس میں مویشی چر رہے ہوتے۔

دریا چونے کے پتھر کی چٹانوں میں سے بل کھاتا ہُوا بہہ رہا تھا۔ ہموار علاقے میں پہنچ کر شہتوت اور انگور کی بیلوں سے لدی ہوئی وادی میں سے بہتے ہوئے دریا کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی اور اس میں سے چھوٹی چھوٹی جوئباریں نکال لی گئی تھیں جو دھان، تربوز اور جَو کے کھیتوں کو سیراب کرتی تھیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رہٹ اپنی آواز سے اس خاموشی کو توڑتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ پانی کو اٹھا کر جوئباروں کی سطح تک پہنچا رہے تھے۔

اس دریا کو یہ آمو دریا کہتے تھے۔ یہ صدیوں سے ایران و توران کی حد تھا

جاتا تھا۔ شمال اور جنوب کے درمیان حدِ فاصل۔ اس کے جنوب کی جانب خراسان تھا۔
سرزمینِ آفتاب جہاں ایرانی فارسی زبان بولتے تھے اور ہل چلا کر گزر اوقات کرتے
تھے۔ متمدن اور عمامہ باندھنے والے مہذب لوگ۔

اور اوراء یعنی شمال کی طرف توران تھا جس کی نامعلوم گہرائیوں سے نکل کر خانہ
بدوش آتے تھے۔ گھوڑے اور مویشی پالنے والے کلاہ پوش۔ اس دریا کے سوا کوئی
حدِ فاصل نہ تھی اور اسی لیے اس سے شمال کی سرزمین کو ماوراءالنہر کہتے تھے۔ دریا
کے اُس پار۔

سمرقند جانے کے لیے مسافر کو یہی دریا عبور کرنا پڑتا تھا۔ دریا کے بعد اسے
اخروٹ کے گھنے جنگل سے گزرنا پڑتا تھا۔ پھر ریتیلے پتھر کی چھ سو فٹ اونچی وہ
تنگ گھاٹی جہاں صدا کی بازگشت سے کلیجا منہ کو آتا تھا۔ اسی کا نام آہنی دروازہ تھا
جہاں سے ایک وقت دو لدے ہوئے اونٹوں سے زیادہ تعداد نہ گزر سکتی تھی۔
یہاں دو مہیب پہرہ دار کھڑے رہتے تھے۔ مسافروں کے چہروں کو سنجیدگی سے
دیکھتے ہوئے۔

یہ سب قوی الجثہ تھے۔ ان کی جھکی ہوئی مونچھیں ان کے چہروں کو خوفناک بنا
رہی تھیں۔ وہ آہستگی سے بولتے اور اپنے الفاظ کو ذرا طول دے کر ادا کرتے تھے
جیسے ہر لفظ سوچ کر بولا جا رہا ہو۔ ان کے جسم پر فولادی زرہ تھی اور سر پہ خود اور
اوپر گھوڑے کے بالوں کی کلغی۔ یہ تھے تاتاریوں کی سرحد کے محافظ۔

آہنی دروازے سے گزرنے کے بعد جہاں پہلی سرائے تھی، وہ جگہ نہایت زرخیز تھی
اس کے درمیان سے ایک چھوٹا سا دریا بہتا تھا جیسے یہ دریا اس خطے کے لیے
مخصوص ہو۔ اسے چاروں طرف سے پہاڑ گھیرے ہوئے تھے۔ اس جگہ کا نام شہرِ سبز
تھا۔ اس کے گرد پانی سے بھری ہوئی خندق تھی۔ پہلی نظر انجیر اور زرد آلو کے پھولوں

سے لدے ہوئے درختوں سے گزر کر اندرونِ شہر کے مزاروں کے سفید گنبدوں اور
شمال نیزہ بلند میناروں پر پڑتی تھی۔ یہی مینار پہرہ داری کا کام بھی دیتے تھے۔

تیمور کی پیدائش یہاں شہر سبز ہی میں ہوئی تھی۔ اور اسے اس سے انس تھا۔
اس کے گھر کی دیوار خام اینٹوں کی تھی۔ مکان لکڑی کا تھا۔ صحن کی فصیل کے اندر حسبِ
دستور ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا۔ مکان کی چھت ہموار اور منڈیر دار تھی جس کے
سائے میں اگر کوئی چاہتا تو لیٹ کر شام کو کھیتوں سے لوٹتے ہوئے مویشیوں اور
بھیڑوں کو خاموشی سے دیکھتا رہتا اور مؤذن کی صدا کو دل لگا کر سنتا رہتا۔

یہاں دراز ریش کھلے ریشمی عبا پہنے ہوئے لوگ بھی آتے جو اپنے قالینوں پہ
محو استراحت ہو کر قافلوں اور دوسرے واقعات کی باتیں کرتے مگر اکثر ان کا موضوع
سخن جنگ ہوتا، اس لیے کہ جنگ کا سایہ اس شہر سبز پر چھا چکا تھا۔

تیمور اکثر یہ جملہ سنتا رہتا "بہترین مونگین ٹولہ ابھی مرد کے سامنے صرف
ایک ہی راستہ ہے"

اس نے اس کے متعلق کبھی اتنا زیادہ فکر نہ کیا تھا۔ بزرگوں کے الفاظ قانون
کا درجہ رکھتے تھے مگر نوجوان ان کے الفاظ سے زیادہ ان کے ہتھیاروں کی طرف توجہ
دیا کرتے۔ ان جواں مردوں کی نگاہ میں تلوار کی دھار کی تیزی اور تیر سے کی ٹوٹی ہوئی
انی زیادہ قابلِ توجہ تھی۔

یہ بچے گھوڑوں کے ساتھ پل کر جوان ہوتے تھے۔ چراگاہوں اور بیابانوں میں
جہاں کہیں انھیں کھلی زمین میسر آتی وہ شہسواری میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے
رہتے۔ کبھی سوار کا مقابلہ اور کبھی اسپِ تازی کا مقابلہ۔ مگر ان کا رخ سمرقند ہی کی
طرف ہوا کرتا۔ یہ شہسوار خالی ہاتھ نہ رہتے تھے۔ یہ تیر کمان سے مسلح ہوتے اور ان
سے چرند و پرند کا شکار کرتے رہتے۔ ان کا ایک محل بھی تھا۔ چٹانوں کے سائے میں

ایک کشادہ سا غار قلعے اور محل کا کام دیتا تھا اور اسی میں وہ اپنے شکار کی یادگاریں محفوظ کیا کرتے تھے۔ اسی قلعے کے ارد گرد وہ جنگی کھیل کھیلا کرتے تھے۔ کبھی حملہ کبھی دفاع اور کبھی محاصرہ۔ جب ان کے گھوڑے چرتے رہتے ہوتے وہ اس کھیل میں محو ہو جاتے اور ان کے وفادار کتے کنکھیوں سے نیم خوابیدہ حالت میں ان کا کھیل دیکھتے رہتے۔ تیمور ان جنگی کھیلوں میں سردار ہوتا۔ اس کی فوج تین چار ساتھیوں پر مشتمل ہوتی۔ مگر تھی فوج اور شغل بھی وہی ہوتا جو فوجوں کا ہوا کرتا ہے۔

تیمور یہ کھیل نہایت سنجیدگی سے کھیلا کرتا اور کبھی کسی بات کو ہنسی مذاق نہ سمجھتا۔ گو اس کے گھوڑے اتنے اچھے نہ تھے جتنے اس کے ساتھیوں کے تھے مگر شہسواری میں یہ ان سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ جونہی وہ اتنے بڑے ہو گئے کہ انھیں شکاری تلواریں عطا ہوئیں، تیمور نے اس کے استعمال میں خوب مہارت پیدا کر لی۔

ممکن ہے کہ اس سنجیدگی کا باعث اس کی تنہا زندگی ہو۔ اس کی والدہ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور اس کے والد جو برلاس تاتاریوں کے سردار قبیلہ تھے اپنا وقت سبز عمامہ پوش بزرگوں کے ساتھ گزارا کرتے جو دور دراز مقدس مقامات کی زیارت سے فیض حاصل کرنے آتے تھے۔ تیمور تنہا ضرور تھا مگر بیکار نہ تھا۔ اس کے اپنے گھوڑے تھے، باز تھے اور کتے تھے۔ یہ سبھی کچھ تھا مگر امارت نہ تھی۔ آدھا اصطبل خالی رہتا تھا۔ اس کے والد گو سرداروں میں شامل تھے مگر ذی حکم سرداروں میں شمار نہ تھا۔ وہ صاحب سیف خاندان میں سے تھے اور جیسا کہ عام معمول ہے صاحب سیف کے پاس دولت کم ہی ہوتی ہے۔

نوجوان تیمور دن بھر گھڑ سواری کرتا اور سمرقند کی سڑک کی طرف اکثر دیکھا کرتا۔ اسی سڑک سے ایرانی قافلے گزرا کرتے تھے۔ امیر، باثروت اور دولتمند تاجروں کے تجارتی قافلے جن کی بانقاب عورتوں کے گرد محافظوں کا حلقہ ہوتا۔ تاتاری عورتوں سے

کس قدر مختلف جن کا حسن نقاب کا دست نگر نہ تھا۔ اور یہاں سے دُبلے پتلے بلند قامت گھوڑوں کے سوداگر عرب بھی گزرا کرتے تھے۔ شمالی کرگھوں سے بہترین ریشمی قالین اور خطا سے خام ریشم لے جاتے ہوئے انھیں اسی راستے سے گزرنا ہوتا تھا۔ اس ندی نالے دھول کو اڑاتے ہوئے غلاموں کے قافلے بھی یہاں سے اکثر گزرا کرتے تھے۔ ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں کشکول لیے گداگروں اور درویشوں کی بھی کمی اس راہ پر نہ تھی۔

کبھی کبھی کوئی یہودی بھی اپنے خچر پر سوار یہاں سے گزر جاتا اور ہندو تاجر بھی اس دور دراز ملک میں افغان ڈاکوؤں کا نوحہ کرتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ شام کے وقت جب کارواں سرائے میں پہنچتے تو خیمے گاڑ چکنے کے بعد الاؤ اور چولھے جلا لیے جاتے۔ غروب آفتاب، انسانوں، اونٹوں، خچروں اور گھوڑوں کی ملی جلی آوازیں کہیں کہیں پسِ نقاب نقرئی قہقہے اور آسمان کی طرف بلند ہوتا ہوا دھواں ایک عجیب سا منظر پیدا کر دیتا اور اس منظر میں تیمور دوزانو بیٹھ کر کارواں والوں کی داستانیں سنتا۔ مختلف اشیا کی بڑھتی اور گھٹتی ہوئی قیمتوں پر تبصرے سنتا اور سمرقند میں بیٹھ کر دنیا کی خبروں سے محظوظ ہوتا۔ جب اس کے والد نے اسے قافلے والوں کی صحبت میں بیٹھنے کی وجہ سے بُرا بھلا کہا تو اس کا جواب نہایت سادہ تھا:

"مرد کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔"

خود پوش نوجوان مرد

یہ پوری وادی اور جو کچھ اس میں تھا وہ پر اس قبیلے کا تھا۔ یہ کہنا کہ یہ سب ان
کی ملکیت تھا اس لیے درست نہ ہوگا کہ اس سرسبز و شاداب وادی میں زراعت کرنے
اور مویشی پالنے کے وہ مجاز تھے مگر صرف اس وقت تک جب تک کہ ان کے بازوؤں
میں قوت اور ان کی آبدار تلواروں کی دھار تیز تھی۔ سلسلۂ کوہ کے اس پار جو پٹھان
رہتا تھا اس نے ان کے آبا و اجداد کو عرصہ ہوا یہ وادی عطا کی تھی۔ سکاٹ لینڈ کے
قبائل کی طرح وہ بھی اس وادی پر قابض تھے مگر اپنے ذہن و بدن کی تندرستی و
توانائی کے بل بوتے پر اور اپنے سرداران قبیلہ کی دوراندیشی و معاملہ فہمی کے سہارے

وہ تاتاری تھے۔ بلند بالا و بلند آشیاں۔ طویل الجثہ اور مضبوط البدن۔
تمازت آفتاب سے چہرے گندمی اور ان پہ داڑھی کی زیبائش۔ وہ پاپیادہ بہت
کم چلتے تھے مگر جب چلنا ہی پڑتا تو ان کی چال میں ایک عجیب بانکپن اور تمکنت و
غرور کا انداز ہوتا اور کیا مجال جو کسی ہم قبیلہ یا ہم پلہ قبیلے کے فرد کے سوا وہ
کسی کی جانب دیکھنے کی زحمت گوارا کر جاتے۔

وہ سب گھوڑوں کے ریوڑ پالتے، مضبوط، بردبار اور کوہستان کے عادی۔
بہت کم تھے جن کی مالی حالت عیاشانہ گھوڑوں یا چوگان باز اسپ تازی پالنے
کی اجازت دیتی۔ مگر ان کے گھوڑوں کی باگ میں چاندی کا کام ضرور ہوتا اور ان کے
زینوں پر کشیدہ کاری اور بیل بوٹے بہ افراط ہوتے۔ غریب تاتاری

اپنے خیمے سے مسجد جاتے وقت پا پیادہ جانے کا خیال تک نہ لا سکتا۔ وہ شہسوار تھے اور شہسواروں کو سست رفتاری سے کوفت ہوتی ہے۔

خیموں کی زندگی سے انھوں نے آغاز کیا تھا اور اب یہ زندگی ان کے خون میں رچ چکی تھی۔ ان کے ہاں مثل مشہور تھی "صرف بزدل ہی چھپ کر رہنے کے لیے قلعے اور مینار بناتا ہے"[1]۔ ان کے خیمے اون کے سفید گنبد ہوا کرتے اور بعض اوقات قالینوں سے پُر شامیانے ان پر سایہ کرتے۔ عام طور پر ہر ایک کا شہر میں ایک مکان ضرور ہوتا جس میں وہ مہمانوں کی ضیافت کا انتظام کر سکتے یا بوقت ضرورت اپنی مستورات کو وہاں بھیج دیتے تھے۔ ایک سو سال قبل تو یہ تاتاری حقیقتاً خانہ بدوش تھے۔ چراگاہوں کی تلاش میں صحرائیں سرگرداں۔ جنگ کے طفیل ان کے آبائو اجداد ایشیا کے بیشتر حصے کے مالک بن چکے تھے اور یہ بہمہ معانی و تیغوں کے سایے میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ وہ اپنے قبیلے کے اس معروف قول کی حقیقت سے آشنا تھے!

"صحرا کی ریت ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے اڑ جاتی ہے۔ انسان کی دولت اس سے بھی ہلکے جھونکے کی تاب نہیں لا سکتی۔"

اور جب وہ ضیافتوں میں جاتے تو خوب ہی دادِ عیش دیتے۔ وہ جامِ ارغواں کو دیکھ کر آنسو بہاتے مگر جب وہ جنگ کا رُخ کرتے تو ان کی مسکراہٹوں

---

[1] تیمور کا قبیلہ مختلف ناموں سے مشہور تھا کوئی انھیں دیو کہتا اور کوئی بے پناہ جنگ آزما۔ مگر بالعموم انھیں تاتاری ہی کہا جاتا تھا اور سب سے پرانی تاریخیں انھیں یہی نام دیتی ہیں۔ وہ شمالی ایشیا کے باشندے تھے جو اس سے پہلے سیتھین بھی کہلاتے چلے تھے اور کبھی کبھی ترک بھی۔ سیلابِ منگول کے ساتھ وہ شمال سے آئے تھے اور اس زرخیز پہاڑی علاقے میں آباد ہو گئے تھے

کی انتہا نہ ہوتی۔ شاید ہی کوئی فرد ہو جس کے چہرے پر زخموں کے سفید نشان نہ ہوں۔ چھت کے سایہ میں موت کو لبیک کہنا ان کا دستور نہ تھا۔ زرہ کا استعمال ان کی عادت میں داخل ہو گیا تھا۔ جنگ کے ماحول نے یہ چیز ان کی فطرت میں ڈال دی تھی اور وہ دھاریدار ریشم کے چغے کے نیچے فولادی زنجیروں کی زرہ پہن کر باہر جاتے۔

زمانہ صلح میں وہ اپنا جوش و خروش شکار میں مشغول رہ کر پورا کرتے اور یوں ان کے تند و تیز خون کی حرارت برقرار رہتی۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے آنے والے انھیں باز و شاہین دے کر آسانی سے ان کی بھیڑیں لے جاتے۔ باز سے انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا تھا مگر شاہین کا کیا کہنا۔ جب وہ ہرن پر جھپٹ کر اسے دبوچ لیتا تو پورے خاندان کی نیک نامی کا باعث بنتا۔ بعضوں نے سدھائے ہوئے چیتے بھی پال رکھے تھے جنھیں پنجروں میں بند رکھا جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی تھی۔ جب ہرن کے نظر آنے پر یہ پٹی کھول دی جاتی تو چیتا سیدھا ہرن کے پیچھے ہو جاتا اور یہ شہسوار اس کا تعاقب کرتے اور یوں ان کے گرم خون کی شدت میں سکون پیدا ہوتا۔

لانبی، بھاری کمان کے تو وہ ماہر تھے۔ دونو کے تیر سے وہ اڑتے پرندوں کو گرا لیتے اور شیروں کا مقابلہ پا پیادہ کرتے۔ جب قالین پر وہ کھانا کھانے بیٹھتے تو یہ گرم خون شہسوار ایک ہی برتن میں کھاتے۔ ان کے باز پاس ہی درختوں پر سے شور مچا رہے ہوتے اور ان کے وفادار کتے ان کے پیچھے خاموش بیٹھے ہوتے۔ ان کی مرغوب غذا شکاری پرندے، گھوڑے کا گوشت اور اونٹ کا کوہان تھا۔

وہ عربوں کے بلند اخلاق کے مداح تھے اور خشک صحرا کے مکینوں کی طرح یہ بھی جب زمین پر بیٹھتے تو بیتاب ہو جاتے۔ شکار، حملے اور علمِ جنگ کے ساتھ چلنے ہی سے یہ بیتابی کم ہوتی تھی۔ ان کا بہت سا وقت بادشاہ گر کے دربار میں بھی گزرتا تھا۔ خاندانِ برلاس کا غرور جنگی نسل کا غرور تھا۔ ان کی امارت اور سرداری شمشیر کی

خود پوش جواں مرد

سرداری تھی۔ تاجروں اور زراعت پیشہ لوگوں میں شادی کر کے وہ اپنی نسل کو برباد نہ
کرنا چاہتے تھے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ چونکہ وہ سوداگری کے ڈھنگ سے ناواقف
تھے مالی طور پر وہ تباہی سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔

وہ حد درجہ فیاض تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بے وجہ فیاض تھے مگر اسی قدر
بے وجہ خود سر اور ظالم بھی۔ معمولی سی ضیافت کے لیے وہ اپنی جائداد بخش دیتے یا رہن
رکھ دیتے۔ مہمان نوازی کو وہ فرض کا مقام دیتے تھے اور ان کے صحن مسافروں سے پُر
رہتے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی بھیڑیں قطار اندر قطار دیگوں کی طرف بڑھائی جاتی رہتیں۔

قبیلۂ برلاس کے علاوہ جو قبیلے شہر سبز کی وادی میں آباد تھے وہ خانہ بدوش تھے۔
ایرانی کاشت کار اپنی زمینوں، کھیتوں اور آبپاشی کی نالیوں کے ارد گرد بے روک
ٹوک اپنے کاروبار میں مصروف رہتے۔ تاجر پیشہ شہروں کے مکین اپنی دکانیں سجائے
اپنے مال کے انبار کے پاس بے دھڑک بیٹھے رہتے۔ ایرانی امرا بھی اپنے شوق پورے
کرتے رہتے۔ کوئی لہو ولعب میں مگن ہوتا، کوئی اپنے رنگین باغوں میں مصروف عیش ہوتا
اور کوئی قرآن کی تلاوت سے اپنی روح کو فیض پہنچا رہا ہوتا۔ ایرانیوں نے قانون قرآن کو
اپنا لیا تھا مگر یہ خود پوش ابھی چنگیز خاں کے نافذ کردہ قوانین سے وابستہ تھے۔

قبیلۂ برلاس کی حالت ایک اور وجہ سے بھی دگرگوں تھی۔ ان کا کوئی سردار نہ تھا۔
ترگئی جو ایک زمانے میں قبیلے کا سردار ہوا کرتا تھا، نہایت رحمدل انسان تھا۔ جس طور
پر اسلام اس کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس کا اثر اس پر کچھ اس طرح ہوا کہ اس نے
عزلت نشینی اختیار کر لی تھی۔ ترگئی تیمور کا باپ تھا۔ جب سے اس نے گوشہ نشینی اختیار
کی تھی بیرون شہر سبز سفید محل میں کوئی نہ رہتا تھا۔

ترگئی نے ایک دفعہ اپنے لڑکے سے کہا تھا "یہ دنیا اس سنہری پیالے کی مانند
ہے جس میں سانپ اور بچھو بھرے ہوئے ہوں۔ میں اب اس دنیا سے تنگ آگیا ہوں"

مگر اس نے اپنے لڑکے کو اپنے آباؤاجداد کی عظمت سے لاعلم نہ رہنے دیا۔ وہ اُسے ہر مناسب موقع پر اپنے بزرگوں کے زریں کارناموں کی داستانیں سناتا رہتا اور شمالی خطہ جو صحرائے گوبی کے اوپر ہے وہاں ان کی وسیع مملکت کا ذکر کرتا رہتا۔ یہ داستانیں زمانۂ جاہلیت کے عجیب وغریب کارناموں سے متعلق تھیں۔ ترگئی تارک الدنیا ہونے کے باوجود ان داستانوں کے سنانے میں فخر محسوس کرتا۔

وہ داستانیں ان شہسواروں کی تھیں جن کا فرش گھاس کے سرسبز قالین کے اوپر اُونی قالین کا ہوتا اور سایہ کے لیے دن کو آفتاب اور رات کو ماہتاب اور ستارے ہوا کرتے تھے۔ جن ستاروں سے انھیں عشق تھا۔ انھیں [illegible] وہ بھی مدام حرکت میں رہتے۔ گرمیوں میں جوں جوں برف پگھلتی جاتی، یہ بھی اس کے تعاقب میں بلندیوں کو بڑھتے جاتے اور موسمِ سرما کے آغاز پر جوں جوں یہ نیچے اُترتے آتے برف کے انبار در انبار ان کے عقب میں نظر آنا شروع ہو جاتے۔ اس گردشِ لیل ونہار میں کبھی ان کے گھوڑوں کے سموں کے نیچے سے برف کے گالے اُڑ اُڑ کر سفید سفوف کے بکھر جانے کا سماں پیدا کرتے اور کبھی ریت کے تودے ان کی مشقِ ناز اور ستم آفرینی کا شکار بنتے۔ وہ جہاں جاتے مالکِ کُل بن کر جاتے۔ کبھی کاروانوں کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کسی کمزور مملکت کا گلا دبوچ لیتے۔ قرن کے نشان سے مزین علم کے سایے میں انھوں نے بارہا خطا کا محاصرہ کیا اور ان محاصروں کی داستانیں بھی دلچسپ ہوتی تھیں۔ اور اس شکار کی تفاصیل بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھیں جو سیکڑوں میل تک اور کئی مہینوں تک جاری رہا کرتا تھا۔ ترگئی زمانۂ جاہلیت کی ان قربانیوں کا ذکر بھی کیا کرتا جب سردارِ قبیلہ کی قبر پر سفید گھوڑے سے قربانی چڑھا کرتے تھے اور کس طرح وہ گھوڑے آسمان کے دروازے سے جنت میں داخل ہوتے اور وہاں جاکر روحوں کو قرار اور سکون بخشتے تھے۔ آسمان کا وہ دروازہ جو دنیا کی شمالی بلندیوں کی جانب قطبِ شمالی کے قریب

واقع تھا۔

ترگئی خطا کی ان شہزادیوں کا بھی تذکرہ کرتا جو صحرا کے خوانین کی خدمت میں پیش کی جاتی تھیں اور جن کا بیش قیمت ریشمی اور ہاتھی دانت کا جہیز لاتعداد اونٹوں اور گاڑیوں پر لاد کر لایا جاتا تھا۔ اس کا ذکر کامیاب جنگوں کے اختتام اور ان ضیافتوں سے بھی خالی نہ ہوتا تھا جن میں فاتح خان اپنے دشمنوں کی کھوپڑیوں کے سنہری مرقع پیالوں سے گھوڑیوں کا دودھ پیا کرتے تھے۔

"بیٹا یہ تھے سابقہ حالات" ترگئی اکثر کہتا "خان بزرگ چنگیز خاں کی فتوحات دنیا سے پہنچے۔ تقدیر میں یوں ہی لکھا تھا اور اسی طرح ہو کر رہا۔ جب موت کے سیاہ فرشتے نے اپنے پر چنگیز خاں کے جسم پر پھیلائے تو اس نے اپنی وسیع مملکت کو چار ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ اپنے بیٹوں کے درمیان اور اپنے بڑے بیٹے کے بیٹوں کے درمیان جو اس کی زندگی ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔"

"اپنے بیٹے چغتائی کو اس نے اس خطے کی سلطنت بخشی۔ چغتائی کی اولاد البتہ جام مینا اور شکار کی دلدادہ ہو گئی اور پھر وہ شمال کے پہاڑوں کی جانب چلے گئے جہاں خان حلقہ ضیافتوں اور شکار میں مشغول رہتا ہے اور سمرقند و جملہ ماوراء النہر کی حکومت اس نے اس امیر کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے جسے بادشاہ گر کہتے ہیں۔ بیٹا باقی حالات سے تم واقف ہو۔"

"مگر بیٹا" اور عموماً وہ اپنا کلام انہیں الفاظ پر ختم کرتا "میری خواہش ہے کہ تم قانون خداوندی اور شرع محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پابند ہو کر درویشوں اور سیدوں کی دعائیں لیتے رہو اور ہمیشہ اسلام کے چہار ارکان نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے پابند رہو۔"

اکثر و بیشتر ترگئی اپنے لڑکے کو آزادی سے اپنے خیالات کی دنیا اور اپنی خواہشات

کی تکمیل میں مصروف رہنے دیا کرتا۔ ایک دن ایک بزرگ درویش صفت سیّد نے تیمور کو مسجد کے ایک کونے میں قرآن کا سبق پڑھتے ہوئے دیکھا۔ قریب آ کر درویش نے پوچھا:

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"تیمور[1]"

بزرگ درویش نے قرآن کی طرف دیکھا، کچھ سوچا اور پھر کہا۔

"بیٹا جب تک تم اسلام کا تحفظ کرتے رہو گے خود بھی حفاظتِ خداوندی میں رہو گے"

تیمور نے اس مشورے پر غور کیا اور کچھ عرصے تک چوگان بازی اور شطرنج سے بھی ہاتھ روک لیا۔ جب کبھی وہ راستے کے کنارے درخت کے سایے میں کسی بزرگ کو دیکھتا گھوڑے سے اُتر پڑتا اور اس کی خوشنودی و دعا کا طلبگار ہوتا۔ پڑھنے میں اسے دقّت محسوس ہوتی تھی اس لیے معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس نے اپنی توجہ پہلے ہی پارے پر مرکوز رکھی اور اسے اچھی طرح یاد کر لیا۔

جب اس کا سن سترہ سال کے لگ بھگ تھا تو وہ مسجد کے صحن میں علماء کے قریب بیٹھ کر ان کے مباحث سُنتا رہتا۔ خطبے کے دوران میں وہ تمام سامعین کے پیچھے جا کر بیٹھتا جہاں حاضرینِ جماعت کے جوتے رکھے ہوتے۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک روز اسے ایک درویش زین الدین نے وہاں دیکھ لیا اور بلا کر اسے اپنی شال، درویشانہ

---

[1] تیمرلین یورپی مصنفوں نے تیمور لنگ سے اخذ کیا ہے۔ تیمور لنگ یعنی لنگڑا تیمور۔ تیمور کے معنی فولاد کے ہیں۔ جب تک تیر سے اس کا پاؤں زخمی نہ ہوا تھا اس وقت تک وہ صرف تیمور ہی تھا۔ اس کے بعد وہ لنگڑا کر چلتا تھا اسی لیے بعض لوگوں نے ہجو کے طور پر اسے تیمور لنگ کہنا شروع کر دیا تھا، ورنہ تاریخ میں اس کا نام امیر تیمور گورگان ہے۔

ٹوپی اور ایک انگوٹھی تحفتہً پیش کی۔ انگوٹھی کا نگینہ عقیق کا تھا۔ زین الدین قیافہ شناس دور اندیش اور رہنما قسم کا درویش تھا۔ تیمور کو اس درویش کا یہ تحفہ اور اس کی مدبرانہ آواز عمر بھر یاد رہی۔

قبیلۂ برلاس کا ان دنوں صرف ایک ہی فرد رہنما مانا جاتا تھا، اسے حاجی برلاس کہہ کر پکارا کرتے تھے مگر وہ شہر سبز میں شاذونادر ہی نظر آتا۔ اسے تیمور میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یوں بھی وہ خود پسند، شکی مزاج اور پژمردہ سی طبیعت کا مالک تھا اور اس کی رہنمائی میں قبیلے کی حالت پہلے سے بھی زبوں تر ہو گئی تھی۔

اس قحط الرجال کی وجہ سے قبیلے کے اکثر امراء اور جنگ آزما بادشاہ گر کے دربار کو ہجرت کر چکے تھے۔ والد کے مشورے سے تیمور نے بھی اُدھر ہی کا رُخ کیا۔

سامی سرائے کا بادشاہ گر

ان دنوں تیمور بیکار نوجوان تھا مگر جہاں تک تیمور کی طبیعت کا تعلق تھا بیکاری اس کی فطرت سے کوسوں دور تھی۔ عظیم الجثہ، قوی ہیکل، کشادہ سینہ، مضبوط اعضا اور صحت مند بدن۔ تیمور کا سر بڑا تھا اور اسے بلند رکھنے کا انداز بھی وہ جانتا تھا۔ کشادہ پیشانی اور سیاہ آنکھیں۔ جب وہ مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تو مقناطیسی اثر سے   وہ مخاطب کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتا۔ اس کی رگ رگ میں زندگی تھی اور یہ تروتازگی اس کے حساس منہ اور کشادہ چہرے سے عیاں ہوتی تھی۔ زندگی و حرارت کی یہ ہر حیثیت سے کچھ کم نہ تھی۔ یہ نوجوان بولتا کم تھا مگر جب بولتا تو اس کی گہری آواز پراثر ہوتی۔ بیہودہ صحبت، باتوں اور مزاح سے اسے کوئی سروکار نہ تھا اور تمام عمر اس نے ہنسی مذاق سے بے اعتنائی ہی برتی۔

اس کی زندگی کی جھلکیاں کہیں کہیں نظر آ جاتی ہیں۔ ایک دفعہ موسم سرما میں وہ اپنے گھوڑے پر ہرن کے تعاقب میں سرپٹ چلا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی اس کے پیچھے تھے۔ سامنے ایک نہایت   گہرا اور چوڑا گڑھا نظر آیا۔ تیمور نے گھوڑے کی باگ موڑنے کی کوشش کی مگر مڑنے کے لیے فاصلہ کم تھا۔ اس نے اپنی رانیں گھوڑے کے پہلو میں دبا دیں اور اسے کودنے پر مجبور کیا۔ گڑھا گھوڑے کی نسبت سے زیادہ چوڑا تھا۔ اس کی پچھلی ٹانگیں اسے عبور نہ کر سکیں اور وہ لڑکھڑا کر اس میں گر پڑا مگر سوار نے ایک لمحے میں اپنے پاؤں رکابوں سے آزاد کیے اور کود کر گڑھے کے پار ہو گیا۔ جوہر

خالی گھوڑا ساتھیوں کے ساتھ آرہا تھا، مڑکر اسے پکڑا اور پھر سوار ہو گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا اس لیے سب نے واپسی کا رُخ کیا مگر رات اندھیری تھی اور بارش شروع ہو جانے کی وجہ سے وہ راستہ بھول گئے۔ سردی زیادہ تھی اور جب وہ چند سیاہ خیموں کے پاس سے گزرے تو سردی سے بچنے کا خیال سب کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔

تیمور کے ساتھی کہنے لگے:

"یہ ریت کے تودے ہیں۔"

مگر تیمور کی رائے مختلف تھی۔ اس نے راس چھوڑ دی اور گھوڑے کی ایال پکڑ کر اسے تودوں کی جانب موڑا۔ معاً روشنی نمودار ہوئی اور اُونی خیموں کا بیرونی خول نظر آنے لگا۔ خیموں سے نوجوان اپنے کتوں کو لیے نکل آئے اور قریب تھا کہ نووارد شکاریوں پر حملہ کر دیتے، تیمور پکار اُٹھا:

"اے خیموں کے باشندو! میں ترگئی کا بیٹا ہوں۔"

شمشیریں نیاموں میں ڈال لی گئیں اور دیگر ہتھیار بھی علیحدہ رکھ دیے گئے۔ اب ضیافت کی طرف متوجہ ہوئے۔ دیگیں آگ پر رکھ دی گئیں، بھیڑیں ذبح کی جانے لگیں اور جہاں کہیں فرش سوکھا تھا وہاں رضائیاں بچھا دی گئیں۔

البتہ رضائیوں میں پسّو تھے اور تیمور ان کا عادی نہ تھا۔ ایسے میں اسے نیند کہاں آتی۔ آخر اس نے رضائیوں کو علیحدہ کیا اور آگ پر مزید لکڑیاں ڈلوا کر داستان سرائی میں مصروف ہو گیا۔ صبح تک طوفان بھی تھم چکا تھا اور تیمور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا۔ سالہا سال بعد تیمور نے اس شب کی میزبانی کے صلے میں سیاہ خیموں کے خاندان کو بیش بہا تحائف سے سرفراز کیا۔

اسلام کے اس اوّلین دَور میں مہمان نوازی کی قبولیت بھی فریضہ تھی جس کا جواب

مہمان نوازی ہی سے دیا جاسکتا تھا۔ مہمان نوازی بھی نہ جاتی تھی۔ تاتاری بے مثل سیاح تھے۔ تیمور آزاد تھا، جہاں چاہتا جاتا اور جہاں چاہتا رکتا۔ سمرقند سے سرزمین آفتاب تک اسے آزادی تھی کہ ہر خیمے اور ہر صحن میں جاکر ڈیرے ڈال دے۔ وہ ہر جگہ مہمان کے طور پر قبول ہوتا تھا۔ اپنے چند ساتھیوں کی معیت میں وہ اکثر ہزاروں میل کا سفر ہفتے عشرے میں کرلیتا۔ پہاڑوں کی دشوار گزار پگڈنڈیاں، صحرا کی بے پناہ ریت اور وادیوں کے سرسبز و شاداب خطے بھی اس کی دلچسپیوں کا مرکز بنتے رہتے۔ اس کا ساز و سامان نہایت مختصر ہوتا۔ ایک تلوار اور ہلکی شکاری کمان۔ کون تھا جو ایسی شخصیت سے باتیں کرنے میں حظ نہ محسوس کرتا۔ کاروانوں کے عرب سردار قبیلہ برلاس کے سردار کے بیٹے سے باتیں کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ اور تو اور پہاڑی علاقوں کے جو باشندے دریا کے کنارے ریت دھو کر سونا اکٹھا کیا کرتے تھے وہ بھی تیمور کی موجودگی سے خوشی محسوس کرتے اور اسے اپنے خاندان کی کہانیاں گھوڑوں اور عورتوں کے متعلق سنا کر معلومات بہم پہنچاتے رہتے۔ تیمور کو قبائلی سرداروں سے شطرنج کھیلنے کا بھی شوق تھا اور وہ اکثر ان کے قلعوں کے میناروں میں بیٹھ کر گھنٹوں اس شاہانہ کھیل میں مشغول رہتا۔

"سامی سرائے کے بادشاہ گر نے آپ کو یاد فرمایا ہے"

تیمور سے کہا گیا

جانے سے پہلے تیمور کو خاندانی جائداد کا انتظام کرنا تھا۔ اس نے بھیڑوں کو ریوڑوں میں بانٹ کر چرواہوں کے سپرد کیا۔ ان کا صلہ دودھ، مکھن اور اون کا چوتھا حصہ مقرر کیا۔ اونٹوں، گھوڑوں اور بکریوں کے متعلق بھی یہی طریقہ استعمال کیا گیا۔ راوی کسی اور شئے کا ذکر نہیں کرتا۔

تیمور نے اپنے ساتھ بہترین گھوڑوں کی ایک قطار رکھی اور ایک لڑکا عبداللہ

نائی جو خانہ زاد تھا۔ ملازم بس یہی ایک تھا۔

عبداللہ کے سوا تیمور کا ساتھی اس سفر میں کوئی اور نہ تھا اور اسے لے کر تیمور نے جنوب کی طرف آمو دریا کا رُخ کیا۔ نارمن دَور کے انگلستان میں بھی کئی شہزادوں نے اپنے بادشاہ کی قدمبوسی کے لیے ایسے ایسے سفر اکثر کیے ہونگے مگر اس تنہائی اور اس بے پروائی سے شاید کسی بھی یورپی شہزادے نے ایسا سفر نہ کیا ہوگا۔ نرم چمڑے کا گھٹنوں تک کا جوتا، سفید نوک دار اونی ٹوپی، بہین اعلیٰ قسم کے چمڑے کا جبتہ، ایسے لباس میں اور یکہ و تنہا بھلا کونسا شہزادہ ہے جو اپنے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا ہوگا۔ یوں بھی وہ دنیا میں تنہا تھا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ ہم قوم سردار موقع ملنے پر دشمن بننے پر تلے ہوئے تھے۔ تیمور ہی کی ہمت کا تقاضا تھا کہ ایسے میں اس نے شہسواروں اور شمشیر آزماؤں کے گروہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ایک ایسا گروہ جس کا بادشاہ کوئی نہ تھا۔

کنہ گان سامی سرائے کے بادشاہ گر نے اسے جانتے ہی کہا

"خون اور نسل مذہب سے مقدم ہے"[1]

سامی سرائے میں اسے دیکھنے اور پرکھنے والے لاتعداد لوگ تھے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کی شہسواری کس پایہ کی ہے اور وہ تلوار کا استعمال کس انداز و خوبی سے کرتا ہے جو چھوٹی موٹی جھڑپیں ہو جایا کرتی تھیں ان میں اگر اسے اپنی تلوار کے وار پر بھروسا نہ ہوتا تو اس کی زندگی فوراً ختم ہو جاتی۔ اسے دربار کے حلقوں میں

---

[1] "دین آئیری۔ کار داش"۔ "مذہب بالائے طاق رکھا ہے"۔ ان کی زبان ترکی تھی تحریری زبان وسط ایشیا کی منگول اویغور استعمال ہوتی تھی جو اب نابود ہو چکی ہے۔ تیمور اور دوسرے ترک و تاتاری بھی عربی کے خاصے الفاظ سے شناسا تھے جسے ایشیا میں لاطینی زبان کا درجہ حاصل تھا۔

اس لیے بھی اہمیت سے دیکھا جا رہا تھا کہ ترگئی قبیلے کا سردار رہ چکا تھا اور وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔

سامی سرائے میں کم از کم دو ہزار تاتاری تھے۔ سردار، جنگ آزما اور نوجوانانِ قوم اور سبھی جنگل میں خیمہ زن تھے۔ کسے پڑی تھی کہ تیمور کو کچھ سکھاتا۔ اسے سب کچھ اپنی محنت سے معلوم کرنا تھا اور بالآخر وہ معلوم کر کے رہا۔

ایک سوار محافظ اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا آیا اور خبر لایا کہ سرحد پار سے حملہ آور آئے ہیں اور گھوڑوں کو لیے جا رہے ہیں۔ کنز گان نے تیمور کو بلایا اور یوں بر لاس قبیلے کے شہزادے کو چند نوجوانوں کی قیادت میں گھوڑوں کو لوٹا لانے کا فرض سونپا گیا۔ تیمور اس وقت امیر کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، وہ اسی وقت اُٹھا اور ادائے فرض کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ ایک ایسا فریضہ تھا جو تیمور کی خواہشات کے قریب ترین تھا۔ سواری، میلوں تک سفر، حملہ آوروں کا تعاقب، حرب وضرب، اس سے بہتر کام کونسا ہو سکتا تھا۔

تیمور اور اس کے ساتھیوں نے آخر حملہ آوروں کو جا لیا۔ وہ مغربی حصے کے ایرانی تھے۔ انھوں نے لوٹ مار کا سامان پکڑے ہوئے گھوڑوں پر لاد رکھا تھا۔ تاتاریوں کے پہنچنے پر وہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصّہ لُوٹ کے سامان اور گھوڑوں کے ساتھ رہ گیا اور دوسرا حصّہ تاتاریوں سے مقابلے کے لیے بڑھا۔ تیمور کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ باربرداری والے حصّے پر حملہ کیا جائے۔

"نہیں" اُس نے سختی سے کہا "اگر ہم نے لڑنے والے دشمنے کو مار لیا تو دوسرے خود بخود بھاگ جائیں گے۔"

ایرانی زیادہ دیر تک تیمور کے ساتھیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ تلوار کے چند ہی وار ان کے لیے کافی تھے اور بہت جلد بکھر کر انھوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ تیمور نے تمام

گھوڑے اور لوٹ مار کا سامان اکٹھا کیا اور واپس لا کر مالکوں کے حوالے کیا۔ کزگان از حد خوش ہوا اور نوجوان برلاس کو ترکش بطور تحفے کے پیش کیا۔

اس واقعے نے بادشاہ گر کزگان کے دل میں تیمور کی وقعت بڑھا دی اور اس پر نظرِ التفات پڑنے لگی۔

"تم خاندانِ گورگان کے ایک فرد ہو" ایک دن کزگان نے تیمور سے کہا "مگر تم طرہ خاندان یعنی خاندانِ چنگیز سے نہیں ہو۔ تم سے سالہا سال قبل کی بات ہے کہ تمہارے جدِ امجد کیومی نے کابل خاں سے جو خاندانِ چنگیزی کا بزرگ تھا عہد نامہ کیا تھا کہ کیومی کی اولاد میں سے فوج کے کماندار اور سردار بنیں گے۔ اور کابل خاں کی اولاد خان بن کر حکومت کرے گی۔ یہ عہد نامہ ان دونوں کے درمیان تھا مگر اسے ایک فولادی تختی پر کندہ کیا گیا تھا۔ یہ فولادی تختی خوانین کے ہاں محفوظ ہے۔ تمہارے والد نے بھی مجھ سے اس بات کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔"

کچھ دیر سوچ کر اس نے پھر کہا:

"میرے لیے ایک ہی راستہ تھا۔ میں نے اپنے گھوڑے کی باگ جنگ کی راہ پر موڑ دی تھی اور آج تک حرب و ضرب سے منہ نہیں موڑا۔ آج لوگ میری قیادت میں آنے کے آرزو مند ہیں اور میرا نام روشن ہے۔ یہ ایک راستہ تھا۔ مگر اس کے سوا اور کوئی راستہ ہے بھی تو نہیں۔"

تیمور یہ سب جانتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ چنگیز کے لڑکے چغتائی نے اس پورے خطے پر حکومت کی تھی جس میں جنوب کی جانب افغانوں کا ملک بھی شامل تھا اور وہ کوہستانی علاقہ بھی جو شکوہ سلیمان سے ورے تھا۔ مگر گزشتہ ایک سو سال میں چغتائی کی اولاد کی گرفت اپنی مملکت پر کمزور پڑ گئی اور تاتاری صوبہ دار یکے بعد دیگرے خود مختار ہو گئے تھے۔ چغتائی خوانین نے شراب و شکار کے لطف کو

کافی سمجھا اور وہ شمال کی جانب چلے گئے۔ کبھی کبھار ان علاقوں کا چکر بھی لگاتے تھے مگر شہر سبز کا رخ انھوں نے سوا لوٹ مار کے اور کسی مقصد سے نہ کیا۔ گو وہ کہتے یہی تھے کہ بغاوت فرو کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔

کزگان ایک چغتائی خان کی جانب سے سمرقند کا حاکم مقرر تھا مگر وہ اس مسلسل لوٹ مار سے تنگ آگیا اور بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ جنگ نے طول کھینچا مگر آخر خان کی موت کے بعد کزگان ان علاقوں کا واحد حکمران تصور کیا گیا جن میں برلاس قبیلہ اور دوسرے تاتاریوں کے صوبے بھی شامل تھے۔ چنگیز کا قانون نافذ کرنے کی غرض سے اس نے تمام سرداروں کو جمع کیا جو اس کی رہنمائی کے منتظر اور خواہاں تھے۔ اس نے ساتھ ہی خان کے خاندان کے ایک شہزادے کو جانشین نامزد کیا اور اسے اپنے قبضے میں رکھ کر اس کے نام سے حکومت شروع کی۔ یہ تھی کزگان کے بادشاہ گر کہلانے کی اصل وجہ۔

تیمور کی طرح وہ بھی کسی معروف اور اعلیٰ شاخ سے نہ تھا۔ اسے طرہ یعنی چنگیز کی بزرگ شاخ کی نسل ہونے کا فخر حاصل نہ تھا۔ خوددار و خودپسند، عادل اور منصف کزگان مختلف قبائل سے عہد نامے کر چکا تھا اور بے چین تاتاریوں کی عزت حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کی ایک آنکھ تیر سے گھائل ہو چکی تھی۔ خان سے بغاوت کے بعد وہ عام طور پر سیر و شکار میں مشغول رہتا تھا اور ضرورت کے سوا کبھی جنگ پر آمادہ نہ ہوا۔ اسے تاتاریوں کی طرف سے اک گونہ تشویش سی رہتی اور تنہا ہونے کی وجہ سے اسے ان کی اطاعت پر پورا پورا یقین نہ تھا۔ البتہ تاتاری سردار کے بیٹے تیمور کی جسارت اور معاملہ فہمی کو دیکھ کر اس کے دل میں یہ امید پیدا ہوئی کہ اس کی مدد سے وہ اپنی حکومت کو ثبات دے سکے گا۔

بادشاہ گر کے دربار کے دوسرے امراء کے مفادات مختلف تھے۔ وہ کزگان کے ہاتھوں سے بٹھائے ہوئے نام نہاد والئ تخت سمرقند کے بجائے نام باجگزار ضرور تھے مگر انھوں نے بھی دیرینہ قیادت میں حصہ لیا تھا۔ ان میں سے ایسے بھی تھے جو دس ہزار جانباز اپنے جھنڈے تلے اکٹھے کر سکتے تھے۔ کزگان کی غیر معمولی فراست ہی نے اتنے طاقتور اور خود غرض سرداروں کو اپنی قیادت قبول کرنے پر مجبور کیا تھا۔

اس نے بہت جلد محسوس کیا کہ تیمور نے "بہادروں" کا دل موہ لیا ہے۔ یہ جانباز جو "بہادر" کہلاتے تھے، بے جگری سے لڑنے میں مشہور تھے اور ایام صلح میں اپنے آپ کو باقی شہسواروں اور شمشیر برداروں سے علیحدہ ہی رکھتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ گھمسان کی لڑائی میں اس شوق سے کود پڑتے ہیں جیسے وہ کسی ضیافت سے لطف اندوز ہونے جا رہے ہوں۔ ترگئی کے بیٹے کو خود بخود ان کی صفوں میں جگہ مل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سالہا سال سے وہ ان میں شامل ہے۔ وہ ہر محاذ پر ان کے ساتھ رہتا اور واپس آ کر کزگان کے دربار کے قالینوں پر بیٹھ کر جانبازی و جواں مردی کے واقعات دہراتے وقت وہ ان کی محفل کا ایک اہم فرد ہوا کرتا۔

لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ تیمور کی رگ رگ میں بجلی کی ایک لہر تھی جو خوف و خطر میں کود پڑنے پر اسے اکساتی رہتی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے اس میں ایک اور بات بھی محسوس کی تھی۔ چاہے کتنا ہی گھمسان کا رن کیوں نہ ہو یا حالات ان کے مخالف کیوں نہ ہوں تیمور کے سکونِ قلب و ذہن میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آتا تھا۔ وہ تلواروں کے سایے میں بھی خاموشی سے کچھ سوچتا ہی رہتا۔ یہ "بہادر" اکثر کہا کرتے "تیمور کی موجودگی سے عمل اور زندگی کو فروغ ملتا ہے" لمبے سے لمبا سفر اور مشکل سے مشکل معرکہ اس کے جسم کو نڈھال نہ کر سکتا تھا۔

اسے قدرت نے قیادت کی خصوصیتیں وافر عطا کی تھیں اور وہ قیادت قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار بھی رہتا تھا۔ اسے اپنے آپ پر بھروسا تھا اور اپنی طاقت پر ناز بھی۔ ایک دن اس نے کزگان سے بکھرے ہوئے برلاس قبیلے کی قیادت کی اجازت چاہی۔

کزگان نے قدرے ناپسندیدگی کے لہجے میں کہا

"کچھ دن اور انتظار کرو، آخر ایک نہ ایک دن تم سردار بن ہی جاؤ گے۔"

کچھ عرصے کے بعد کزگان کو تیمور کی شادی کا خیال پیدا ہوا اور اس نے اپنی ایک نواسی کو اس کی رفیقۂ حیات کے طور پر نامزد کیا جو ایک اور برسر اقتدار قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی۔

خاتونِ بلند مرتبت

راوی کہتا ہے کہ تیمور کی دُلھن حُسن میں یکتائے زمانہ تھی۔ سرو قد، سیمیں بدن، اور چاند سا مکھڑا۔ گمان غالب ہے کہ شادی کے وقت اس کا سن پندرہ سے کم نہ ہوگا۔ اس لیے کہ سننے میں آیا ہے، شادی سے پہلے وہ شکار میں اپنے والد کے ساتھ سوار ہو کر شامل ہُوا کرتی تھی۔ اس کا نام الجائی خاتون آغا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حُسنِ تاتار پر نقاب کی پابندی عائد نہ ہوئی تھی اور حرم کی چار دیواری اور علٰحدگی سے وہ ناشناس تھا۔ شکار ہو یا سیاحت، سفر ہو یا حضر، جنگ ہو یا امن، حج ہو یا زیارات کا عزم، وہ اپنے خاندان کے ساتھ گھوڑوں پر سوار آزادانہ شامل ہُوا کرتی تھیں۔ فاتح قوم کی بیٹیاں فتوحات اور حرب وضرب میں شامل ہوتی تھیں۔ رزم آرائی اور فتوحات سے ان کا سر بھی اسی طرح بلند رہتا تھا جس طرح فاتح اقوام کے مَردوں کا شیوہ ہے کھلی فضا، صحت مند ماحول اور آزاد طبیعت ان کے حُسن کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ اور یوں بھی گھر اور گھر کے تمام اثاثے کی مالک وہی ہُوا کرتی تھیں۔ دودھ دوہنا اور بلونا ایام صلح میں انھیں کے سپرد تھا۔ کنبے کے جوتے بنانا بھی ان کے ذمّے ہُوا کرتا تھا۔

تیموری عہد کی تاتاری عورتیں جائداد کی مالک بھی ہُوا کرتی تھیں۔ جہیز اور مہر سے جو کچھ انھیں ملتا تھا وہ ان کی شخصی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ امراء اور بڑے سرداروں کی بیویوں کا محل میں اپنا علٰحدہ نظام ہُوا کرتا تھا۔ محل کے کچھ

حصے ان کے تصرف کے لیے مخصوص کر دیے جاتے اور سفر کے دوران میں جب منزل پہ پہنچتے تو ان کے خیمے علیحدہ نصب کیے جاتے جہاں ان کا حکم کما حقہٗ نافذ ہوا کرتا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ان کی بہنیں یورپ میں اپنے دن کشیدہ کاری اور نالین بافی میں گزارا کرتی تھیں۔ تاتاری خواتین شہسواروں اور جنگ آزماؤں کی رفیقاتِ حیات تھیں۔ ان کا کام سپاہی بچوں کی پرورش کرنا تھا اور اسی لیے وہ قبیلہ و خاندان کی تمام محفلوں اور ہر جشن میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ اپنے مردوں کی شریکِ غم بھی تھیں۔ اسی لیے جب ان کے دشمن ان پر فتحمند ہو جاتے تو بقیۃ السیف مردوں کی طرح یہ بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی جاتیں۔

شہزادی الجائی خاتون شمالی علاقے کے اپنے میکے کے گھر سے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور غلاموں کی معیت میں آئی اور پہلی بار اس نے مستقبل کے بادشاہ گر کا چہرہ دیکھا دُبلا سا چہرہ مگر ڈاڑھی سے مزین۔ تیمور اسی دن ایک لڑائی سے اپنے رفیقوں کے ساتھ لوٹا تھا۔ الجائی خاتون کو انجم شناس بتا چکے تھے "تمھاری قسمت تمھارے ماتھے پہ لکھی ہوئی ہے اور تم اسے بدل نہیں سکتیں۔"

بادشاہ گر اور اس کے امراء ساتھیوں کے لیے یہ شادی جشن اور خوشی کا دن تھی مگر جلائیر قبیلے کے طاقتور سردار کی بیٹی کی نئی زندگی اور اس کے مقدر کا پہلا دن تھا۔ نکاح کے خطبے کے وقت وہ محفل میں موجود نہ تھی۔ خطبہ پڑھا گیا۔ دولھا اور دلھن کے نام بآوازِ بلند پکارے گئے۔ دولھا نے ایجاب و قبول کے فقرے دُہرائے اور معتبر گواہوں کے دستخط ثبت کر دیے گئے مگر دہ وہاں موجود نہ تھی۔ وہ دوسری تیاریوں میں مصروف تھی۔ اسے پہلے تو عرقِ گلاب میں نہلایا گیا، اس کے دراز گیسو روغن گندم میں دھوئے گئے اور پھر انہیں دودھ سے مل مل کر دھویا گیا حتیٰ کہ ان میں ریشم کی سی نرمی آ گئی۔ مرمریں بدن اور زلفِ دراز کو خشک کیا گیا۔ پھر اس سیمیں بدن کو زرد و زری کے سرخ عروسی

جوڑے میں ملبوس کیا گیا۔ عروسی جوڑے کے اوپر سنہری اور روپہلی کام کا جبہ تھا۔ ریشم جیسے بال شانوں پر بکھر کر حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ کانوں میں آویزے صراحی دار گردن کے گرد زمرد کا گلوبند اور سر پر طلائی ٹوپی جس پر ریشمی پھولوں کا طرہ، اور یوں الجائی کا کوہستانی حسن دستِ انسانی کی مدد سے مزین ہو کر جشن میں شامل مہمانوں کی سمت آیا۔ جہاں تاتاری شہسوار اس کے منتظر تھے۔ سب کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کا آنا اس بات کی دلیل تھی کہ اس نے اس شادی کو قبولیت کا شرف بخشا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر جشن میں آئی مگر اب دوسرا جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ اب کے غازہ و سرخی اور کاجل سے بھی چہرہ مزین تھا۔

مہمان خم پر خم لنڈھا رہے تھے۔ الجائی خاموش، سنجیدہ، کچھ شرمائی اور کچھ گھبرائی ہوئی ان کے درمیان گھوم رہی تھی اور بادشاہ گرمٹھیاں بھر بھر کر موتیوں کی تھیلیاں اس پر نچھاور کر رہا تھا۔ معاً اس نے حکم دیا کہ نقارے پر ضرب لگائی جائے۔ یہ جشن یا جنگ کی علامت تھی۔

زین الدین نے بلند آواز سے کہا:

"اس جوڑے پر خدائے واحد کی رحمت و برکت ہو!"

سب نے یک زبان ہو کر کہا "آمین!"

اب تحفے تحائف بٹنے لگے۔ کزگان اٹھا اور ہر ایک کو اس کے مرتبے کے مطابق خلعت، تلوار، خنجر اور بیسیوں دوسری پسندیدہ اشیاء عطا کیں۔ کزگان کا حسب و نسب تاتاری تھا اور تاتاری ایسے موقعوں پر کنجوسی نہیں دکھاتے۔

جشن جاری رہا۔ مہمان قالینوں پر اور خیموں سے باہر ہری ہری گھاس پر دراز ہو کر شہزادی کی شادی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ داستان گو بھی شامل ہو گئے اور اب توجہ ان کی طرف دی جانے لگی۔ کہیں کہیں گٹار پر نغمے بھی چھڑنے لگے۔ گٹار کی دھیمی دھیمی

اور داستان گو کی بھاری بھرکم جچی تلی آواز، بار ہا سنی ہوئی کہانیوں کے مناظر شراب کے خمار میں حقیقت کا سا رنگ پیش کرنے لگے۔ داستان گو الفاظ و بیان ہی سے نہیں بلکہ ہاتھوں کی حرکت، سر کی جنبش اور آنکھوں سے بھی اپنی داستانوں کو زیب و زینت بخش رہے تھے۔ اگر داستان گو کی ان حرکات میں کمی واقع ہو جاتی یا داستان گو سہواً کوئی چھبتا ہوا فقرہ بھول جاتا تو سامعین یوں سمجھتے جیسے کسی انعام سے محروم کر دیے گئے ہوں۔

جب آفتاب کا سفر ختم ہوا اور وہ تھکا ہارا شفق کے سرخ پھولوں کا ہار پہنے مغرب کی پہاڑیوں میں شب بسر کرنے کے لیے رخصت ہوا تو غلام قندیلیں اور مشعلیں لیے حاضر ہوئے۔ درختوں کے نیچے اور دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ چراغ جلا دیے گئے۔ تازہ خوان پیش ہوئے اور شام کے کھانے کا دور شروع ہوا جیسے یہ پہلا ہی دور تھا۔

الجائی ایک بار پھر آئی اور مہمانوں کے درمیان میں سے گزر گئی۔ مگر اس بار اسے واپس نہ آنا تھا۔ وہ اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ پیچھے سے تیمور سفید عربی النسل گھوڑے پر نمودار ہوا۔ اس کی زین کی ریشمی اور اونی جھالریں فرش کے قالینوں کا منہ چوم رہی تھیں۔ وہ بڑھا اور الجائی کو اٹھا کر اپنے سامنے بٹھا لیا اور یوں اپنے سپاہیانہ خیمے میں پہلی بار اس کی پزیرائی کی۔

یہاں بھی کچھ مہمان تھے۔ تیمور کے عزیز ترین مہمان۔ ان کے علاوہ الجائی کے خاندان کی عورتیں بھی تھیں جو اس کی زندگی کے اہم ترین سفر کے آغاز کی تبریک کے لیے آئی تھیں اور لباس عروسی اتارنے میں مدد دینا بھی ان کے ذمے تھا۔ الجائی کے جہیز کے صندوق بھی ان کی سپردگی میں تھے۔ جب انھوں نے الجائی کے لباس کی بیرونی تہیں اتاریں اور محض کھلی آستینوں کا جبہ اور اس کی تا بہ کمر زلفیں ہی اس کی ستر پوشی کر رہی تھیں تو الجائی کی رگ رگ شرم و حیا سے کانپ اٹھی مگر ان دیکھی بھالی عورتوں کی مسکراہٹ سے اس کی خود اعتمادی عود کر آئی۔

خاتونِ بلند مرتبت

تیمور دبے پاؤں داخل ہوُا تو ان عورتوں نے قبیلے کے اس نامور مہمان کو سلام کیا اور کمرے سے نکل گئیں۔ تیمور کے ساتھی بھی خاتونِ محترم کو آداب کہہ کر جا چکے تھے اور اب خلوت میں مخل ہونے والا کوئی نہ تھا۔

اس رات دریا کے بہتے ہوئے پانی کے نغموں کے پس منظر میں الجائی نے طبلِ جنگ کی آوازیں تیمور کی سرگوشیوں میں محسوس کیں۔ تیمور کی زندگی میں الجائی پہلی بار حسن و نزاکت اور شعر و تبسم بن کر آئی تھی۔ الجائی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہی مگر جب تک زندہ رہی تیمور نے لطافت و رعنائی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی اور کی طرف رجوع نہ کیا۔

بیس سال سے چوبیس سال کی عمر تک تیمور کے لیے زندگی نہایت پُرکشش اور حسین تھی۔ شہر سبز کے سفید محل کے ایک حصے میں اس نے الجائی کے لیے اپنی پسند کا گھر بنایا اور اسے اپنی جنگوں سے حاصل کردہ قالینوں، پردوں اور دوسرے تحائف سے آراستہ کیا۔ اس کے والد نے اپنے تمام مویشی اور چراگاہیں اسے عطا کر دی تھیں پھر، مسکراتی ہوئی رفیقۂ حیات اور فارغ البالی۔ زندگی کو یہی چیزیں حسین بناتی ہیں۔

امیر کزگان نے اسے منگ باشی (یک ہزاری) مقرر کیا جسے آجکل کی اصطلاح میں رسالے کی رجمنٹ کا کمانڈر کہا جا سکتا ہے۔ تیمور ان ایک ہزار جانبازوں کو خوش رکھتا۔ ان کی خوراک اور قیام کا خیال رکھتا۔ ہمیشہ کھانے پر چند ایک کو مدعو کرتا۔ کزگان مردم شناس تھا۔ اس نے تیمور اور اس کے ایک ہزار جانبازوں کو مقدمۃ الجیش کے طور پر استعمال کیا۔

بارہا ایسا ہوُا کہ سمرقند کے راستے پر لوٹتے ہوئے تیمور اپنی پلٹن سے آگے نکل جاتا اور گرد اڑاتا ہوُا ان سے پورا ایک دن پہلے پہنچ جاتا۔ کچھ تو الجائی کی محبت اسے اس طرح کھینچ لاتی اور کچھ لوٹتے ہوئے سپاہیوں کے لیے پُرتکلف دعوت کا انتظام

ان سے پہلے آنے کا باعث بنتا ۔ اسیرے شہر سبز کے باغوں میں الیی دعوتیں بہت لیں۔ تیموریہ جب الجائی کے بطن سے اس کا پہلا لڑکا پیدا ہوا تو اس نے اس کا نام جہانگیر رکھا اور بادشاہ گر کے تمام امیروں کو مدعو کیا۔ صرف دو آدمی دعوت میں شامل نہ تھے۔ اس کا چچا حاجی برلاس اور اس کی بیوی کے قبیلے کا سردار بایزید جلایر۔ دعوت اس قدر پرتکلف تھی کہ مہمان ہر طرف تحسین و آفرین کے کلمات کہہ رہے تھے۔

"بات ہی ایسی ہے" وہ کہتے "آخر تیمور گورگان اعظم ہی کی اولاد میں سے تو ہے"۔ اور تو اور کوہستان کے قبائلیوں نے بھی شہر سبز کے سردار اور اس کی خاتون کی دریا دلی کے گیت بنا ڈالے۔

تیمور کی مدد اور اس کی دلاوری و ہمت نے کزگان کی مملکت کو مغربی صحرا اور جنوبی وادیوں کی سمت نئی وسعتیں بخشیں اور ہرات کا والی قیدی بن کر سامی سرائے کے سردار کے سامنے پیش ہوا۔ تیمور کی بے لوث وفاداری سے کزگان نے ان گنت فائدے اٹھائے تھے اور وہ دونوں مل کر ابھی اپنی فتوحات کو اور بھی فروغ دیتے مگر کزگان کے امراء کے اختلاف نے ایک نئی مصیبت لاکر کھڑی کر دی۔

انھوں نے مطالبہ پیش کیا کہ قیدی ملک کو تلوار کے گھاٹ اتارا جائے اور اس کی جائداد ان میں تقسیم کی جائے۔ کزگان اسے امان دے چکا تھا۔ قیدی کی امارت معروف تھی اور وہ پرانا دشمن بھی تھا۔ امراء امان پر رضامند نہ تھے۔ جب کزگان نے دیکھا کہ وہ کسی صورت نہیں مانتے تو اس نے ملک ہرات کو خفیہ طور پر ان کے ارادے سے آگاہ کر کے اسے رہا کر دیا۔ اس وقت وہ سب جنوب کی جانب شکار میں مصروف تھے اور ہرات کا قصد تھا، یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا البتہ ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تیمور ملک ہرات کو ہرات تک بحفاظت پہنچانے پر مامور کیا گیا تھا۔ بہرکیف یہ بات مصدقہ ہے کہ جب اس کے مربی کو قتل کیا گیا تو وہ وہاں موجود نہ تھا۔ کزگان

ابھی دریائے جنوب کی جانب شکار میں مشغول تھا کہ دو سرداروں نے اس پر حملہ کیا اور یوں تیروں سے سامی سرائے کا بادشاہ گرا اتنا گھایل ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا۔

تیمور کو جونہی اس سانحے کی اطلاع ملی وہ تیزی سے پہنچا اور لاش کو سامی سرائے میں لا کر دفن کیا۔ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر تیمور نے اپنے گھوڑے کو پھر دریا میں ڈالا اور بادشاہ گر کے ان سرداروں کی کمک کو پہنچا جو قاتل امراء کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ وہ چاہتا تو پہلے اپنی جائداد اور مال و متاع کی حفاظت کا انتظام کرتا مگر تاتاریوں میں ایک بہت ہی پرانی ضرب المثل تھی کہ "مرد وہ جو اپنے ہم قوم کے قاتل کے ساتھ آسمان کی چادر تلے نہیں سوتا۔" کز گان کے دونوں قاتل زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں نے ان کے تعاقب میں دن اور رات ایک کر دیے۔ کوہ و دراز، وادیوں اور پہاڑیوں، ندیوں اور دریاؤں کو عبور کرتے وہ ہر گاؤں سے تازہ دم گھوڑے لے کر بھاگے چلے جا رہے تھے مگر تعاقب کرنے والوں کی رفتار کی وہ تاب نہ لا سکے اور بالآخر کوہستان کی بالائی پہاڑیوں پر گھیرے میں آ گئے۔ تلواریں ایک لمحے کے لیے چمکیں۔ دو بے سر کے لاشے تڑپے پھر چار سو خاموشی چھا گئی۔ تیمور نے ادائے فرض سے سبکدوش ہو کر اپنی وادی کا رخ کیا مگر وہاں ایک تباہی نقشہ اس کا منتظر تھا۔

میراث شاہی سے متعلق وسط ایشیا میں واضح اور محکم قوانین موجود نہ تھے۔ جب بادشاہ مرتا تو اس کے لڑکے کا وارث تاج و تخت ہونا امکان میں تھا۔ یہ صرف اسی صورت میں ہوتا جب بادشاہ کی مملکت میں امن و امان ہوتا اور اس کے امراء میں سے کسی ایک کو دوسرے پر سبقت نہ ہوتی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اور شرط بھی تھی بیٹا بجائے خود اس قابل ہوتا کہ اپنی جرأت و ذہانت کی وجہ سے عنانِ حکومت کسی دوسرے کے ہاتھ میں جانے سے روک سکتا۔ ورنہ ہر سردار اور امیر اپنے آقا کی مسند پر بیٹھنے کا متمنی

ہو سکتا تھا۔ ایسے حالات میں فیصلہ شمشیر اور قبضۂ شمشیر پکڑنے والے ہاتھوں کی ضرب پر منحصر ہوا کرتا تھا۔ اس وقت طوائف الملوکی سے بچنے کی بھی امید ہوا کرتی تھی اور وہ صرف اسی صورت میں کہ جنگ آزمودہ سرداروں کی مجلس نیا بادشاہ منتخب کرے اور تمام سردار اس کی اطاعت کا حلف اُٹھالیں۔ ان خود پوش جواں مردوں کے ہاں ایک مثل مشہور تھی:

"وہی ہاتھ عنانِ حکومت سنبھال سکتے ہیں جو قبضۂ شمشیر پکڑنے کے عادی ہوں۔"

کزگان کے لڑکے نے باپ کی وراثت اور سمرقند کی حکومت سنبھالنے کی ناکام سی کوشش کی مگر یہ گراں بار ذمہ داری اس کے بس کی بات نہ تھی اور جاہ و حشمت پر زندگی کو ترجیح دیتے ہوئے سمرقند سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے چلے جانے کے بعد حاجی برلاس اور جلایر سردار تاتاریوں کی قیادت سنبھالنے کے لیے جلوہ میں آئے۔ باقی سردار اپنے اپنے علاقوں کو چل دیے۔ دارالسلطنت میں انتشار صوبوں اور اضلاع کے لیے مہلک ثابت ہوا کرتا ہے۔ مرکز کے حالات استوار کرنے کی صلاحیت کسی میں نہ تھی مگر وہ اپنی جائدادوں اور چھوٹی بڑی ریاستوں کے تحفظ سے کوتاہی برتنا نہ چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی جائدادوں کو بچانے کے لیے اپنے اپنے جانبازوں کو اپنے عَلَم کے نیچے اکٹھا کیا اور حالات کا انتظار کرنے لگے۔ اگر کوئی جوہرِ قابل ہوتا تو وہ اس کے گرد اکٹھا ہونے سے دریغ نہ کرتے مگر بدبخت کزگان نے اپنا خون خشک ہونے سے پہلے ہی جان دے دی تھی اور حاجی برلاس یا بایزید جلایر اس قابل نہ تھے کہ ان کی سرکش طبیعتوں کو قابو میں رکھ سکتے۔

اِدھر یہ حالات تھے اور اُدھر تیمور کے والد ترگئی نے گوشۂ عزلت میں داعئ اجل کو لبیک کہی۔ برلاس قبیلے کے بیشتر افراد حاجی برلاس کے ساتھ سمرقند جا چکے تھے۔

خاتون بلند مرتبت

تیمور کے پاس شہر سبز کی خاموشی توڑنے کے لیے چند سو سواروں کے سوا کوئی نہ تھا۔ جانبِ شمال کا خانِ اعظم پہلے تو حالات کو اپنے پہاڑوں کی بلندیوں سے خاموش دیکھتا رہا۔ جب اس نے حقیقتِ حال کو اچھی طرح جانچ لیا تو وہ اپنے پہاڑوں سے اُتر آیا۔ اُسے وہ بغاوت یاد تھی جو اس وادی میں چند سال پہلے بپا ہوئی تھی۔ اور اس کے دل میں ابھی تک غصہ باقی تھا۔ وہ اُترا اور اس طرح اُترا جیسے سرسبز کھیتوں پر ٹڈیوں کے دل بادل اُتر آتے ہیں۔

مصلحت اندیش تیمور

خانِ اعظم کی آمد سے سب امیروں کے لیے یکساں طور پر خطرہ تھا، مگر تمام کے تمام اپنی اپنی ریاست میں جا کر قلعہ بند ہو گئے۔ بایزید جلایر کا شہر خوجند خان کی راہ میں پڑتا تھا۔ وہ سیدھا خوجند پہنچا اور خان کی خدمت میں بیش قیمت تحفے تحائف پیش کر کے اطاعت قبول کی۔

حاجی برلاس پہلے تو جوش میں آکر بہت کچھ کر گزرا تھا۔ ترگئی کے مرنے کے بعد اس نے شہر سبز اور کرشی وغیرہ سے لوگوں کو بلا بھیجا اور قوم کی سرداری کا اعلان کر دیا۔ بعد میں اس نے مقابلے کا ارادہ بدل دیا اور تیمور کو اطلاع دی کہ وہ پوری قوم کو لیکر جنوب کی جانب ہرات جانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

تیمور شہر سبز کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے جواب دیا:

"آپ جہاں چاہیں جائیں، میں تو سیدھا خان کے دربار میں جاؤنگا۔"

تیمور جانتا تھا کہ سرحد کے مغل جو جاٹ مغل کہلاتے تھے اپنے سردار خانِ اعظم کی سرکردگی میں اپنا پرانا حق تسلیم کرانے آرہے ہیں۔ خان کے سامنے سمرقند کے زرخیز علاقے تھے اور حکومت منوانے کے علاوہ اس کا ارادہ لوٹ مار کرنے کا بھی نظر آتا تھا۔ تیمور نے الجائی اور ننھے جہانگیر کو الجائی کے بھائی کے دربار میں بھیج دیا۔ الجائی کا بھائی بھی کابل سے شمال کی جانب کوچ کر چکا تھا۔ تیمور اگر چاہتا

تو اسے بھی کابل میں پناہ مل سکتی تھی مگر ایسی زندگی اس کی فطرت کے خلاف تھی۔ دوسری طرف مقابلہ تھا، مگر چند سو سواروں سے جاٹ مغلوں کے بارہ ہزار جانبازوں پر مشتمل فوج کا مقابلہ کرنا بھی دانشمندی سے بعید تھا۔ اس کا باپ اور بادشاہ گر ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ کسی صورت بھی شمال کے خان کی اطاعت قبول نہ کرنا انجام کار اگر اس کے بس کی بات ہوئی تو وہ تمام تاتاری سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار کر رہے گا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ خان زیادہ طاقتور تھا اور آخر تیمور کے آباو اجداد کا تسلیم شدہ حکمران۔

تیمور کر ہی کیا سکتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کا قبیلہ اس شاہباز کی طرح تھا جس کے پر کتر دیئے گئے ہوں۔ شہر سبز میں خوف و ہراس پھیل چکا تھا۔ شہر غیر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ لوگ بیوی بچوں اور بہترین گھوڑوں کو لے کر سمرقند کے راستے پر کئی دنوں سے بھاگے جا رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی جائداد چھوڑ کر جانا نہ چاہتے تھے۔ وہ تیمور کو دیکھ رہے تھے کہ اس خوف و ہراس کا اس پر ذرہ بھر بھی اثر نہ ہو رہا تھا۔ وہ تیمور کی خدمت میں اپنی اطاعت گزاری کا یقین دلانے کے لیے پہنچے۔ وقت آنے پر شاید وہ انھیں اپنی حفاظت میں لے سکے۔

تیمور کا اپنا قول کچھ مختلف تھا "جو لوگ اپنی ضرورت کے وقت دوست بنتے ہیں وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے" بے کار اور بے مصرف لوگوں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ ایسے لوگوں کو اگر وہ بلا کر کے بیٹھ جاتا تو خود ہی خان کے لیے لوٹ مار اور حملے کا بہترین بہانہ مہیا کرتا۔

اس نے تیاری تو ضرور کی مگر ایک اور ہی مقصد کے لیے۔ پہلے تو اس نے اپنے والد کی تجہیز و تکفین کا شاہانہ انتظام کیا اور اُسے شہر سبز کے علماء و شیوخ کے

قبرستان میں دفن کیا۔ پھر وہ عالم دین زین الدین کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوری رات اس کے ساتھ گزاری۔ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں، اس کا کسی کو علم نہیں البتہ اس کے بعد ہی تیمور نے اپنی قیمتی اشیاء اکٹھی کرنی شروع کیں۔ تیز رفتار گھوڑے، چاندی سے جڑے ہوئے زین اور ہر نوع کے زرد جواہر۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زین الدین نے وہ تمام دولت بھی اس کے حوالے کر دی ہو جو دینی امور کے لیے اس کے تصرف میں تھی۔ شمالی علاقے کا خان اسلام کا مانا ہوا دشمن تھا اور وہ اوقاف کو ضرور اپنے قبضے میں لے لیتا۔

جاٹ مغل پہنچ چکے تھے۔ خان کے مقدمۃ الجیش کے سکاؤٹ، پہاڑی گھوڑوں پر سوار، لانبے چمکدار نیزے لیے اور لوٹ مار سے لدے ہوئے وافر گھوڑوں کی باگیں تھامے نمودار ہو چکے تھے۔ ان کے بعد مقدمۃ الجیش کے سواروں کے جتھے تھے جو گندم کی پکی ہوئی فصلوں کو برباد کرتے اور اپنے گھوڑوں کو چراتے ہوئے آندھی اور طوفان کی طرح وادی پر چھا چکے تھے۔ سکاؤٹوں کا کماندار شہر سبز میں پہنچ کر سیدھا سفید محل پہنچا، مگر نوجوان تیمور نے نہایت خندہ پیشانی سے مہمان کے طور پر اس کا استقبال کیا۔

تیمور نے اس جاٹ کماندار کی پذیرائی کے لیے ایک شاندار دعوت دی اور جشن منعقد کیا۔ لاتعداد جانور ذبح کیے گئے اور دل کھول کر خرچ کیا گیا۔ جاٹ افسر مخمصے میں پڑ گیا۔ اسے یہ توقع نہ تھی کہ اسے مہمان کی حیثیت سے رہنا پڑیگا۔ فاتح بن کر کسی شہر میں داخل ہونا کچھ اور بات ہوتی ہے اور مہمان کی حیثیت اس سے نہایت مختلف۔ وہ اپنے نوجوان میزبان کی دولت کے انبار للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ سکتا تھا مگر کچھ نہ سکتا تھا۔ اس نے تحائف ضرور مانگے اور اس کی امید سے زیادہ اس کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ تیمور کی فراخدلی محدود

کی شناسا نہ تھی۔

جب وہ بے بلائے مہمان کے لالچ کی آگ کو ٹھنڈا کر چکا تو تیمور نے خان کے دربار میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو درباری لباس پہنایا اور باقی ماندہ دولت کو ساتھ لیا۔ سمرقند کے قریب اسے دو اور جاٹ افسر ملے جو مقدمۃ الجیش کے ہمراہ تھے۔ وہ دونوں بھی سیم وزر کے خواہشمند تھے اور تیمور نے ان کی خواہش سے زیادہ دولت ان کے حوالے کی۔

سمرقند سے گزرنے کے بعد وہ خان کے اُردو یعنی شاہی لشکر کی فرودگاہ کے پاس پہنچا۔ یہ تھی جاٹ خان تغلق کی لشکرگاہ۔ وادی اونٹوں کی قطاروں، گھوڑوں کے ریوڑوں اور سفید اون کے خیموں سے پُر تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے عَلم ہل رہے تھے اور کھاد کے ڈھیروں سے خاک اڑ اڑ کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ خیموں کے اندر باہر زرق برق لباس میں جنگجو سپاہی اپنے فاخرانہ لباس کی نمائش کر رہے تھے۔ وہ لانبے نیزے اور صحرائی کمان کے استعمال میں ماہر تھے۔

تغلق اپنے جھنڈے کے نیچے قالین پر بیٹھا تھا۔ چوڑا سا منگول چہرہ، سیماب کی سی آنکھیں اور چند بالوں پر مشتمل ڈاڑھی۔ شکی مزاج، لوٹ مار میں بے مثل اور تلوار کا دھنی۔

تیمور جب نصف دائرے میں بیٹھے ہوئے امراء کے سامنے جا کر گھوڑے سے اُترا تو اسے احساس ہوا کہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے چہروں کے خط و خال اس کے آبا و اجداد کے چہروں سے ملتے جلتے ہیں۔

"اے عالی نسب خان، اس اُردو کے خداوند! میں برلاس قبیلے کا سردار تیمور ہوں۔"

وہ جانتا تھا کہ جس قبیلے کا سردار بننے کا ذکر وہ فخریہ لب و لہجہ میں کر رہا ہے اس قبیلے کے اکثر افراد حاجی برلاس کے ساتھ خان کی دسترس سے دور بھاگ چکے تھے مگر موقع کی نزاکت کسر نفسی کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اور پھر خان کے حضور میں اس کے تحائف بھی تو بیش بہا تھے۔ ان صحرانشینوں پر بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ تیمور نے اپنے پاس کچھ نہیں رہنے دیا۔ خان کو اس کی یہ ادا پسند آئی۔

"خان بابا! میں آپ کی خدمت میں اور بھی تحائف پیش کرتا" اب تیمور نے اور بھی دلیری سے کہا "اگر آپ کے تین بے وفا کتوں نے اپنے لالچ اور حرص کی آگ کو میرے مال سے ٹھنڈا نہ کیا ہوتا۔"

تغلق اپنے افسروں کی یہ رذیل حرکت کس طرح پسندیدگی سے دیکھ سکتا تھا؟ اُس نے تینوں افسروں کی طرف پیغام بھجوایا کہ انھوں نے جو کچھ تیمور سے لیا ہے وہ حاجی برلاس کو واپس کر دیں۔ اگر وہ تیمور کو لوٹا دینے کا حکم دیتا تو اس سے لینے میں تامل کرنا پڑتا تھا۔ اور حاجی برلاس سے لے لینے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

"وہ واقعی کتے ہیں" اس نے کہا "مگر ہیں میرے ہی بے وفا کتے، اور نہایت لالچی ہیں۔"

وسط ایشیا کے یہ صحرانشین اپنے ارادوں کو نہایت خوبی سے پردۂ راز میں رکھنے کے عادی تھے۔ درباری چالوں میں بھی وہ خوب ماہر تھے یہ درست کہ وہ جنگجو تھے مگر وہ اتنے طویل عرصے سے جنگوں سے دوچار ہوتے رہے تھے کہ ہر ممکن طریقے سے جنگ سے گریز کرتے اور اگر ان کا مقصد کسی چال سے پورا ہوتا تو وہ تیر و شمشیر کا استعمال ہرگز نہ کرتے۔ تیمور نے تغلق کے دربار میں کئی دوست بنا لیے۔ سمرقند کے شہزادے اس طرح بکھر چکے تھے جس طرح بارہ کے

مصلحت اندیش تیمور

سا بے سے ٹھہریں۔ صرف تیمور کو ان کے سامنے آنے کی ہمت پڑی تھی۔ وہ کہنے لگے:
"تیمور کا استعمال قرینِ مصلحت ہے، اور کیوں نہ اسی کے توسط سے حکومت کی جائے۔"

جاٹ مغل سر دست کچھ خاموش سے ہو گئے۔ جن سرداروں کو خان نے تیمور کے تحائف لوٹا دینے کا حکم دیا تھا وہ آپس میں مل گئے اور واپس شمالی علاقے کا رُخ اختیار کیا۔ خان وطن سے غیر حاضر تھا۔ کیوں نہ وہاں جا کر نیا لشکر تیار کریں اور بغاوت بپا کر دیں۔ راستہ بھر لوٹ مار کرتے ہوئے وہ شمالی علاقے کی سرحد پر جا پہنچے۔ تغلق کو تشویش پیدا ہوئی۔ اس نے تیمور سے مشورہ لیا۔ تیمور پہلے ہی اس معاملے پہ غور کر چکا تھا۔

"اپنے ملک کو لوٹ جائیے" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "وہاں آپ کے لیے ایک ہی خطرہ ہے، یہاں دو دشمن ہیں، ایک آپ کے آگے اور ایک عقب میں۔"

تیمور کی رائے مان لی گئی۔ خان اپنے وطن کو لوٹ گیا۔ واپس جانے سے پہلے اس نے تیمور کو "تمان باشی" دس ہزاری کا منصب عطا کیا اور اپنی مہر دیکر ان علاقوں کا حکمران مقرر کیا یہی منصب ایک زمانے میں اس کے آبا و اجداد کو بھی مغلوں کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

یوں تیمور نے اپنی دادی کو تباہی اور لوٹ مار سے بچایا۔ خان کا حکم نامہ اس کے ہاتھ میں تھا مگر اس کے ہم قوم تاتاری اس کے اس آسانی سے حکمران بن جانے پر رضامند نہ تھے۔ بلا ٹل چکی تھی۔ خان جا چکا تھا۔ تاتاری سرداروں کے لوٹ آنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ وہ صرف لوٹ ہی نہ آئے بلکہ ان کی خانگی رنجشیں، شورشیں اور چال بازیاں عود کر آئیں اور تین سال تک عجیب و

غریب نقشے بنتے اور بگڑتے رہے۔

حاجی برلاس اور جلایر سردار نے سمجھوتا کر کے اپنی طاقتوں کو یکجا کیا اور تیمور کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیمور کو اپنے شامیانے میں دعوت دی مگر اس نے وہاں ہتھیار بند سپاہیوں کی کثرت اور دبی دبی فضا میں خطرہ محسوس کیا۔ ناک سے خون بہ نکلنے کے بہانے سے تیمور وہاں سے ساتھ کے خیموں میں اٹھ آیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر گھوڑوں کا رخ کیا۔ گھوڑے تیار تھے اور بچ نکلنے میں اسے دیر نہ لگی۔ بایزید جلایر کو اس دھوکے پر بعد میں شرم محسوس ہوئی اور اس نے تیمور سے معافی بھی مانگی مگر حاجی برلاس سخت دل آدمی تھا، اس نے جلدی ہی شہر سبز پر چڑھائی کر دی تاکہ اس پر قابض ہو جائے۔

تیمور شہر سبز اس کے حوالے کرنے پر رضامند نہ تھا، خصوصاً جب خان کا حکمنامہ اس کے حق میں تھا اور ہزاروں آدمی اس پروانے کے تحفظ کے لیے موجود تھے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کیا اور چچا کے مقابلے کے لیے میدان میں اتر آیا۔ چچا بھتیجے کی فوجوں میں سمرقند کی سڑک پر معمولی سی جھڑپ ہوئی مگر اچانک حاجی برلاس نے اپنا لشکر سمرقند کی جانب ہٹا لیا۔ تیمور فتحمندانہ طور پر اس کے تعاقب میں آگے بڑھا مگر دوسرے ہی دن اس کے لشکر کے اکثر افراد نے اسے دھوکا دیا اور حاجی برلاس سے جا ملے جہاں ان کی قوم کے بیشتر افراد تھے۔

تیمور کے پاس اب پیچھے ہٹنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ادھر الجائی کا بھائی امیر حسین افغان قبائل کو لے کر کابل سے شمال کو بڑھ آیا تھا۔ تیمور امیر حسین سے جا ملا۔ قبائل کی یہ جنگ ایک عرصے تک جاری رہی اور کوئی نتیجہ نہ نکلا[1] حتیٰ کہ

---

[1] وسط ایشیا میں اس قسم کی جنگ ایک مسلسل حقیقت رہی ہے اور ایک لحاظ سے آج تک ہے

مصلحت اندیش تیمور

تغلق شمالی مہم سے فارغ ہو کر اس اُلجھے ہوئے کھیل میں داخل ہوا اور جس طرح پرندوں کی ڈار میں پتھر کے گرنے سے وہ تتر بتر ہو جاتے ہیں اسی طرح تغلق کی آمد سے یہ تاتاری بھی بکھر گئے۔

اس مرتبہ اُس نے زیادہ سختی سے کام لیا۔ وہ پورے علاقے کو زیر کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور آتے ہی بایزید جلایر کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حاجی برلاس اپنے آدمیوں کے ساتھ جنوب کی طرف بھاگا مگر راستے میں ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ امیر حسین نے ہمت کرکے جاٹ سیلاب کو روکنے کی کوشش کی مگر بُری طرح پٹا اور بمشکل جان بچا کر بھاگا۔

تیمور شہر سبز کے دروازے پر ڈٹا رہا۔

تغلق اس مرتبہ اپنی فتوحات پر نازاں تھا۔ مگر اس کا وہاں مستقل قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ البتہ اس نے اپنے لڑکے الیاس کو تاتاری ممالک کا حکمران بنایا اور جاٹ سپہ سالار بی کی جُوک کو اس کے ساتھ چھوڑا۔ تیمور کو سمرقند کا مقامی سردار مقرر کیا مگر الیاس اور بی کی جُوک کے تحت۔ بادی النظر میں تو یہ بہت بڑی عزت

---

۵ یہی حال رہا ہے آج کل کے نقشے کے مطابق تاتاریوں کی مملکت میں افغانستان کا وہ تمام حصہ شامل ہوگا جو کابل سے شمال کی جانب ہے۔ موجودہ ایران کے شمالی اضلاع بھی اس میں شامل تھے۔ بخارا کا تمام علاقہ، ماوراءالنہر اور روسی ترکستان تمام تر اس میں شامل تھے۔ کم و بیش ایک لاکھ ترکمان ہتھیار بند تھے اور اس خانگی جنگ کی مفصل تاریخ کے لیے دفتر بے پایاں کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صرف تیمور کی زندگی کے خطوط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سنہ ۱۳۶۰ء سے ۱۳۶۹ء تک تیمور اس خانگی جنگ میں نہایت شدومد سے اُلجھا رہا۔

تھی اور دور اندیش آدمی اس طرح شخصی اغراض کے لیے بے بہا مال و دولت سمیٹ سکتا تھا۔

مگر تیمور کو یہ انتظام پسند نہ تھا اور اس نے اہل شمال کے حکم کے نیچے رہنے پر پرزور اختلاف ظاہر کیا۔ خان نے اس کی توجہ دونوں بزرگوں کے عہد نامے کی طرف منعطف کی "چنگیز خاں حکومت کریگا اور گورگان کا خاندان ان کے ماتحت رہے گا" خان کے الفاظ تھے "تمھارے جد امجد کیومی اور میرے بزرگ کابل خاں کے درمیان یہی معاہدہ ہوا تھا" اپنے خاندان کے بزرگ کا عہد نامہ تیمور کے لیے ایک فریضہ تھا اور غصے کے باوجود اس نے شہر سبز میں حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

جاٹ سپہ سالاری کی جوک کو حالات کی بہتری سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ غیر ملکی افواج کا کماندار تھا اور غیر ملکی افواج کے سردار بہتری کے خواہاں نہیں ہوا کرتے۔ اس نے پورے سمرقند میں لوٹ مار کا سلسلہ شروع کر دیا۔ شہزادہ الیاس بھی زر و دولت کے اس انبار کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ تیمور نے سنا کہ سمرقند کی بہت سی چھوٹی لڑکیاں غلام بنا کر شمال کو بھیج دی گئی ہیں جن میں کئی سید خاندان کی بھی تھیں۔ زین الدین کو جب یہ اطلاع ملی تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ تیمور نے اسی وقت خان کی طرف شکایت بھیجی مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ تیمور نے اپنے آدمی اکٹھے کیے اور شمال کی جانب کوچ کیا۔ جہاں کہیں اسے قافلے میں غلام ملے انھیں رہا کیا اور اگر ضرورت پڑی تو دست شمشیر کا بھی استعمال کیا۔ خان کو تیمور کا یہ اقدام کیسے پسند آسکتا تھا۔ خصوصاً جب اسے یہ کہا گیا کہ تیمور نے بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے تو تغلق نے تیمور کی موت کے احکام صادر کر دیئے۔

تیمور جہاں دیکھتا بربادی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ لوٹ مار انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اسے سزائے موت کا مورد قرار دیا جا چکا تھا۔ اب وطن میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی

مصلحت اندیش تیمور

اس نے مصلحت اندیشی پہ ہزار لعنت بھیجی اور گھوڑے پر سوار ہو کر صحرا کا رُخ کیا۔ یہ کوئی غلط اقدام نہ تھا۔ سکاٹ لینڈ کے بروس کی طرح اس کی طبیعت کو چپا بازی کے بجائے بغاوت زیادہ راس تھی۔

صحرانورد

مغرب کی جانب صحرا پھیلا ہوا تھا۔ سرخی مائل، غیر آباد بے برگ و گیاہ اور بے آب۔ تمازتِ آفتاب نے زمین کو پاؤں رکھنے کے ناقابل بنا دیا تھا۔ دن بھر بگولے اٹھتے رہتے تھے۔ آسمان پر دھند سی چھائی رہتی تھی۔ جیسے سمندر سے جھاگ اڑ اڑ کر چاروں طرف پھیل رہا ہو۔ صرف صبح اور شام کے وقت کچھ نظر آ سکتا تھا۔ دوپہر کے وقت تو یہ دھند آنکھوں کو چندھیا دیتی تھی۔ چاروں طرف تنور سے جلتے ہوئے نظر آتے تھے۔

صحیح معنی میں یہ صحرا بھی نہ تھا۔ سرخی مائل چٹانوں کے درمیان سے خشک نالے ادھر ادھر بل کھاتے بکھرے ہوئے تھے۔ سامی سرائے کا وہی دریا جو یہاں سے چار ہزار فٹ کی بلندی پر فردوس بر روئے زمین بنا رہا تھا یہاں پہنچ کر ختم ہو گیا تھا اور اس کے کناروں پر سوا سخت اور بے مصرف گھاس کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

دریا کے کنارے کہیں کہیں کنوئیں بھی تھے مگر ان کا پانی انسانی استعمال کے ناقابل تھا۔ جانور البتہ اس پر زندہ رہ سکتے تھے۔ جہاں کہیں پانی میٹھا تھا وہاں چند خیمے ضرور نظر آ جاتے تھے جن میں صحرائی قسم کے ترکمان بھیڑوں کے ریوڑوں کی رکھوالی میں مشغول رہتے۔ جہاں کہیں کوئی کمزور کارواں نظر آ جاتا اُسے لوٹ لیتے۔ سزائے موت سے بھاگے ہوئے ملزم بھی اس غیر آباد صحرا میں پناہ لیتے رہتے تھے۔

اسے سُرخ ریت کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ تیمور نے اسی کا رُخ کیا۔ الجائی اس کے ساتھ تھی اور بیس کے قریب ساتھی، بے ہوش اور وفادار ساتھی جو اس کی

ہمراہی میں مصائب جھیلنے پر رضا مند تھے۔ زائد ہتھیار اور دوسرا سامان باربرداری گھوڑوں پر ساتھ تھا۔ وقت ضرورت کام آنے کے لیے کچھ ہیرے جواہرات بھی تھے، مشکیزوں میں پانی بھر کر ساتھ رکھا ہوا تھا اور یہ چھوٹا سا قافلہ نہایت سرعت سے صحرا میں داخل ہو گیا۔ راتوں کو گھوڑے خشک گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیتے اور باری باری ان کی حفاظت کرتے۔ جہاں کنواں نظر آتا وہاں منزل کرتے پھر آگے بڑھ جاتے۔ اتفاق سے الجائی کے بھائی امیر حسین سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی بھاگا ہوا تھا۔ پتلا دُبلا، بلند قامت، ضدی اور بلند ہمت۔ کابل میں وہ حکمران شہزادہ تھا اور اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو واپس لینے کی فکر میں تھا۔

تیمور سے امیر حسین عمر میں چند سال بڑا تھا۔ گو وہ اپنے آپ کو تیمور سے فائق سمجھتا تھا پھر بھی اس شیر دل تاتاری کی جنگی قابلیت اور اس کے عزم و استقلال کی قدر کرتا تھا۔ تیمور خوش تھا کہ ایک ساتھی میسّر آ گیا تھا، گو امیر حسین کے لالچ اور طمع کو وہ اچھی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔

الجائی کے توسط سے دونوں میں ایک رابطہ تھا۔ یہ با حوصلہ خاتون حقیقی معنی میں بادشاہ گر کی نواسی تھی۔ کڑی سے کڑی مصیبت پر وہ مُسکرا دیتی اور کبھی سپاہیانہ صعوبتوں پر لب شکایت وا نہ کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ الجائی مشکل معاملات میں صلاح کار بھی تھی اور اس کے عزم و استقلال نے کئی بار تیمور کے غبارِ خاطر کو فرو کیا۔

امیر حسین اپنی حسین و جمیل بیوی دلشاد آغا کو ساتھ لایا تھا۔ جب منزل پر پہنچتے تو چاروں مل کر حالات کا جائزہ لیتے۔ دونوں قافلے اکٹھے ہونے کے بعد ان کے پاس ساٹھ کے قریب ہتھیار بند تھے۔ اس طاقت کے زعم میں انھوں نے فیصلہ کیا کہ بحیرِ خوارزم جسے آجکل بحیرۂ ارال کہتے ہیں، وہاں کا رُخ کیا جائے۔ وہاں تجارتی راہیں

بھی تھیں اور بڑے بڑے شہر بھی۔

تیمور انھیں لے کر خیوا پہنچا مگر حاکم شہر نے اچانک پہنچنے والے مہمانوں کو پہچان لیا۔ شکار خود اڑ کر اور اس بے پناہ صحرا کو عبور کر کے اس کے جال میں پھنس چکا تھا۔ کیوں نہ انھیں پکڑ کر جاٹ مغل خاں کے حوالے کر دے اور یوں مفت کی دولت کا حقدار بنے۔ جب ان پر یہ حالت واضح ہوئی تو انھوں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً میدان کا رخ کیا۔ حاکم کئی سو سوار لے کر ان کے تعاقب میں نکلا۔

مقابلے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ جب دشمن نزدیک آ پہنچا تو تیمور اپنے ساتھیوں کو ایک پہاڑی کی چوٹی کی طرف لے گیا اور جونہی تعاقب کرنے والے بالکل قریب پہنچے اس نے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور پلٹ کر خیوا والوں پر حملہ بول دیا۔ وہ بھونچکا سے رہ گئے۔

اب دستی لڑائی شروع ہوئی اور نہایت خونریز جس کے تاتاری پشتہا پشت سے عادی تھے۔ انھوں نے چھوٹی گول ڈھالیں اپنے بازوؤں پر باندھ رکھی تھیں۔ انھیں بلند کر کے دشمن کے وار روک رہے تھے اور اسی ہاتھ سے کمان کا چلہ بھی کھینچ رہے تھے۔ داہنے ہاتھ سے ترکش سے تیر نکال کر اپنی کمانوں سے تیروں کی بوچھاڑ برسا رہے تھے جو زرہ کے پار ہو رہے تھے۔ یہ شہسوار دونوں ہاتھوں سے اپنی کمان کا استعمال کر سکتے تھے اور وقت ضرورت سرپٹ گھوڑے سے عقب کی جانب بھی تیر نشانے پر پھینک سکتے تھے۔

ان کی کمان بائیں ران کے ساتھ لٹکی رہتی تھی اور ترکش کا منہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ ان کے تیروں کی نوک فولاد اور ہڈی سے جڑی ہوتی تھی اور اثر میں انگلستان کی لانبی کمانوں کی ہم پلہ تھی۔ ان ہتھیاروں سے مسلح تاتاری سپاہی گذشتہ صدی کی سوار فوج سے ٹکر کھاتے تھے جن کے پاس طمنچے ہوا کرتے تھے۔ ایک ہاتھ سے تیر اور

دوسرے سے کمان اس سرعت سے کھینچی جاتی تھی کہ یہ ایک ہی حرکت معلوم ہوتی تھی اور حقیقت میں پستول کی گولیوں کی سی تیزی سے ان کے تیر برستے تھے۔ بازو سے بندھی ہوئی ڈھال اور چھوٹی کمان کا یہ فائدہ تھا کہ گھوڑے کا سر تیر کی راہ میں حائل نہ ہوتا تھا۔

تاتاریوں نے اپنے تیز رفتار گھوڑوں کو خیوا کے سپاہیوں کے اردگرد ایسے چکر دیئے کہ ان پر ہر طرف سے حملہ ہوتا نظر آ رہا تھا۔ نعرہ لگاتے اور تیر برساتے وہ کبھی اپنے دشمن کے ایک پہلو پر نظر آتے اور کبھی دوسرے پر۔ وہ بارہ بارہ کی تعداد میں اکٹھے ہو کر حملے کرتے۔ بکھر کر دشمن کو اکیلے اکیلے سنبھالتے، پھر اسی تیز رفتاری سے وہ پلٹ کر علیحدہ ہو جاتے اور تیر برساتے ہوئے ایک طرف کو نکل جاتے۔ اپنی چھوٹی تیغ کو وہ شاذ و نادر ہی کھینچتے اور وہ بھی جب دشمن اتنا قریب ہوتا کہ کمان کھینچی نہ جا سکتی مگر تیغ بھی اسی سرعت سے چلتی جس سے کمان کا چلّہ کھینچا جاتا۔ نیام سے نکلتے وقت ایک بجلی سی چمکتی اور دشمن کا خرمن تباہ کرتی ہوئی پھر نیام میں چلی جاتی اور داہنا ہاتھ پھر ترکش پر جا پہنچتا۔ ان کا محبوب ہتھیار ان کی کمان تھی۔

طرفین سے زین بسرعت خالی ہو رہے تھے۔ دونوں لشکروں کے سردار منجدھار سے دور ہی رہتے۔ قائد کا کام رہبری ہے اور منجدھار میں پھنس کر نرغے میں آنے کا خطرہ ہوتا ہے اور لشکر کی قیادت ممکن نہیں ہوتی۔ جن سواروں کے گھوڑے کام آ جاتے انھیں دوڑ کر بے سوار گھوڑوں کو پکڑنا پڑتا اور جیسے ہی نیا گھوڑا میسر آتا وہ پھر لڑائی میں شامل ہو جاتے۔ ایلچی بہادر جو تیمور کا وفادار اور جیالا تاتاری تھا جب گھوڑے سے علیحدہ ہوا تو پا پیادہ ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور مقابلہ شروع کر دیا۔ جب تیمور نے دیکھا کہ وہ اپنا مقام نہیں چھوڑتا اور بے وجہ خطرے میں پڑ رہا ہے تو اس نے گھوڑا بڑھا کر ایلچی بہادر کی کمان کھینچ کر اس کے تار کاٹ ڈالے تاکہ وہ مجبوراً اپنے بچاؤ کا فکر کرے۔

عین اسی وقت امیر حسین خیوا کے سپاہیوں کو چیرتا ہوا ان کے سردار تک

جا پہنچا۔ ابھی علمبردار کا سر قلم کیا تھا کہ چاروں طرف سے گھیرے میں آگیا۔ تیمور نے دیکھا اور اس کی کمک کو بڑھا۔ تیمور کو بڑھتے دیکھ کر خیوا کے سپاہی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور امیر حسین ان کے نرغے سے نکل گیا۔ تیمور نے گھوڑے کی باگ کھینچ کر دو دستی تلوار سے دشمن کو قریب آنے سے روکا۔ جلد ہی اس کی کمک کو باقی تاتاری پہنچے اور خیوا والے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

اب ہلہ بولنے کا وقت تھا۔ تیمور نے پکار کر اپنے ساتھیوں کو حملے کے لیے یکجا کیا اور اکٹھے ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ امیر حسین کے گھوڑے کو تیر لگا اور اس نے اپنے سوار کو گرا دیا۔ امیر کی بیوی دلشاد آغا دیکھ رہی تھی، وہ اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑا کر آگے بڑھی۔ اس کے قریب پہنچ کر کود کر اُتری اور باگ اپنے خاوند کے ہاتھ میں دے دی۔ آناً فاناً امیر حسین گھوڑے کی پیٹھ پر تھا اور تاتاریوں کے حملے میں شامل۔

تیمور نے خیوا کے حاکم کو نشانہ بنا کر تیر چھوڑا جو اس کے گال کو چیر کر نکل گیا، اور حاکم زمین پر تھا۔ دوسرے ہی لمحے تیمور اس کے سر پر تھا اور چھوٹا نیزہ کھینچ کر اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ سردار کے مرنے کے بعد خیوا کے لشکر کا رُکنا مشکل تھا۔ بھاگتے اور منتشر ہوتے لشکر پر تاتاری اپنے ترکش خالی ہونے تک ان پر تیر برساتے رہے۔ تیمور نے دلشاد آغا کو الجائی کے گھوڑے پر بٹھایا اور پہاڑی کی چوٹی پر جہاں عورتیں اور سامان تھا وہاں سب مجتمع ہوئے۔

جب دیکھا تو صرف سات آدمی زندہ بچے تھے اور ان میں سے اکثر زخمی تھے۔ اُدھر جب خیوا والے میدان میں پہنچے تو یکجا ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ تاتاریوں کے لیے اب وہاں رُکنا از حد پُر خطر تھا۔ تیمور نے اسی وقت کوچ کا حکم دیا۔ خیوا والے اسی وقت تعاقب پر نکل کھڑے ہوئے مگر اندھیرے میں انھیں ڈھونڈ نہ سکے۔

"نہیں، ابھی نہیں" تیمور نے ہنستے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا "ابھی سفر ختم نہیں ہوا"

صحرا کی وسعت اور اندھیرا، وہ دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ مگر آخر نصف شب کے قریب خوش قسمتی سے ایک کنوئیں پر پہنچے۔ وہاں تین سپاہی بھی تھے جو بلخ سے بھاگ کر پا پیادہ پہنچے تھے۔ کنوئیں کا پانی میٹھا تھا۔ انھوں نے گھوڑیں کو چرنے کے لیے چھوڑا اور خود آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ تیمور اور امیر حسین مشورہ کرنے بیٹھے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ان کا علٰحدہ علٰحدہ ہو جانا بہتر ہے اس طرح ان کے پہچانے جانے کا امکان کم تھا۔

صبح جب اٹھے تو دیکھا کہ تینوں بلخی جا چکے تھے اور سات گھوڑوں میں سے تین گھوڑے بھی ساتھ لے گئے تھے۔ گھوڑے بانٹے گئے اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ دوبارہ ملنے کے لیے امیر حسین کی مملکت کے شمال میں ایک مقام چُنا گیا۔ پہلے امیر حسین روانہ ہوا۔ جب وہ جا چکا تو ایک گھوڑے پر بچا ہوا سامان لادا گیا اور دوسرا گھوڑا جو اچھا تھا اس پر الجائی سوار ہوئی۔ تیمور نے اپنے ساتھ صرف ایک آدمی رکھا تھا۔ جب الجائی نے تیمور کو پا پیادہ دیکھا تو مسکرا کر کہا:

"میرے سرتاج اس سے زیادہ بدبختی کیا ہو سکتی ہے کہ اب آپ پیدل چل رہے ہیں"

ان کے پاس خوراک بھی نہ تھی۔ مگر دور اُفق پر کچھ بکریاں چرتی ہوئی نظر آئیں۔ انھوں نے گھوڑوں کی باگ اس طرف موڑی چند بکریاں خریدیں اور انھیں آگ پر بھونا۔ نہایت خوش ہو کر کھانا کھایا اور باقی ماندہ کو خرجیوں کے ساتھ لٹکا لیا۔ چرواہوں سے پوچھا کہ اس ملک سے باہر جانے کا بھی کوئی راستہ ہے۔ انھوں نے شمال کی جانب اشارہ کیا اور کہا:

"یہ ترکمانیوں کے جھونپڑوں کو جاتا ہے۔"

وہ اس راستے پر لگ گئے اور کچھ دیر کے بعد جھونپڑوں تک جا پہنچے جو خالی نظر آتے تھے۔ تیمور ایک جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ بمشکل سامان اتار کر اندر رکھ چکے تھے کہ دوسرے جھونپڑوں سے شور بلند ہوا اور ترکمانوں نے انھیں ڈاکو سمجھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ تیمور اپنے ساتھی کے ساتھ دروازے پر پہنچا۔ تیر تو ختم ہو چکے تھے۔ صرف کمانیں پکڑ کر دکھاوے کے طور پر انھیں سامنے کیا۔ مگر ترکمانی اس طرح کہاں رُکتے تھے۔

تیمور نے اپنی بیکار کمان پھینک دی اور تلوار کھینچ کر مکان کے باہر نکل آیا۔ جونہی وہ باہر آیا ترکمان سردار نے اسے پہچان لیا۔ اس نے تیمور کو شہر سبز میں بارہا دیکھا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو پکار کر روکا اور خود اس نوجوان تاتاری سردار سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھا۔

"واللہ" اس نے پکار کر کہا "یہ تو ماوراء النہر کا سردار ہے۔"

ترکمان اب تیمور کے قدموں میں تھے۔ صحرائی زندگی کا شک و شبہ رفع ہو چکا تھا۔ پوستینوں میں لپٹے ہوئے ترکمان تیمور سے معافی مانگ رہے تھے اور الف لیلہ کی کہانیوں کا شہزادہ مسکرا مسکرا کر انھیں قریب بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ ایک بھیڑ ذبح کی گئی اور مہمان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ ایک ہی خوان سے سب نے کھایا۔ قبیلے کے بچے بھی مجمع کے قریب آ آ کر کھڑے ہوتے۔ معزز مہمان کے کارنامے دور دراز تک پہنچے ہوئے تھے۔ تیمور سے تازہ ترین واقعات اور حالات پوچھے گئے۔ کون کس جگہ کا بادشاہ بننے میں کامیاب ہوا ہے۔ کون کس سے برسرپیکار ہے اور کن ممالک میں امن وامان ہے۔ ان بادیہ نشینوں کے لیے غیر متوقع طور پر بیرونی دنیا کی خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ سب کچھ دریافت کرنا چاہتے تھے۔

اس رات تیمور صبح تک نہ سو سکا۔

دوسرے دن تیمور نے ترکمان خان کو بیش قیمت تحائف پیش کیے۔ ایک قیمتی لعل اور موتیوں سے جڑے ہوئے دو جوڑے لباس کے۔ جواباً خان نے تین گھوڑے پیش کیے اور آگے جانے کے لیے ایک رہنما بھی ساتھ بھیجا۔

بارہ دن میں انھوں نے صحرا کو عبور کیا۔ اب وہ خراسان کی سڑک کی جستجو میں تھے۔ پہلا گاؤں جو ان کی راہ میں آیا وہ خالی تھا۔ وہ رک گئے۔ پانی کے لیے زمین کھودی۔ جانوروں کو پلایا اور جب جاکر آرام کی طرف متوجہ ہوئے۔

یہاں ایک اور ہی مصیبت اُن کے انتظار میں تھی۔ انھیں قریب کے قبیلے کے لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ اور انھیں قید کرکے اپنے سردار علی بیگ کے پاس لے گئے۔ تیمور سا قیدی۔ اس سے بڑھ کر کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی۔ اس نے ان کا تمام مال اسباب چھین کر قید کر لیا۔ میاں بیوی کو ایک بدبودار پسوؤں سے بھرے ہوئے مکان میں ڈال کر ان پر پہرہ لگا دیا۔

تیمور الجائی کے لیے ایسے مکان کو کس طرح پسند کرتا مگر محافظ دستہ اکیلے سردار کو کیا خاطر میں لاتا۔ تیمور ایک دو بار لڑ جھگڑ کر خاموش ہو رہا۔ باسٹھ دن تک وہ اس گندے مکان میں قید رہے۔ گرمی کے دن تھے اور تنگ و تاریک مکان۔ جب تیمور رہا ہوا تو اس نے قسم کھائی کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ کبھی کسی آدمی کو قید کی سزا نہ دیگا۔

علی بیگ اس کوشش میں تھا کہ وہ تیمور کے بدلے خاصی دولت حاصل کرے مگر اس دوران میں اس کے بھائی کو خبر پہنچی۔ علی بیگ کا بھائی ایک ایرانی قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے بھائی کو پیغام بھیجا کہ جاٹوں اور شہر سبز کے سردار کے جھگڑے میں پڑنا اس کے لیے مصلحت سے بعید ہے۔ ساتھ ہی اُس نے تیمور کے لیے تحائف

بھی روانہ کیے اور یوں تیمور کو رہائی نصیب ہوئی۔

علی بیگ نے بھائی کے کہنے پر چاہی حیل و حجت کے بعد تیمور کو رہا تو کر دیا مگر اس کا سامان پھر بھی نہ لوٹایا۔ روانگی کے وقت بھی ایک نیم مُردہ سا گھوڑا اور ایک مکروہ شکل کا اونٹ دیا۔

سیاہ و دراز گیسو الجب ئی ایسے میں بھی مُسکرا رہی تھی۔ جب وہ ایک بار پھر جادہ پیما ہوتے تو الجائی مسکرائی اور پلٹ کر تیمور سے کہا:

"میرے سرتاج! ابھی سفر ختم نہیں ہوا۔"

صرف ایک اونٹ ایک گھوڑا

موسم خزاں کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ امیر حسین کے ساتھ ملاقات کا تعین شدہ مقام دور جنوب کی جانب تھا، آمو دریا کے اُس پار۔ مگر وطن کو دیکھنے کا شوق بھی عجیب شے ہے۔ وہ جب قریب سے گزرا تو ایک نہایت طویل چکر کی ضرورت کے باوجود تیمور سے نہ رہا گیا اور اس نے وطن کا رُخ کیا۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور حسین سے خالی ہاتھ ملنا قرین مصلحت نہ تھا۔ آمو دریا کے قریب اس نے ایک دوست کے ہاں سے جو سردار قبیلہ بھی تھا، چند گھوڑے اور پندرہ ساتھی لیے۔ اب الجائی کے لیے ایک اچھا سا گھوڑا علٰحدہ کر کے اس پر کجاوہ لگایا گیا جس میں وہ آرام سے سفر کرنے لگی۔ نیم مردہ گھوڑا اور بیمار اونٹ غریبوں کو دے دیے گئے۔

تیمور کو اپنی بیگم سے انتہائی اُنس تھا۔ جب یہاں سے روانہ ہوئے تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ سمرقند کا سفر تنہا ہی کرے اس لیے الجائی کے قافلے کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے نکل گیا۔ مگر جب وہ آمو کے تٹ پر پہنچا تو اس نے مٹھیا بند دستے اِدھر اُدھر پھرتے دیکھے۔ اُس نے اپنا قافلہ روک لیا اور ساتھیوں سے کہا کہ زیادہ گرمی کی وجہ سے سفر مناسب نہیں۔ دریا کے کنارے درختوں کے سایے میں وہ ہفتے عشرے کے لیے رُک گئے۔

الجائی یوں اچانک تیمور کو دیکھ کر حیران سی ہوئی۔ اُدھر تیمور ایک بار اُڑتی

ہوئی گرد دیکھ کر گھبرایا کہ کہیں دشمن نہ ہو۔ اُس نے گھوڑے مع کجاووں کے دریا میں اُتار دیے اور تیرنا شروع کر دیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچے تو الجائی خطرے سے دُور ہو چکی تھی۔

تیمور نے الجائی کو تو پاس کے گاؤں میں چھپایا اور خود مغرب کے وقت رفیقوں کے ساتھ سمرقند میں داخل ہوا۔ جاٹ اب بھی اس کی جستجو میں تھے مگر تیمور اس کے باوجود اڑتالیس دن تک وہاں ٹھہرا رہا۔ رات کے وقت وہ سرائے میں بھی جاتا اور وہاں دیر تک نو وارد کاروانوں سے راستوں کے متعلق معلومات سنتا رہتا۔ وہ دوستوں کے گھروں میں خفیہ طور پر جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ یک لخت علم بغاوت بلند کیے۔ کئی بار اس نے جاٹ سردار کو افسروں کے ساتھ گلیوں میں سے سوار ہو کر جاتے دیکھا۔

اس کی یہ جسارت بے ثمر نکلی۔ بغاوت کے لیے لوگ ابھی تیار نہ تھے۔ وہ جنگجو ضرور تھے مگر اندھا دھند جنگ میں کودنے سے احتراز کرتے تھے۔ اگر انھیں کامیابی کا کچھ بھی یقین ہوتا تو وہ ضرور میدان میں اتر آتے۔ حالات غیر مساعد تھے۔ جلایر شہزادوں کو الیاس سرنگوں کر چکا تھا۔ حسین پناہ کے لیے سرگرداں تھا اور اس کے محلات میں ایک جاٹ سردار حکمران بن بیٹھا تھا۔ ایسے میں نوجوان تیمور کی آواز پر کون لبیک کہتا۔

انھوں نے تیمور کو مطلع کیا کہ جاٹوں کو اس کی موجودگی کا علم ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر برلاس کے خلف کو گھوڑا اسے کر رات کی تاریکی میں گم ہونا پڑا۔

مگر وہ تنہا نہ تھا۔ چند سر پھرے، جنگ کے دلدادہ، رزم کے خوگر ترکمان اور بلند ہمت عرب اس کے ساتھ ہو لیے۔ لشکر کی حیثیت سے تو وہ اتنے کارآمد نہ تھے مگر جادہ پیمائی کے ساتھی کے طور پر خوب تھے۔

صرف ایک اونٹ، ایک گھوڑا

جب تیمور انھیں شہر سبز کے پاس لے آیا تو وہ خوب ہنسے۔ سفید مرمریں گنبد کے سامنے چراگاہ کی بلندیوں پر انھوں نے ڈیرے ڈالے۔ جاٹ اس کے محل میں گھومتے پھرتے اور سوار ہو کر اس کی تلاش میں جاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ انھوں نے تیمور کے کارنامے برلاس بہادر کے سامنے نہایت فخریہ لہجے میں سنائے اور وہ باریابی کے لیے حاضر ہوا۔ ایلچی بہادر، وہی جس کی کمان تیمور نے چھینی تھی اور سفید ریش جاکو برلاس بھی اس سے ملنے آئے۔

بادشاہ گر کے دربار کے یہ دیرینہ سپاہی دیر تک تیمور کے ساتھ ہم پیالہ رہے۔ "جب اللہ کی زمین اتنی وسیع ہے" انھوں نے ہنس کر کہا "تو پھر دیواروں سے گھر کر رہنے سے کیا حاصل؟"

تیمور نے انھیں روک کر کہا "باتیں اور صرف باتیں"، پھر "تمھارے اعمال کیا ہوں گے۔ کیا تم کتے ہو جو جاٹ کے دسترخوان کے ٹکڑے کھاؤ گے یا شاہین ہو اور اپنا شکار خود کرو گے؟"

"واللہ" دونوں برلاس بیک وقت بولے "ہم کتے نہیں؟" جب الجائی اٹھ کر ان کی محفل میں آئی تو انھوں نے نہایت ادب سے اس کی تعظیم کی۔ یہ وہ شہزادی تھی جو اپنے بادشاہ کی جنگوں میں شریک ہو چکی تھی اور سپاہی کی نگاہ میں ایسی خاتون قابلِ صد تعظیم ہوتی ہے۔ جب موسم خزاں کے اختتام کے قریب تیمور وہاں امیر حسین کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا تو دونوں بہادر اس کے ہمراہ تھے۔

یہ کوئی آسان سفر نہ تھا جسے کمزور دل طے کر سکتے۔ پانچ سو میل طویل۔ آسمان کو چھوتی ہوئی بلند چوٹیوں کے درمیان سے چکر کاٹتا ہوا اور افغانستان کے کوہستانوں کو چیرتا ہوا راستہ۔ وہ افغانستان جس کے پہاڑوں کی مساحت

آج بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ پہلے تو ایک تنگ گھاٹی کی بلندی کی طرف جانا تھا جس کے سرے پر پہنچ کر برف کو ہٹائے بغیر یہ نظر ہی نہ آتا تھا۔

پھر پہاڑ کی برفانی چوٹیوں اور برف کے بے پناہ تودوں کے نیچے سے گزر کر اور بھی زیادہ بلندیوں کی طرف بڑھنا تھا جس سے آگے برف سے ڈھکی ہوئی سطح مرتفع تھی جہاں انھوں نے اپنے گول خیمے نصب کیے۔ سفر دن کے وقت ہوتا تھا اور برف کی چمک آنکھوں کو چندھیا دیتی تھی۔ گھوڑوں کی پیٹھوں پر نمدے کے کمل پڑے ہوئے تھے اور آدمی تو بھیڑیے اور دوسرے جانوروں کی کھالوں کی پوستینوں کے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکتے۔ ہوا اس قدر تیز ہوتی کہ پوستینوں کو بھی چیر کر ہڈیوں تک جا پہنچتی۔ راستے میں جنگل بھی پڑتے تھے۔ یہاں سے وہ ایندھن کے لیے لکڑیاں کاٹ کر ساتھ لے لیتے۔ کہیں کہیں قبائلی قلعوں اور ان کے میناروں کے نیچے سے بھی گزرنا پڑتا جن کے سنتری آنکھوں سے اوجھل ہوتے مگر انھیں پکارتے ضرور۔ ان کی پکار کی تائید میں پوری بستی کے کتے بھی بھونکنا شروع کر دیتے۔

کئی بار افغانوں نے ان پر حملہ بھی کیا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ کیسے لوگوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ ہر ایسے حملے کے بعد تیمور اور اس کے ساتھی پہلے سے زیادہ دولتمند ہو جاتے۔ انھوں نے ہندوکش کی بلندیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا بارہ ہزار فٹ بلند درہ بھی عبور کیا اور گرتے پڑتے کابل کی وادی میں پہنچے۔

ابھی دشواریوں کا خاتمہ نہ ہوا تھا۔ ان کے لیے شہر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے شہر کا چکر کاٹ کر وہ آگے بڑھے۔ وہاں سے انھوں نے سامان خورد و نوش خریدا اور نئے گھوڑے مہیا کیے اور قندھار کے راستے پر ہو لیے جو برف نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ آسان تھا۔ آخر اس مقام پر پہنچے جہاں

امیر حسین سے ملنے کا اقرار تھا۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ موجود تھا۔ ایسا ہی لشکر مگر تعداد میں قدرے زیادہ۔

موسم سرما انھوں نے آرام سے گزارا۔ سردیوں کے اختتام کے قریب پاس کی پہاڑیوں کے حاکم نے تحائف دے کر ایلچی روانہ کیا۔ اس سے دونوں کی امید تازہ ہو گئی۔ حاکم کے سجستانی باشندوں میں بغاوت کی وجہ سے کئی پہاڑی علاقے اس کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ اس نے بیش قیمت تحائف کا اقرار کیا۔ شرط یہ تھی کہ تیمور اور امیر حسین بغاوت کو فرو کرنے میں اس کی مدد پر آمادہ ہو جائیں۔ دونوں نے یہ شرط قبول کر لی۔ امیر حسین چاہتا تھا کہ جنوبی صوبوں کا مالک بن جائے اور تیمور کے لیے جنگ میں شمولیت ہی کافی تھی۔

جونہی راستے برف سے خالی ہوئے دونوں سرداروں نے اپنے لشکروں کو کوچ کا حکم دیا اور حاکم سجستان سے جا ملے۔ تیمور ایسے ہی موقعوں کا منتظر رہتا تھا۔ رانوں تلے گھوڑا، کمر سے کرد تیغ، داہنے ہاتھ میں نیزہ اور بائیں میں ڈھال کمان رانوں سے لگی ہوئی، اس سے خوش تر منظر کون سا ہو سکتا تھا۔

وہ بہت جلد اکثر قلعوں پر قابض ہو گئے۔ کسی پر حملہ کیا، کسی پر شبخون مارا، اور کسی نے یونہی دروازے کھول دیے۔

حسین نے البتہ بدمزگی پیدا کر دی۔ دیہات کو لوٹتا اور اکثر مقامات پر اپنے آدمی متعین کر دیتا۔ تیمور کو کوئی لالچ نہ تھا البتہ حسین کے رویے کی وجہ سے سجستانی ناراض ہو گئے۔ باغیوں کو بھی خلیفوں میں انتشار پھیلانے کا موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے حاکم کو پیغام بھیجا:

"ہم تو تمھارے دوست ہیں۔ خیال رکھنا کہ اگر ہماری جگہ تاتاریوں نے لے لی تو وہ پورے ملک پر قابض ہو جائیں گے"

ایک رات حاکم سجستان خاموشی سے اس متحدہ لشکر سے علیحدہ ہو گیا اور اپنے سابق باغیوں سے جا ملا۔ بدل بدل جانا ان کوہستانی قبائل کا خاصہ تھا۔ خصوصاً جب نو واردوں سے معاملات پڑتے تو وہ نہایت شکی مزاج ثابت ہوتے۔ انھوں نے متحد ہو کر تیمور پر حملہ کیا جسے اس نے روک کر جوابی حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ایک مقام پر اس کے گرد صرف بارہ سپاہی تھے اور تمام سجستانی اسی کو اپنے تیروں کا ہدف بنا رہے تھے۔ ایک تیر نے اس کے بازو کی ہڈیاں توڑ دیں اور ایک اور سے اس کا پاؤں زخمی ہوا۔ مگر یہ وقت زخموں کی طرف متوجہ ہونے کا نہ تھا۔ اس نے تیروں کو کھینچ کر نکال باہر پھینکا، پھر لڑائی میں مشغول ہو گیا۔ اس وقت تو تیروں کا نکال کر پھینک دینا آسان کام تھا مگر بعد میں ان زخموں نے اسے عرصے تک تکلیف دی اور صاحب فراش ہونا پڑا۔

سجستانیوں کو شکست ہوئی۔ اس فتح کی وجہ سے دونوں سرداروں کو مزید ساتھی ملے اور خاصی دولت ہاتھ آئی۔ حسین اپنا لشکر لے کر شمال کی جانب روانہ ہوا اور تیمور زخموں کی وجہ سے قریب ہی کی پہاڑیوں میں رک گیا۔

الجائی بھی یہاں آگئی۔ عرصے کے بعد نوجوان و خوبرو شہزادی کو اپنے بادشاہ کے ساتھ خاموشی سے رہنے کا موقع ملا۔ جہاں جنگ کا نقارہ اسے سوار ہونے کا پیغام نہ دے سکتا تھا۔ ان کا شامیانہ نہایت فرحت افزا مقام پر نصب تھا۔ اس کے گرداگرد انگور کی بیلیں بل کھا رہی تھیں۔ خنک ہوا ترو تازگی بخش رہی تھی اور الجائی اپنے سرتاج کی خدمت کا موقع غنیمت جان کر اس کی تیمارداری میں منہمک تھی۔ ہری بھری گھاس نے گھوڑوں کے لیے بھی بہشت بریں کا سماں باندھ دیا تھا۔ جب سورج غروب ہو جاتا تو وہ قالین پر بیٹھ کر دور وادیوں میں پہاڑوں کے سایے دیکھتے رہتے جو ماہ منور کی رفتار

کے ساتھ ساتھ اپنا مقام بدلتے رہتے۔ یہ چاند اور اس چاند کے ماہانہ سفر کی مدت الجائی کی اپنی تھی۔ اس کا محبوب سرتاج اس کے قریب تھا اور ننھا جہانگیر اس سے کھیل میں مشغول۔

جوں جوں زخم بھرتے گئے تیمور نے خیمے سے باہر نکلنا شروع کیا اور لنگڑا لنگڑا کر زخمی پاؤں کا جائزہ لینے لگا۔ الجائی اسے اس طرح چلتے دیکھ کر مسکراتی اور سوچتی کہ اب تیمور کے ساتھ قیام کے دن گنتی کے رہ گئے ہیں۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب تیمور کو مکمل صحت نصیب ہوئی اور اس نے ہتھیار طلب کیے۔ الجائی نے سپاہی کی بیوی کے فرائض ایک بار پھر انجام دیے۔ اسے زرہ پہنائی۔ کمر سے تلوار باندھی، پھر ہونٹ چباتے ہوئے آنے والی جدائی کے غم کا تصور ذہن سے ہٹانے کی کوشش کی۔ جھکا ہوا سر اٹھا، آنکھیں ملیں، پلکیں کانپیں اور الجائی کے منہ سے نکلا:

"میرے سرتاج! خدا تمہارا ناصر و محافظ رہے!"

پتھر کا پُل

ضروری تھا کہ تیمور شمال کی جانب رُخ کرتا۔ امیر حسین نے جلد بازی میں قریب ترین جاٹ سردار پر حملہ کر دیا تھا اور بُری طرح پٹا تھا۔ اس کے آدمی منتشر ہو چکے تھے۔ حسین کا یہ اقدام تیمور کی رائے کے خلاف تھا اور وہ ازحد غصے میں تھا مگر اسے حسین کی مدد کو پہنچنا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ضروری تھا کہ تیمور پہاڑوں کو چھان کر حسین کے ساتھیوں کو ڈھونڈ نکالے اور ان کے علاوہ بھی جو کارآمد آدمی ملیں انھیں اکٹھا کر لے۔ ابھی اس کے ہاتھ کا زخم مندمل نہ ہوا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ بیک وقت راس کا سنبھالنا اور ہتھیار استعمال کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

فطری بات تھی کہ اس سفر کی روانگی کے وقت اس کی طبیعت کی خفگی عود کر آتی۔ راستے میں شکار سے دل بہلاتا ہوا وہ شمال کو بڑھا۔ اس نے آمو دریا کے قریب حسین کے انتظار میں خیمے نصب کر رکھے تھے کہ اسے دیکھ لیا گیا۔ راوی نے یہ واقعہ بالتفصیل بیان کیا ہے۔

تیمور کے خیمے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے تھے۔ دوسری طرف پہاڑیوں کا چھوٹا سا سلسلہ تھا۔ انتظار میں کئی روز گزر چکے تھے۔ اب اس کی طبیعت میں بے چینی پیدا ہو چکی تھی اور نیند مشکل ہو رہی تھی۔ چاند روشن تھا۔ رات غیر معمولی طور پر صاف تھی اور تیمور ندی کے کنارے ٹہل رہا تھا جب سے

پتھر کا پُل

پاؤں میں زخم ہوا تھا اس کی عادت ہو گئی تھی کہ وہ زخمی پاؤں پر زور دے کر چلتا۔ زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہ ہوا تھا اور تیمور تھا کہ وہ زخم قبول کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔

جب وہ پہاڑی کے اوپر پہنچا تو چاندنی چاندنی مدھم سی پڑ چکی تھی اور مشرق میں سحر کی زردی پھیل چکی تھی۔ وہ وہیں پہاڑی پر فریضہ صبح کے لیے بارگاہِ خداوندی میں جھک گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہتھیار بند سوار پہاڑی کی دوسری طرف سے گزر رہے تھے اور بلخ کی جانب سے آ رہے تھے۔ بلخ جاٹوں کا مضبوط مرکز تھا۔ تیمور جلدی سے اپنے خیموں کی طرف گیا۔ اپنے آدمیوں کو بیدار کیا اور گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔

گھوڑا آنے پر وہ اکیلا ہی ان سواروں کے للکارنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اسے دیکھ کر وہ رک گئے اور مدھم روشنی میں اسے غور سے دیکھنے لگے۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" تیمور نے پکار کر پوچھا "اور کہاں کا عزم ہے؟"

"ہم امیر تیمور کے سپاہی ہیں" ایک آدمی نے جواب دیا "اور اسے ڈھونڈنے آئے ہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ وہ کمرود سے چل کر اس وادی میں آیا ہے مگر ہم اسے ڈھونڈ نہیں سکے۔"

تیمور اس آواز کو پہچانتا نہ تھا اور نہ ان سواروں کے ڈیل ڈول ہی سے اسے کچھ معلوم ہو سکا۔ اس نے مزید معلومات کے خیال سے کہا:

"میں بھی تیمور کا سپاہی ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری رہبری کر سکتا ہوں"

ایک آدمی کالم سے علیحدہ ہو کر اپنے سردار کی جانب بڑھا اور تیمور نے اسے کہتے ہوئے سنا:

"ایک رہنما مل گیا ہے جو ہمیں امیر کے پاس لے جائیگا۔"

تیمور نے گھوڑا اور آگے بڑھایا تاکہ افسروں کو پہچان سکے۔ یہ برلاس قبیلے کے تین سردار تھے اور اپنے ساتھ سواروں کے تین دستے لائے تھے۔ انھوں نے اس واقف رہنما کو قریب آنے کے لیے کہا۔ وہ اور قریب ہو گیا۔

"امیر تیمور؟"

وہ کود کر زمین پر آ رہے اور جھک کر امیر کی رکاب چوم لی۔

تیمور بھی گھوڑے سے اتر آیا۔ اس بے پایاں خوشی میں وہ اپنے ساتھیوں سے گلے ملنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے تینوں سرداروں کو تحائف پیش کیے۔ ایک کو خود عطا ہوا، دوسرے کو کمر بند اور تیسرے کو زرہ۔ سپاہی امیر کی طرف سے سرداروں کو سپاہیانہ انعام۔ اب بیٹھ کر حالات پر تبصرہ کرنے کی باری تھی۔ باتیں ہوئیں۔ شکار مہیا کیا گیا۔ جشن منایا گیا اور جب نو واردتیمور کے ساتھ ایک ہی برتن میں نمک کھا چکے تو یقین ہو گیا کہ دلوں میں کسی قسم کی کدورت نہیں۔ انھیں میں سے تیمور نے ایک سکاؤٹ روانہ کیا تاکہ دریا پار سے جا کر معلوم کر آئے کہ جاٹ کیا کر رہے ہیں۔ اس نے آمو کو تیر کر عبور کرنے کی کوشش کی مگر اس کا گھوڑا ڈوب گیا۔ وہ خود خوش قسمتی سے چند ریت کے ٹیلوں سے جا لگا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ جب وہ لوٹا تو معلوم ہوا کہ بیس ہزار پر مشتمل جاٹ لشکر شہر سبز کی سمت سے آگ اور بربادی پھیلاتا ہوا آ رہا ہے۔ یہ آدمی اپنے گھر کے قریب سے گزرا تھا۔ گو اس کا گھر فوج کی عین راہ میں تھا پھر بھی اپنے گھر کی طرف متوجہ نہ ہوا تھا۔

"توبہ، یہ کیونکر ممکن ہے" اس نے کہا "جب میرے امیر کا کوئی گھر نہیں، میں اپنے گھر کس منہ سے جا سکتا ہوں؟"

اس خبر سے تیمور بے صبر سا ہو گیا۔ جیسے ہی جاٹوں نے دیکھا کہ میدان میں ایک لشکر ان کے خلاف موجود ہے۔ اپنی عادت کے مطابق لوٹ مار میں مشغول ہو گئے۔

پتھر کا پُل

بدرست کہ تاتاری منتشر تھے اور ان کا مرکز مٹ چکا تھا۔ مگر اس لوٹ مار کی وجہ سے تیمور کو امید ہو گئی کہ دریا کے پار کے تمام قبائل اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہونگے۔ بہر دست اس کی طاقت جاٹ سپہ سالار کی طاقت کے ایک چوتھائی کے برابر تھی۔ علاوہ بریں یہ تجربہ کار مغل سپہ سالار ایسی لڑائیوں میں حاذق تھا۔ وہ دریا کے شمالی کنارے پر پھیلا ہوا تھا اور تمام پایاب مقام روکے بیٹھا تھا۔

ایسی حالت میں جب تمام تین دشمن مضبوطی سے محفوظ کر چکا تھا دریا عبور کرنا تیمور کی جسارت سے بھی بالاتر نظر آتا تھا مگر اس نے دریا عبور کر ہی لیا۔

ایک مہینے تک وہ دریا کے ساتھ ساتھ شمالی رُخ چلتا رہا۔ جاٹ سپہ سالار بی کی جوک بھی سامنے کے کنارے اس کے بالکل بالمقابل اپنے لشکر کو شمال کی جانب حرکت دیتا رہا۔ اب آمو کا پاٹ تنگ ہو چکا تھا۔ یہاں پتھر کے ایک پل کے پاس پہنچ کر تیمور رُک گیا۔ جاٹ طاقتور تھے اور انھیں ہر طرح کے تدبیراتی فائدے حاصل تھے۔ اس لیے وہ پُل پار کرنا نہ چاہتے تھے۔ تیمور نے نہایت دلجمعی سے معسکر قائم کر لیا۔ اس رات اس نے پانچ سو جوانوں کو وہاں رہنے کے لیے نامزد کیا اور ان کی کمان دو قابل ترین افسروں کو سونپی۔ ایک معاوہ تھا جس کی وفاداری اور دلیری شک و شبہ سے بالا تھی اور دوسرا امیر موسیٰ تھا جو امیر حسین کے سپہ سالاروں میں قابل ترین تھا۔

ان پانچ سو کو معسکر کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود باقی لشکر کے ساتھ جاٹ لشکر کے بالکل قریب سے دریا عبور کیا۔ مگر دوسرے کنارے پر رُکا نہیں بلکہ سیدھا قریب ہی کی نیم دائرہ نما شکل کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ اس نیم دائرے کا دہانہ دریا کے رُخ تھا۔

دوسرے دن جاٹ سکاؤٹوں نے تیمور کے گزرنے کے نشانات دیکھ لیے۔ بی کی جوک پر ظاہر تھا کہ خاصا بڑا لشکر دریا کے پار ہو چکا ہے۔ دوسری طرف جب تیمور کے

معسکر کی طرف نگاہ کرتا تو وہاں بھی کوئی کمی نہ معلوم ہوتی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ اگر بی کی جوک پل پر حملہ کرے تو معاوہ اور امیر موسیٰ اس کا بچاؤ کریں گے اور عقب سے تیمور مغلوں پر حملہ کر دے گا۔

بی کی جوک نے یہ خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے وہ تمام دن خاموش بیٹھا رہا۔ اس رات تیمور نے اپنے آدمی ارد گرد کی پہاڑیوں میں پھیلا دیئے اور انھیں حکم دیا کہ مغل لشکر کی تین طرف جگہ جگہ آگ روشن کر دیں۔ لاتعداد الاؤ اور لشکر کے تینوں طرف سوچ بچار کر قدم اٹھانے والی مغل قوم کا بی کی جوک کے خیال سے ایسے خطرے میں گھر جانا غیر مناسب تھا۔ اس نے عجلت میں معسکر اٹھایا اور سحر سے پہلے کوچ کا حکم دے دیا۔ تیمور اسی انتظار میں تھا۔ اس نے اپنا پورا لشکر مجتمع کیا اور کوچ کی حالت میں مغلوں پر حملہ کر دیا۔ آج تک ایسی حالت میں کوئی لشکر اپنے مکمل دفاع میں کامیاب نہیں ہوا۔ مغل کیسے بچ سکتے تھے۔ جاٹ دستے بکھر گئے۔ لشکر منتشر ہو گیا اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تیمور نے تعاقب کیا۔

امیر حسین نے دریا کی لڑائی میں حصہ نہ لیا تھا مگر اب تیمور سے آملا اور مشورہ دینے پر مصر ہوا۔ کہنے لگا:

"شکست خوردہ فوجوں کا تعاقب کرنا غلط اقدام ہے۔"

"ابھی انھیں شکست نہیں ہوئی" تیمور نے کہا اور تعاقب جاری رکھا۔ جوں جوں قبائل پوشیدگی سے نکل کر اس کے سامنے آتے وہ انھیں خوش آمدید کہتا۔ مرد و زن خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ سوار اپنے گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے کبھی ادھر اور کبھی اُدھر لے جاتے اور امیر کو دیکھنے کے مشتاق نظر آتے۔ عورتیں گھروں اور خیموں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی کھلی آستینوں کو ہلا ہلا کر تبریک پیش کرتیں۔ ان دنوں تیمور کے لیے سونا محال تھا۔ اسے اس نئی فوج کے نئے کماندار مقرر کرنے تھے۔

پتھر کا پُل

پرانی قبائلی دشمنیوں کے فیصلے سنانے تھے اور سمجھوتا کرنا تھا۔ جاٹوں سے حاصل کیے ہوئے مالِ غنیمت کو ایسے بانٹنا تھا کہ کسی دل میں رنجش نہ رہے۔ مقتولین کے وارثوں کو مال بدل اور زخمیوں کو وظیفے دینے تھے۔ تمام وقت وہ گھوڑے پر سوار رہتا اور اپنی سوار فوج کے بڑھتے ہوئے لشکروں کو شمال کے رُخ بڑھتے رہنے کی ہدایات دیتا رہتا۔ جہاں کہیں مقابلہ سخت نظر آتا وہاں خود پہنچ جاتا۔

اس بے پناہ سیلاب کے سامنے جاٹ فوجیں نہ رُک سکیں اور انھوں نے آموریا اور سیر دریا کا درمیانی علاقہ خالی کر دیا۔ شہزادہ الیاس شمالی میدانوں میں اپنے لشکر مجتمع کر رہا تھا کہ وطن سے آتے ہوئے دو سوار اس کے سامنے پیش ہوئے اور خبر دی کہ "الیاس کا باپ تغلق زندوں کی دنیا چھوڑ کر بلندیوں کی جانب روحوں کی دنیا میں چلا گیا ہے۔" پھر وہ اس کے گھوڑے کی باگ تھام کر اسے خیمے کے اندر لے گئے۔

الیاس اپنے شہر المیلیک جانے پر مجبور ہو گیا۔ خطا کی سڑک اس کے سامنے تھی۔ ادھر بی کی جوک اور دو اور مغل سپہ سالار قید ہو چکے تھے۔ تیمور نے انھیں شخصی مبارزت میں زک دے کر قید کیا تھا۔ ایک مختصر سا مقابلہ۔ ایک لمحے کے لیے ہتھیار چمکے تھے اور گھوڑے ٹکرائے تھے؛ پھر ـــ ماوراالنہر کا نیا بادشاہ کامیاب بن چکا تھا۔

اس نے جشن منانے کا حکم دیا۔ اس کے مہمان آزمودہ سپاہی تھے۔ وہ ان کی توقع ان کے رتبے کے مطابق کرنا چاہتا تھا۔ جشن کے بعد اس نے ان سپہ سالاروں کی وفاداری کی تعریف کی جو انھوں نے خان سے کی تھی اور ان سے پوچھا کہ ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے۔

"یہ فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔" انھوں نے نہایت سکون سے کہا "اگر ہم

قتل کردیے گئے تو ہمارا بدلہ لینے والے بہت سے ہونگے۔ اگر ہم زندہ چھوڑ دیے گئے تو بہت سے تمھاری دوستی کا دم بھرینگے۔ جہاں تک ہمارا سوال ہے ہمارے لیے تو ایک ہی بات ہے۔ ہم نے جب کمر باندھی تھی تو موت ڈھونڈنے کے خیال سے آئے تھے۔"

امیر حسین نے مشورہ دیا کہ دشمن کو رہا کر دینا اچھا نہ ہوگا۔ مگر نوجوان فاتح جو انھیں اپنے ہاتھوں قید کر چکا تھا اور انھیں دعوت میں شریک کر چکا تھا، اپنی خوشی کو پورا کرنے کے لیے انھیں آزاد بھی کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے ان کے لیے گھوڑے منگوائے۔ تحفے دیے اور رہائی عطا کر دی۔

اس دوران میں اس نے شہر سبز بھی فتح کر لیا تھا۔ ایک سادہ اور آسان حیلے سے جو اس نے صحرائی قبائل سے سیکھا تھا۔ جونہی اسے شہر کی دیواریں نظر آئیں اُس نے اپنے آدمی چاروں طرف پھیلا دیے اور انھیں حکم دیا کہ اِدھر اُدھر گشت کرنا شروع کر دیں اور جس قدر ممکن ہو گرد و غبار بلند کریں۔ کئی ایک نے جوش میں آکر درختوں کی شاخیں بھی کاٹ لی تھیں اور انھیں زمین کے ساتھ ساتھ کھینچنے سے اس قدر گرد اڑتی تھی کہ ہر طرف بے پناہ لشکروں کی موجودگی کا گمان ہوتا تھا۔ جاٹ قلعہ بند فوج جو شہر میں تھی ڈر گئی اور شہر سبز خالی کر دیا۔ یوں شہر سبز نے محاصرے کی صعوبتوں سے بھی نجات پائی۔

تیمور کے ایک مؤرخ نے اسی لیے کہا ہے:

"امیر تیمور جنگ میں ہمیشہ خوش قسمت رہا۔ اس سال اس نے ایک بہت بڑے لشکر کو آگ سے شکست دی اور ایک شہر پر گرد و غبار سے قبضہ کیا۔"

یہ تھا بھی حرف بہ حرف صحیح۔

ان بے چین تاتاریوں کے لیے دقتوں سے بڑھ کر کامیابی کا زمانہ دقت طلب

ہوا کرتا تھا۔ امیر حسین کو تیمور کا بے ساختہ پن اور شکوہ پسند نہ تھا اور اس نے اپنے نقصانات کی تلافی کے طور پر بہت زیادہ رقم اور حقوق طلب کیے۔ تیمور کی طبیعت بھی نرالی تھی۔ وہ ایک دن کابل کے حاکم کو ایک مزار پر لے گیا اور وہاں اس سے سوگند لی کہ اس کا وفادار دوست رہے گا۔ حسین نے قسم تو کھالی مگر قسم کھانے پر مجبور کیے جانے کو بُرا مانا۔ ایک لحاظ سے دونوں خستگی اور تھکان کا شکار تھے اور اپنے ساتھیوں کے مسلسل جھگڑوں سے بھی تنگ آچکے تھے۔

راوی اس مقام پر لکھتا ہے:

"اب ان کے معسکر میں شہزادی الجائی کا ورود ہوا اور وہ آتے ہی مریض امیروں کی تیمارداری میں منہمک ہو گئی۔"

برسات میں لڑائی

الیاس خاں کا واپس چلا آنا بدیہی تھا۔ تیمور اس کے مقابلے کے لیے تقریباً آدھے راستے تک گیا، دریائے سیر کے شمال کی جانب والے میدانوں تک جہاں مغل اپنے گھوڑوں کو تازہ دم کرنے، انھیں چرانے اور ان کا ساز و سامان درست کرنے کے لیے رُکا کرتے تھے۔ الیاس کے ساتھ شمال کی پوری طاقت تھی، اس کی فوج تجربہ کار اور منضبط تھی اور اس کے افسر تربیت یافتہ تھے۔ گھوڑے پورے ایشیا میں بہترین تھے اور اس کے عَلَم دھوپ میں درخشاں نظر آتے تھے۔

وہ تعداد میں تاتاریوں سے کم تھے مگر تیمور ان کی جنگی قابلیت سے ناواقف نہ تھا۔ اس نے سکاؤٹوں کے ذریعے سے ان کی حرکات کی تفاصیل سے اپنے آپ کو باخبر رکھا حتیٰ کہ امیر حسین بھی کوہستانی قبائل کو لے کر اس سے آ ملا۔

تاریخ میں پہلی بار اتنے قبائل یکجا ہوئے تھے اور تاتاری اپنی پوری طاقت سے میدانِ جنگ میں اُتر آئے تھے۔ قبیلۂ برلاس اور صحرا کے شہسوار، جلایر سردار اور سلدوز خاندان کے تنومند سپاہی، حسین کے غوری قبائل اور کابل کے گٹھیلے جوان جنھیں دُور دراز علاقے میں بھی جنگ کی بھنک پہنچ چکی تھی، خود پوش جوان اور بہادر ایک ہی عَلَم کے نیچے جمع تھے۔

تقریباً سبھی گھڑ سوار تھے۔ سوا ملازموں، چرواہوں اور نیزہ بازوں کی چند پلٹنوں کے جن کے ذمے معسکر کی حفاظت تھی۔ معسکر کے گرد خندق کھودلی گئی تھی۔ ان

سواروں کا تصور آج کل کی ہلکی سوار رجمنٹوں سے نہیں کیا جا سکتا۔

وہ ایران کی بنی ہوئی مہین مگر مضبوط آہنی زرہ پہنتے تھے۔ سر پر آہنی خود اور اس پر کلغی۔ نیچے گلو گیر جس سے گلے کی حفاظت ہو سکتی تھی اور جو ناک کے نیچے یا گلے کے گرد باندھا جاتا تھا۔ دہرے شانہ گیر کاندھوں کی حفاظت کے لیے بعض گھوڑوں کی جھول چمڑے کی ہوتی بلکہ کڑیوں کی زرہ بھی استعمال ہوتی تھی اور گھوڑوں کا سر بھی بعض اوقات ہلکے فولادی خود سے ڈھکا ہوتا۔

کمان جو ہر ایک کے پاس ہوتی تھی اس کے علاوہ ان کے پاس تیغ ہوتی اور بعض کے پاس تلوار یا دو رخی ایرانی شمشیر۔ ان کے نیزے عام طور پر دس فٹ لمبائی کے ہوتے۔ آج کل کی بلم کی شکل و صورت۔ اس کی انی نہایت چھوٹی ہوتی۔ البتہ بعض دفعہ وہ چھوٹا نیزہ بھی رکھتے جس کی فولادی انی ذرا بھاری ہوتی جو آہنی زرہ کو چیرنے کے لیے استعمال کیا کرتے۔ ان کی کمانیں بھی سینگ یا لوہے سے مضبوط کر لی جاتی تھیں۔ اکثر کے پاس تیغ ضرور ہوتی۔

چھوٹے سے چھوٹا دستہ سکواڈرن کے لگ بھگ ہوتا تقریباً ایک سو سوار۔ اس کے بعد ہزارہ جو رجمنٹ کے برابر تھا اور جس کی کمان منگ۔ باشی یعنی کرنل کے سپرد ہوتی۔ امیر بکھرے ہوئے ہوتے تاکہ کمان میں آسانی ہو۔ عین لڑائی کے دوران میں قیادت کے تمام بوجھ انھیں پہ ہوتے۔ امیر تیمور اور امیر حسین کے ارد گرد چند امیر ہمیشہ موجود رہتے۔ تاواچی، پیغام رساں افسر، آج کل کی اصطلاح کے مطابق ایڈی کانگ۔

تیمور نے اپنی فوج میمنہ، قلب اور میسرہ میں ترتیب دے رکھی تھی ہر ایک کے دو حصے تھے۔ ایک اعظم الجیش اور دوسرا محفوظات۔ میمنہ امیر حسین کی کمان میں تھا۔ اس حصے کو تیمور نے قصداً زیادہ طاقتور رکھا تھا۔ خطرناک ترین پہلو یعنی میسرہ

جو کمزور بھی تھا اسے تیمور نے براہ راست اپنی کمان کے نیچے رکھا۔ اس کے ساتھ برلاس سردار بھی تھے۔ امیر جاکو اور اس کے ساتھی۔

تیمور از حد پُرامید تھا۔ اس فیصلہ کُن جنگ سے پہلے وہ نامعلوم طور پر خوش نظر آتا ہے۔ عام تاتاری سپاہی بھی اپنی کثرتِ تعداد اور شان و شوکت دیکھ کر فتح کے متعلق پُریقین تھے۔ یک لخت بارش شروع ہوگئی۔ موسم بہار کا طوفان شروع ہوگیا تھا جیسے فطرت نے بھی انسان اور گھوڑوں کو زمین کے سینے سے اڑا لے جانے کی ٹھان لی ہو اور اس مقصد سے ایک علٰحدہ جنگ کا اعلان کر دیا ہو۔ بادل کی گھن گرج اور بجلی کی چمک سے اس جنگ کا اعلان ہو رہا تھا۔ زمین پہلے ہی نرم تھی اب کیچڑ اور دلدل کی ایک جھیل سی بن گئی تھی جس میں گھوڑوں کی حرکت بھی مشکل سے ہو سکتی تھی اور وہ بارہا پیٹ تک اُس میں دھنس جاتے تھے۔ دریا بھی چڑھ چکا تھا اور نشیبی علاقوں اور ندی نالوں میں پانی بھر گیا تھا۔ سپاہیوں کا لباس بھیگ چکا تھا اور ہتھیاروں کی حفاظت مشکل ہوتی جا رہی تھی۔

راوی کا بیان ہے کہ یہ سب کچھ جاٹ مغلوں کا کرنا تھا جن کے جادوگروں نے یدہ[1] پتھر سے یہ حالت پیدا کی تھی۔ راوی مزید کہتا ہے کہ جاٹوں کو اس کا قبل ہی سے علم تھا اس لیے وہ اپنے ساتھ نمدے کے کمبل اور جھولیں لے آئے تھے جن سے وہ اپنے گھوڑوں کو برف و باراں سے بچا سکے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے نہریں اور نالیاں کھود کر پانی نکل جانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس لیے ان کا معسکر دلدل نہ بنا تھا۔ ظاہر ہے کہ حملہ آور ان صعوبتوں سے بچ نکلے اور تیمور کے لشکر کو یہ سب جھیلنا پڑیں۔ بہر کیف حملہ آور تازہ دم گھوڑوں پر سوار ہو کر تاتاری معسکر کی طرف روانہ ہوئے۔

تیمور بھی آگے بڑھا۔ حسبِ معمول سب سے پہلے فرداً فرداً شمشیر زن رزم آرا

---

[1] ایک پرانی روایت تھی کہ مغل جادو سے واقف تھے۔ راوی اپنے بیان کی تصدیق میں کہتا ہے کہ وہ مردن جب ایک جادوگر مارا ڈالا گیا تو بادل بند ہوگئی۔

ہوئے ۔ اس طرح چند جھڑپیں ہوئیں ، پھر تیمور نے اپنے بائیں بازو کی اگلی رجمنٹوں
کو حملے کا حکم دیا ۔ یہ حملہ روک لیا گیا اور تاتاریوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا ۔ جاٹ ان
کے عقب میں سیلاب کی طرح آگے بڑھ آئے اور تیمور کے سوارہ میں بھی خم سا پیدا ہو گیا ۔
اس اچانک اور بڑے حادثے سے دوچار ہوتے ہی تیمور نے طبل و نقارہ پر
ضرب لگانے کا حکم دیا اور اپنے برلاس سپاہیوں کو لے کر آگے بڑھا ۔ ولدل کے
اس سمندر میں نظم قائم نہ رہ سکا اور دستے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے ۔ گھبراہٹ ،
افراتفری اور بدنظمی پھیلنے لگی ۔
اس باد و باراں میں کمانیں بیکار تھیں ۔ گھوڑے بری طرح پھسل رہے تھے ۔
اور زرد پانی کی ندیاں خون سے سرخی مائل ہوتی جا رہی تھیں ۔ اب فولاد ہی کا استعمال
ممکن تھا ۔ تیغ و شمشیر ٹکرا رہی تھیں ۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ ، زخمیوں کا غل اور تاتاری
شہسواروں کا نعرہ " داروگر " ایک قیامت کا سماں تھا ۔
تیمور جاٹ فوج کے میمنہ کے کماندار کے عَلَم کی طرف بڑھا جا رہا تھا قریب
پہنچ کر تیمور نے تبر کا وار کیا جو مدِ مخالف نے اپنی ڈھال پر لے لیا ۔ اب مغل شہسوار
نے اپنی رکابوں پر زور دے کر اپنے آپ کو بلند کیا اور تیمور پر تلوار سے وار کیا ہی
چاہتا تھا کہ جاکو جو اپنے امیر کے ساتھ سایے کی طرح لگا رہا تھا آگے بڑھا اور
مغل کماندار کے سینے سے نیزے کی انی پار کر دی ۔ عَلَم گر چکا تھا ۔
تیمور نے ایک بار پھر پیغام ارسال کیا کہ طبل اور نقارے پر چوٹ پڑے ۔ یہ
آواز کتنی ڈراؤنی ہوتی ہے ۔ مغل یوں بھی عَلَم گر جانے سے بددل ہو جایا کرتے تھے ۔
انھوں نے پس نشینی اختیار کی ۔ اس ولدل میں منظم پس نشینی امکان سے باہر تھی اور
مغل فوج میں بدنظمی سی پیدا ہو گئی مگر تھوڑی دیر کے بعد تازہ دم گھوڑوں پر سوار
ہو کر وہ دشمن سے دور نکل گئے ۔

تیمور نے گھوڑے کو ایک پہاڑی کی طرف بڑھایا تاکہ محاذ کے دوسرے حصوں کا جائزہ لے سکے۔ دوسری طرف حالات اچھے نہ تھے۔ امیر حسین کو پیچھے دھکیل دیا گیا تھا اور اس کا سوار محفوظہ بڑی مشکل سے مغلوں کو روکے ہوئے تھا۔ اس دوران میں دونوں فوجوں کے قلب بھی آمنے سامنے آ چکے تھے۔

تیمور نے اپنے آدمیوں کو مجتمع ہونے کا اشارہ کیا مگر تعاقب کرتے ہوئے لشکر کے اکٹھا ہونے کے لیے وقت چاہیے اور تیمور اتنا انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے جتنے دستے بھی مل سکے اس نے یکجا کیے اور انھیں لے کر حسین کے مخالف مغل لشکر کے داہنے پہلو پر حملہ کر دیا۔ وہ اتنا آگے بڑھ آیا تھا کہ اس کا حملہ ایک حد تک مغلوں کے عقب سے تھا۔ اس اچانک حملے کی وہ تاب نہ لا سکے اور پیچھے ہٹ گئے۔ الیاس خان نے اب تک محفوظات کو روکے رکھا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واپسی کا ارادہ کر رہا ہے۔

اس سے بہتر موقع میسر نہ آ سکتا تھا۔ تیمور نے حسین کو پیغام بھیجا کہ اپنے لشکر کو دوبارہ ترتیب دے اور جلد آگے بڑھے۔

حسین اس پیغام سے خفا ہو گیا۔

"میں بزدل تھوڑا ہی ہوں جو تیمور میرے آدمیوں کے سامنے مجھے آگے بڑھنے کا پیغام بھیجتا ہے"

اور جواب دینے کے بجائے پیغام رساں کے منہ پر تھپڑ مارا۔

وقت ضائع ہو رہا تھا۔ تیمور غصہ پی گیا اور دو افسروں کو روانہ کیا جو حسین کے رشتہ دار بھی تھے تاکہ اسے سمجھائیں کہ الیاس واپسی پر تلا ہوا تھا اور ضروری تھا کہ وہ آگے بڑھیں۔

"میں بھاگ تھوڑا ہی گیا ہوں" حسین نے پھر خفگی سے کہا "وہ کیوں

گھڑی گھڑی مجھے آگے بڑھنے کو کہتا ہے۔ میں اپنے آدمی تو اکٹھے کر لوں۔"

پیغام رساں نے جواب دیا:

"خداوند، میرے امیر، دیکھو تو سہی، امیر تیمور اس وقت دشمن سے لڑ رہا ہے۔"

حسین پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ممکن ہے کہ حسد کی وجہ سے ہو یا شاید حسین کے لیے آگے بڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔ بالآخر تیمور کو واپس آنا پڑا۔ رات ہونے کو تھی۔ اس رات اس نے کھیتوں میں اپنا معسکر قائم کیا۔ اس پر پژمردگی چھا چکی تھی۔ نہ تو وہ حسین کی طرف خود گیا اور نہ اس کے ایلچیوں کا جواب ہی دیا۔ اس رات اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ حسین کے ساتھ متحدہ کمان میں وہ کبھی جنگ نہ کرے گا۔

دوسرے دن پھر بارش ہوئی مگر تیمور غصے میں اکیلا ہی آگے بڑھا اور الیاس کا مقابلہ کیا۔ اس پر مختلف سمتوں سے مغل لشکر حملہ آور ہوئے اور اسے پس نشینی پر مجبور ہونا پڑا۔ طوفان اور بادو باراں، نیچے دلدل اور کیچڑ، واپسی کا سفر خوشگوار نہ تھا۔ اس کی فوج کے مقتولوں سے میدان اٹا پڑا تھا اور ان ساتھیوں کی یاد نے اسے اور بھی غمگین بنا دیا۔ وہ خاموش تھا اور اس کے برلاس اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ اسے شکست فاش ہو چکی تھی۔ حسین کی اس بے وفائی کو وہ عمر بھر نہ بھولا۔

حسین نے کئی ایلچی روانہ کیے۔ ہر بار نئی تجویز بھیجتا اور ہندوستان جانے کا مشورہ دیتا۔

"تم ہندوستان جاؤ یا جہنم میں جاؤ، مجھے اس سے سروکار نہیں۔"

اس نے سمرقند پر پس نشینی کی۔ وہاں محاصرے کے انتظامات مکمل کیے اور خود اپنی وادی کا رخ کیا تاکہ وہاں سے نئی فوج تیار کر کے لائے۔ خیال تھا کہ

تیمور

اتنا عرصہ جاٹ سمرقند کے محاصرے میں مصروف ہو گئے۔
وہ پہنچا تو الجائی دائمی نیند سو چکی تھی۔ اس کا جسد خاکی اپنے محل کے باغ میں رکھا جا چکا تھا۔ تنہائی پسند تیمور اب حقیقی معنی میں تنہا تھا۔

الجائی کی وفات نے امیر تیمور اور امیر حسین کا وہ رشتہ قطع کر دیا تھا جس سے وہ اب تک منسلک رہے تھے۔ اس کی زندگی میں ایک دو بار حسین نے اپنی بہن سے اچھا سلوک روا نہ رکھا تھا اور تیمور کے دل میں یہ رنجش بھی تھی۔ تیمور پہلے بھی نقصانات کی وجہ سے غمگین ہو جایا کرتا تھا اور اب بیوی کی موت نے تو اُسے اور بھی افسردہ خاطر کر دیا تھا۔ اس نے جہانگیر کو ساتھ لیا اور اپنی قوم کے آدمیوں کے ساتھ دریا کے جنوب کی طرف اسی مقام پہ گیا جہاں اس نے الجائی کے ساتھ گزشتہ گرمیوں میں آرام کیا تھا۔

زین الدین نے اسے لکھ بھیجا تھا:

"ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ہر شخص کی موت کا دن اور وقت معین ہے۔"

تیمور اس حد تک تقدیر کا قائل نہ تھا۔ جو جذب و شوق علمائے دین کے دل میں موجزن رہتا تھا وہ اس سے ناواقف تھا۔ ویسے تو جس خاموشی سے وہ مصائب برداشت کرتا تھا یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مسلمان کے سے صبر و شکر کا قائل تھا اور قانون الٰہی کی پابندی اسے کامیابی کی طرف لے جائے گی۔

مگر تیمور کے دل میں نسلی اور عصبانی روایات کا اثر بھی تو کار فرما تھا اور کئی ایسے سوال اس کے ذہن میں پیدا ہوتے جن کا تسلی بخش جواب اسے نظر نہ آتا تھا۔

وہ نماز کا پابند تھا اور نہایت متوجہ ہو کر تلاوت سننے میں اس نے کبھی کوتاہی نہ برتی تھی۔ وہ گھنٹوں رات کے وقت شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ جاتا اور پیادہ و فرزین کی حرکات میں کھو جاتا۔ اکثر ایسے بھی ہوا کہ شطرنج کا یہ کھیل اکیلے ہی کھیلتا رہا۔ جب کبھی وہ کسی کے ساتھ کھیلتا ضرور جیتتا۔ تیمور مشاق اور غیر معمولی فنا طر تھا۔

اس کھیل میں اپنی مہارت کو مکمل کرنے کے لیے تیمور نے ایک نئی بساط اختراع کی تھی جس میں عام شطرنج سے دُگنے خانے تھے اور ہر نوع کے مہروں کی تعداد دُگنی تھی۔ وہ اس بساط پر نئی نئی ترکیبیں بناتا۔ ننھا پانچ سال کی عمر کا جہانگیر شوخ سیاہ آنکھوں سے باپ کے ان کھلونوں کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں نہایت توجہ سے یہ کھیل دیکھتا رہتا۔

تیمور اس کھیل میں محو تھا کہ سمرقند کے علماء کا وفد پیغام لے کر آیا:

"خدا نے اپنے بندوں کی گلو خلاصی کر دی ہے۔ بخارا کا بزرگ عالم مفتیِ دین سمرقند آیا اور اس نے مسلمانوں کو دفاع پر اُکسایا تاکہ دونوں امیروں کے لوٹ آنے تک دشمن کو روکے رکھا جا سکے۔ باوجودیکہ ملعون دشمن شہر کے مضافات تک پہنچ گیا تھا پھر بھی اہلِ سمرقند نے اسے دھکیل باہر کیا۔

"پھر دفعتاً اللہ کے حکم سے جاٹوں کے گھوڑوں میں وبا پھیل گئی۔ تین چوتھائی گھوڑے مر گئے اور ان کے پاس پیغام رسانوں کے لیے بھی سواری ملنا مشکل ہو گئی۔ وہ ملک خالی کر گئے اور واپس جاتے ہوئے ان کی حالت دیدنی تھی۔ سامان اور کمانیں پیٹھ پر باندھے تلواریں کاندھوں پر رکھے وہ پا پیادہ جا رہے تھے۔ آج تک دنیا نے جاٹوں کی فوج کو پیادہ چلتے نہ دیکھا تھا۔"

علماء کے بعد تیمور کے افسر آئے جو ان حالات کو بچشم خود دیکھتے رہے تھے۔

انھوں نے بھی کہا کہ سمرقند کے شہریوں نے دشمن کو روکے رکھا تھا۔ گھوڑوں کی وبا واقعی شدید تھی۔ تعاقب کرتے ہوئے تاتاری دستوں کو کئی بار میلوں کا چکر لگانا پڑتا تاکہ مُردہ گھوڑوں کے قریب سے گزرنا نہ پڑے۔

اس خوش بختی کی خبر حسین کو بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ شان وشوکت سے شہر میں داخل ہُوا۔ شہر کے لوگ بھی اپنے کارناموں پر خوش تھے۔ در و دیوار کے ساتھ قالین ٹنگے ہوئے تھے۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں مسجدوں میں سجدۂ شکر بجا لا رہے تھے اور امیر حسین جس باغ میں بھی جاتا اسے دلنواز موسیقی کے نغمے خوش آمدید کہتے ہوئے سنائی دیتے۔

حقیقت میں تو حسین اور تیمور کا حق برابر کا تھا۔ اب یہ دونوں ہندوستان کی سرحد سے لے کر بحیرۂ ارال تک کے مالک تھے۔ تیمور حقیقی قائد رہا تھا اور فوج اسی کی کمان کے نیچے لڑی تھی۔ اس کے ساتھی بھی تعداد میں زیادہ تھے مگر حسین بادشاہ گر کا نواسا تھا اور بیٹا بھی ایک حکمران بادشاہ کا تھا۔ اس نے ایک نام نہاد خان کو بھی نامزد کیا۔ جس کے چُنے جانے کی امتیازی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ طرہ، یعنی چنگیز کی اولاد سے تھا۔ دستور کے مطابق شاہانہ رسوم کے بعد خان کو تخت پر بٹھایا گیا اور حسین نے اپنے نانا کی طرح پس پردہ حکومت کرنے کے فرائض سنبھالے۔

حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ تیمور کو حسین سے کم مرتبہ قبول کرنا پڑا۔ اس کے ذمے زمین کی تقسیم، مالیہ اور دوسرے واجبات کا اکٹھا کرنا اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ ایک بات پر تیمور اڑ گیا تھا۔ وہ اپنی وادی کسی دوسرے کو دینے پر رضامند نہ تھا۔ شہر سبز سے دریا تک۔ اس نے نہایت زوردار لہجے میں کہا:

"دریا تک علاقہ میرا ہے۔"

اس کا رویہ نہایت پُروقار تھا اور اس کی فیاضی کی وجہ سے اس سے کسی کو الجھنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ جب حسین نے بھاری رقم بر لاس قبیلے پر ٹیکس کے طور پر لگانی چاہی

تو اس نے گزشتہ جنگ میں ان کے جانی و مالی نقصانات کی طرف توجہ دلائی مگر حسین کو اس نے ساری رقم اپنی گرہ سے پوری کر دی۔ غصے میں آکر الجائی کے زیورات؛ اس کی بالیاں اور اس کا گلو بند جو عروسی کی شب اس نے پہنا تھا وہ بھی حسین کے حوالے کر دیے حسین نے یہ زیور پہچان لینے کے باوجود رکھ لیے۔

آخری اختلاف دونوں امیروں کے افسروں کی وجہ سے پیدا ہوا۔ خان مقرر کرنے سے حسین نے جاٹوں کی مخالفت کو بھی شہ دی تھی۔ اور بعض امیروں کو زیر کرنے میں اس نے نئی دشمنیاں پیدا کر لی تھیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ غلطی کس کی تھی مگر دونوں امیروں کا مل بیٹھنا بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور جب دونوں کے درمیان تعلقات نہ رہے تو نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں برآمد ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ جاٹ بھی وقتاً فوقتاً ملک میں در آتے۔ نتیجہ ظاہر ہے تاتاری سرزمین نے جنگی معسکر کی صورت اختیار کر لی اور چھ سال تک یہ حالت رہی۔ کشاکش کے اس پُر ظلمت عرصے کے دوران میں تیمور کی روح شاید جنگ کی روح سے تعاون کر چکی تھی۔ اس کی دلیری، استقلال و پامردی، خوف و خطر سے بے پروائی اور بے مثل فراخدلی زبان زد عام ہو گئی۔ راتوں کو جب کاروان الاؤ جلا کر بیٹھتے تو اس خوارق العادة امیر کی کہانیاں سنتے اور سناتے۔ وہ اکثر کہتے:

"امیر تیمور، بلا شک و شبہ نیک نام ہے۔ وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ وہ فولاد جسے کوئی نہیں جھکا سکتا۔"

کرشی کے لینے کا قصہ از حد مرغوب تھا۔ بازاروں، معسکر اور کاروان سراؤں میں اسے بار بار دُہرایا جاتا،

یہ شہر نقاب پوش پیغمبر کا مسکن تھا جو اب مدت سے خراسان میں مدفون ہو چکا تھا۔ لوگوں کو اس شخص نے اپنے کرشموں سے مسحور کر لیا تھا خصوصاً جب وہ انھیں کنوئیں کی تہ سے اُبھرتا ہوا چاند ہر رات دکھاتا۔ اس کا یہ کرشمہ ان راتوں میں ہوا کرتا

جب آسمان پر چاند نہ ہوتا۔ اس شعبدے کی وجہ سے اس کا نام ماہتاب گر پڑ گیا تھا حالانکہ تاریخ دان اسے فتنہ گر کی حیثیت سے جانتا ہے۔

کرشی میں تیمور نے ایک پختہ قلعہ تعمیر کیا تھا جس پر اسے ناز بھی تھا۔ جن دنوں کا یہ ذکر ہے اُن دنوں حسین کی فوج کرشی پر قابض تھی اور حصار بھی انھیں کے پاس تھا۔ تیمور کے سپاہی اس جگہ کی مضبوطی سے پوری طرح واقف تھے۔ حسین کی جانب سے امیر موسیٰ شہر کا کمانڈار تھا۔ وہی موسیٰ جس نے پُل کی لڑائی کے وقت بلی کی جوک کے خلاف پُل کی حفاظت کی تھی۔ موسیٰ تجربہ کار کمانڈار تھا۔ یہ درست کہ وہ خور د نوش اور شراب ناب کا دلدادہ تھا اور اکثر بے پروائی بھی برتتا تھا مگر مشکل موقعوں پر وہ قابل اعتماد بھی تھا۔

تیمور کے ساتھ اس وقت صرف دو سو چالیس آدمی تھے۔ افسروں میں سے امیر جاکو اور معاوہ بھی موجود تھے۔ یہ دونوں پُل کی لڑائی میں شریک تھے۔ ان کے علاوہ خطر پسند امیر داؤد بھی شامل تھا۔ جب تیمور نے کرشی فتح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ حیران سے ہو گئے۔ ان کے خیال میں اس مہم کے لیے موسم نہایت گرم تھا اور انھیں اپنے اہل و عیال کی حفاظت بھی تو کرنی تھی۔ امیر تیمور نے اُن سے کہا:

"کم فہم لوگو! میں نے کتنی بار تم سے کہا ہے کہ تمھارے اہل و عیال کی حفاظت ضرور ہوگی۔"

ان کا جواب تھا:

"درست مگر سوچیے تو سہی وہ شہر پناہوں کے اندر نہیں۔"

تیمور ہنس پڑا اور کہا:

"سوچو تو، اگر ہم کرشی لینے میں کامیاب ہو جائیں تو کرشی کے گرد فصیل ہے۔"

یہ تو ان کی سمجھ میں آ گیا مگر کام کی نوعیت کی وجہ سے داؤد بھی خاموش تھا اور جاکو نے سر ہلا کر کہا:

"امیرا بات یہ ہے کہ پہلے ہمیں کچھ طاقت حاصل کر لینی چاہیئے۔ ہر بات کا موقع اور وقت ہوتا ہے۔ جلد بازی دلیری کا اور سوچ بچار سے کام لینے کا بھی۔ موسیٰ طفلِ مکتب نہیں۔ اس نے نقارہ وطبل اور عَلَمِ جنگ کے ساتھ عمر گزاردی ہے۔ وہ کجاوے میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرح قابو میں آنے والا نہیں۔"

"اچھا تو پھر تم عورتوں کے پاس جاؤ اور ان سے سبق سیکھ کر آؤ۔" تیمور نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔" اور میں اپنے ساتھ انھیں رکھوں گا جو پل کی لڑائی میں موجود تھے۔"

پھر دوسروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"تم معاوہ اور تم ایلچی، کوئی اور بھی ہے؟"

کئی آوازیں بلند ہوئیں جنھوں نے تیمور کے ساتھ دریا عبور کرنے کی تائید کی تھی اور جنھوں نے جاٹوں کو زمینیں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔

"اچھا تو پھر جاؤ جہاں تمھارے اہل وعیال تمھارا انتظار کر رہے ہیں، نہیں، جاؤ اور اپنے کہن کارناموں پر بازاروں میں لاف زنی کرو، میں تو اپنے گھوڑے کی باگ کرشی کی جانب موڑوں گا۔"

وہ جانتے تھے کہ تیمور ضرور جائے گا چاہے وہ رک بھی جائیں۔ وہ آپس میں مشورہ کرنے کے لیے علیحدہ ہو گئے۔ تیمور کو اپنے ارادے سے موڑنا غیر ممکن تھا اس کا حکم اٹل ہوتا تھا۔ مقصد کے حصول کے لیے اس طرح کے رویے سے بعض اوقات بے وجہ جانیں بھی ضائع ہوتی تھیں مگر تیمور کا حکم تقدیر کی طرح اٹل ضرور سمجھا جاتا تھا۔

جب اس کے سردار اس کے پاس واپس آئے تو جاکو کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے میں تلوار۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا:

"میرے امیر! ہم نے اس قرآن پر قسم اُٹھائی ہے کہ ہم آپ کے ساتھ رہیں گے اور یہ ہے تلوار۔ اگر ہم آپ کی نافرمانی کریں تو اس سے ہمارے سر قلم کر دیجیے۔

اب وہ اس کھیل میں تیمور کے ہم نوا تھے اور اس کے ساتھ بیٹھ کر پورے جوش و خروش سے موسیٰ کو قلعے سے باہر لانے کی تجویزیں سوچنے لگے۔

"کم عقل کہیں کے" تیمور نے ہنستے ہوئے کہا "اگر تم موسیٰ کو تین ہزار جوانوں کے ساتھ قلعے سے باہر نکلنے پر مجبور بھی کر لوگے تو تمہارے پاس کل دو سو چالیس جانباز ہیں پھر کیا کر لوگے ؟"

داؤد نے باقی ساتھیوں کو خاموش دیکھ کر اپنی رائے پیش کی:

"بہتر ہوگا کہ ہم رات کو حملہ کریں اور موسیٰ کو سوتے میں پکڑ لیں۔ یوں تو ہو سکتا ہے۔"

"ہوں، بہتر ہوگا" تیمور نے سنجیدگی سے کہا "اور اس کے بعد تم تین ہزار بستروں کی طرف جا کر اس کے تین ہزار سپاہیوں کو بھی پکڑوگے ؟"

"خدا قادرِ مطلق ہے" داؤد نے اپنی براءت میں کہا "موسیٰ کو ہماری موجودگی کا علم ہے۔ جب تک ہم یہاں ہیں وہ باہر نہ نکلے گا۔ اس کے بادشاہ نے اسے کرشی کی حفاظت پر مامور کیا ہے اور وہ اس حکم پر کاربند رہے گا۔"

تیمور جیسے اپنے آپ سے بلند آواز میں کہہ رہا ہو "اگر میں موسیٰ کو پیغام بھیجوں کہ وہ دریا کے کنارے ہری بھری گھاس پر جا کر شراب سے پیاس بجھائے اور موسم کی گرمی سے درختوں کے سایے میں نجات حاصل کرے تو کیا وہ مان جائے گا ؟"

داؤد مسکرا اٹھا۔ موسم گرما عین شباب پر تھا۔ وہ مقام کے تعین کے لیے آزاد تھے اور میدانوں میں بھی اپنی اپنی عبا اتار کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے بدن پسینے سے شرابور تھے۔ حصار تو موسم سرما کے لیے بنایا گیا تھا اور گرمیوں کے لیے نہایت غیر موزوں تھا۔ عیش و عشرت، دعوت و جشن اور جام و مینا کا موسیٰ کو شوق تھا۔

"معاذ اللہ" داؤد نے سوچ کر کہا "موسیٰ جانا چاہے گا مگر جائیگا نہیں۔"

"تو پھر میں اسے مدعو نہ کرونگا" تیمور نے جواب دیا۔

اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ نہ کہا۔ کچھ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس نے کرشی کی مہم کا خیال ترک کر دیا ہے۔ اس نے ملک الہرات کی طرف تحائف ارسال کیے اور خود بھی خراسان کی سڑک پر جو ہرات کو جاتی تھی ، چاہِ اسحاق کے قریب اپنے خیمے نصب کیے۔

اس کے قاصد کی واپسی کوئی مہینا بھر کے بعد ہوئی۔ اس وقت تک جتنے بھی قافلے شمال کو جا رہے تھے انھیں روکتا رہا۔ اس کے قاصد کے ہمراہ ہرات کے ملک نے اس کے لیے تحائف ارسال کیے اور کہلا بھیجا کہ اسے آ کر مل جائے۔ اس وقت چاہِ اسحاق کے پاس کئی قافلے رکے ہوئے تھے۔ جب قاصد یہ پیغام لایا تو یہ خبر ہر طرف پھیل گئی۔

دوسرے دن تیمور نے تمام کاروانوں کو سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی اور خود بھی روانگی کے انتظامات شروع کر دیے۔ جب تاجروں نے راستے میں حفاظت کی درخواست کی تو انھیں جواب دیا کہ کرشی کے راستے پر اس کا کوئی سپاہی نہ تھا۔ پھر نہایت عجلت میں اپنے دو سو چالیس جانبازوں کے ساتھ جنوب کا سفر اختیار کیا۔ کاروان شمال کو روانہ ہوئے۔ انھیں آمو عبور کر کے کرشی جانا تھا۔
جب کاروان کرشی پہنچے تو موسیٰ نے راستے کے حالات دریافت کیے انھوں نے بتایا کہ تیمور ہرات کا قصد کر کے جنوب کو چلا گیا تھا اور یوں نظر آتا تھا جیسے ہرات کے ملک کے پاس پناہ لینا چاہتا ہو۔ موسیٰ فوراً ایک خوشگوار مقام کو روانہ ہوا۔ اُسی مقام کو جس کا ذکر تیمور نے کیا تھا اور راوی کے بیان کے مطابق وہاں "عیش کا فرش بچھا کر مئے مست کُن کے جام کی گردش جاری کی" احتیاطاً وہ اپنے لڑکے کے ساتھ چند سو جوان کرشی میں چھوڑ گیا۔
تیمور ایک منزل پر جا کر رک گیا۔ وہاں کوئی ہفتہ بھر ٹھہرا رہا تاکہ کاروان کرشی

پہنچ جائیں۔ پھر وہ واپس ہوا اور آمو کا رُخ کیا۔ ایک ہی منزل میں وہ دریائے آمو کے کنارے تھا۔ گھوڑے کو پانی میں ڈال کر تیرتے ہوئے پار پہنچا۔ صرف چالیس سوار اس کا ساتھ دے سکے۔ باقی ماندہ کے لیے کشتیاں روانہ کی گئیں۔

جب یہ پہنچے تو تیر کر پار جانے والوں نے خوب مذاق اڑایا۔ اس رات وہ دریا کے کنارے ہی ٹھہرے رہے مگر سڑک سے دُور رہے۔ سحر کے وقت بیس پچیس سوار کرشی کے راستے پر گئے اور وہاں کرشی جانے والے مسافروں کو روکنا شروع کیا۔ شام کے وقت وہ پھر سوار ہوئے اور کرشی کے مضافات میں پہنچ کر درختوں میں چھپ رہے۔ موسیٰ کے آدمیوں میں سے جو بھی کنوئیں پر آتا اسے قید کر لیتے۔ اپنے آدمیوں اور موسیٰ کے قیدیوں کو سارا دن کمندیں بنانے پر لگائے رکھا۔ جب سورج غروب ہوا تو چند آدمیوں کو قیدیوں کی حفاظت پر مامور کیا اور خود روانہ ہو گیا۔

جاکو نے کہا:

"ہم اس قدر جلدی میں سفر کرتے رہے ہیں کہ سب آدمی ہمارے ساتھ نہیں پہنچ سکے۔ مہم کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ ہم سنبھل سنبھل کر آگے بڑھیں اور بے وجہ خطرے میں نہ پڑیں۔"

تیمور رضا مند ہو گیا اور کہا:

"تم سب آدمیوں کو لے کر آجاؤ۔ میں گھوڑا بڑھا کر آگے جاتا ہوں اور فصیل پر کمندیں پھینکنے کی جگہ ڈھونڈتا ہوں۔"

اور وہ دو جوان لے کر آگے بڑھ گیا۔ جب انھیں برج کی روشنی نظر آئی تو وہ درختوں کے سایے میں گھوڑے سے اُتر پڑے۔ ایک آدمی کو گھوڑوں کے پاس چھوڑا اور دوسرا عبداللہ تھا جو اس کا ساتھ چھوڑنے پر رضامند نہ تھا۔ اسے ساتھ لیا اور خندق تک پہنچے۔ وہاں کا ملا خاموشی تھی۔

وہ خندق کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے اور اس جگہ پہنچے جہاں قلعے کی نہر خندق کے اوپر سے گزرتی تھی۔ اس میں پانی صرف گھٹنوں تک تھا۔ تیمور لپک کر اس کے اندر ہو لیا اور نہایت احتیاط سے خندق کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھا۔ عبداللہ بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ جب دوسرے کنارے پر پہنچے تو کود کر قلعے اور خندق کی درمیانی زمین پر اُتر آئے۔

اب وہ عبداللہ کو لے کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب ایک دروازے پہ پہنچے تو تھوڑی دیر رُک کر تیمور نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نہ معلوم اسے یہ کیوں سوجھا۔ بہرحال اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ دروازے کے اندر دیوار چُن دی گئی تھی۔

اُس نے جستجو جاری رکھی۔ آخر اسے ایک ایسا مقام مل گیا جہاں فصیل کا بالائی حصہ ٹوٹا ہوا تھا اور داخل ہونا آسان تھا۔ اس نے عبداللہ کو بھی یہ جگہ اچھی طرح دکھائی اور جب یقین کر لیا کہ وہ بھی اندھیرے میں اسے دوبارہ ڈھونڈ لے گا تو وہاں سے لوٹ کر گھوڑوں کے پاس آیا۔ اب باقی سب آدمی بھی پہنچ چکے تھے۔ پینتالیس آدمیوں کو گھوڑوں کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور باقی ایک سو پچپن بچے تھے انھیں لے کر دوبارہ قلعے کا رُخ کیا۔

تیمور دوبارہ ان سے آگے نکل گیا تاکہ فصیل کے بوسیدہ حصے کو ان کے آنے سے پہلے ڈھونڈ رکھے اور عبداللہ کو ان کے پاس چھوڑا کہ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کو نہر سے پار اتروائے۔ جب یہ سب پہنچے تو تیمور دیوار پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُن کے آتے ہی اس نے احکام دینا شروع کر دیے۔

ایک حصہ تو سنتری کو پکڑنے اور قید کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ سحر کے قریب موسیٰ کے سبھی سنتری سو رہے تھے۔ حصار پہ تھوڑی سی لڑائی ہوئی۔ تیمور نے سب آدمی یہاں اکٹھے کیے اور طلوع آفتاب کے قریب اپنے بگل بجوائے۔

کرشی کی آبادی چھتوں پر چڑھ آئی - وہ بگل سے اس غیر معمولی بیداری کا مطلب نہ سمجھ سکے تھے - موسیٰ کے افسروں کو تیمور کی جمعیت کا کوئی علم نہ تھا اس لیے ان میں سے اکثر اطاعت پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے - جب تیمور ان سے گفتگو کر چکا تو وہ اس کے ساتھ ملنے پر رضا مند ہو گئے - صرف موسیٰ کے لڑکے نے اپنے مکان پر مقابلہ کیا - آخر جب روزنوں سے مکان کے اندر آگ پھینکی گئی تو وہ تلوار گلے میں لٹکا کر باہر نکل آیا -

تیمور نے اس کی دلیری کی داد دی - موسیٰ کے باقی خاندان کو اس نے شہر کے باہر موسیٰ کے پاس جانے کی اجازت دے دی - البتہ اس کے لڑکے کو کرشی ہی میں رکھا -

"امیر بے نظیر کے بخت درخشاں کے طفیل ہم نے شہر حاصل کر لیا" جہانگو نے بعد میں کہا "اور اس کی وجہ سے ہمارے کارناموں کو بھی شہرت نصیب ہوئی"

اس کے بعد شہر کا محفوظ رکھنا بھی آسان کام نہ تھا - حسین کے پاس ہزاروں سپاہی تھے - جب تیمور کرشی کے دفاع میں کامیاب رہا تو ان تاتاری جوانوں کی نگاہ میں یہ معجزے سے کم نہ تھا - وہ فتح کو خداداد سمجھتے تھے - شکست بھی اسی کی طرف سے تھی - زین الدین اور دوسرے علماء انھیں مسلسل اس کی یاد دہانی کرتے رہتے تھے -

مگر ملک تاتار کے یہ شہسوار کچھ عجیب طبیعت کے مالک تھے - کبھی تو گھنٹوں چیتھڑوں سے لپٹے ہوئے درویش کے قدموں میں بیٹھے رہتے اور اس کی ہر بات پر ایمان لانے کو تیار رہتے اور کبھی ان درویشوں کو نہایت حقارت سے دیکھتے - یہ بھی ان کا قول تھا:

"دو واعظ ہوں تو ایک مرد کے برابر ہوتے ہیں - اگر ایک ہی ہو تو اسے صرف عورت سمجھو -"

وہ بھوت پریت کے بھی قائل تھے اور عجیب و غریب چیزیں دیکھتے۔ خواب اور فال کو بھی وہ بہت اہمیت دیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ بھیانک خواب دیکھ کر سینکڑوں میل دور بھاگ جاتے۔ دوسری طرف یقینی موت کے سامنے وہ نڈر اور بے خوف رہتے۔ عین جنگ میں وہ خود اتار کر دور پھینک دیتے اور نعرہ لگاتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑتے کہ دیکھنے والے انھیں حیرت و استعجاب سے دیکھیں۔ وہ غیرت مند تھے اور عزت و وقار کے لیے جان دے دیتے۔ وہ موت سے زیادہ شرم سے ڈرتے تھے۔ وہ عربوں کا قول اکثر دہراتے۔

"عزت کے بغیر دولت کی کوئی وقعت نہیں۔"

سقفِ جہاں

طوائف الملوکی کے اس دَور میں لوگ بار بار تیمور کی شخصیت کی طرف رجوع کرتے۔ اس کی شخصی دلیری پر وہ تحسین و آفرین کرنے پر مجبور تھے۔ اس کی ہمت اور اس کی کامیابیوں کے افسانے زبان زد عام تھے۔ جو اس کے مخالف لڑتے تھے وہ بھی اس غیر معمولی جرأت و شجاعت کے پیکر امیر تیمور کی کہانیاں سننے کے خواہاں رہتے۔ نت نئے اور بدلتے ہوئے مناظر کی اس افسانوی سی دنیا میں تیمور ہی ایک ٹھوس حقیقت بن کر بار بار لوگوں کی نگاہوں کے سامنے آتا۔

بہت سے لوگ حسین سے تھک کر تیمور کے علم کے نیچے جمع ہو گئے۔ منگالی بوگا جو مغل خاندان کا معمر سردار تھا ایک دن سوار ہو کر آیا اور اپنا تعارف کرائے بغیر آکر تیمور کے سرداروں کے درمیان بیٹھ گیا۔ منگالی ایک زمانے میں تیمور کا سخت ترین دشمن تھا۔ اس نے ایک بار تیمور کو زندہ پکڑ لانے کی پیش کش کی تھی اگر اسے چھ ہزار آدمی دے دیئے جاتے۔

"اب میں امیر تیمور کا نمک کھا چکا ہوں۔ اب میں کسی دوسرے آدمی کی طرف رجوع نہ کروں گا۔"

وہ وسیع مملکت جسے تاریخ مملکتِ تیمور کے نام سے موسوم کرتی ہے ایسے ہی جانبازوں کی وفاداری اور تیمور کی بے مثل جوانمردی و لاجواب قیادت پر مبنی تھی۔

اسی منگالی نے بعد میں اپنے ذہن حاضر کی مدد سے تیمور کے لیے ایک اہم لڑائی جیتی۔ تاتاریوں کا ایک لشکر باقی فوج سے کٹ کر کارا انزا ترکمانوں کے سردار کارا یوسف کے ساتھ بر سر پیکار تھا۔ تیمور کے آدمی چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے اور ان پر سخت دباؤ پڑ رہا تھا۔ خیال تھا کہ جنگ کا خاتمہ ان کے خلاف ہو گا۔ منگالی باقی سرداروں سے ایک طرف ہٹ گیا اور کچھ ڈھونڈنے لگا۔ آخر اس کی جستجو کامیاب ہوئی۔ ایک ترکمان کا کٹا ہوا سر اُسے مل گیا۔

اس نے اس سر کو نیزے پر اُٹھا کر بلند کیا اور تاتاریوں میں پکار پکار کر کہنا شروع کیا کہ کارا یوسف مارا جا چکا ہے۔ تاتاریوں کے حوصلے بڑھ گئے اور دشمن کے جو آدمی قریب تھے وہ دل چھوڑ بیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ترکمان بھاگ کھڑے ہوئے۔ کارا یوسف کو بھی ان کے ساتھ بھاگنا پڑا۔

کئی باران وفادار تاتاری سرداروں نے تیمور کی جان بچائی۔ ایلچی بہادر واقعی دلیر قاصد کہلانے کا حقدار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نپولین بونا پارٹ کے افسر شہزادہ موراٹ کی طرح ایلچی بہادر کو بھی طرہ دار خود اور بڑھیا جوتے پہننے کا شوق تھا شاید شوخ لباس کی وجہ سے یا اس کی غیر معمولی جرأت کے لیے اسے اکثر دوسرے شاہوں کے دربار میں پیغام دے کر روانہ کیا جاتا تھا مگر اس کے باوجود ایلچی بہادر ہر لڑائی میں موجود نظر آتا تھا۔ طرّہ و دستار کے ساتھ ایک دفعہ تیمور جاٹوں کے خلاف ایک مہم سے واپس ہوا تھا اور بدخشاں کے بادشاہ کو ڈھونڈ نکالنے کی غرض سے آمو دریا کے بالائی کوہستانی علاقے میں پھر رہا تھا۔

کوہستانی بادشاہ رفتہ رفتہ پہاڑوں کے اندرونی حصوں کی طرف پس نشینی کر رہا تھا۔ ان بلندیوں پر برف کے انبار لگے ہوئے تھے اور درختوں کا نام تک نہ تھا۔ برف کے بے پناہ تودے غیر محسوس رفتار سے سانپ کی طرح نیچے کو کھسک رہے تھے۔

ایسے میں یہ دونوں فوجیں آنکھ مچولی کھیلنے کا سا منظر پیش کر رہی تھیں۔ کبھی بلندیوں کی طرف بڑھ جاتیں۔ کبھی ہزاروں فٹ برف پر سے پھسل پھسل کر نیچے کو آجاتیں اور کبھی بھیڑوں کی طرح سورج کی گرم شعاعوں سے جسم کو گرم کرنے سے زیادہ نہ سوچ سکتیں۔

تیمور کے پاس پیغام رساں پہنچا کہ مقدمۃ الجیش قطع ہو جانے کی وجہ سے بدخشانیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا ہے اور بدخشانی ان قیدیوں کو ایک دوسری گھاٹی میں لے جا رہے ہیں۔

تاتاریوں کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ سردار اپنی فوجوں کو بچا لانے کی ہر ممکن سعی کریگا۔ تیمور کے ساتھیوں کے خیال میں مقدمۃ الجیش کی مدد کو جانا بے سود تھا۔ تیمور کو ان کی کم ہمتی پر از حد غصہ آیا۔ اس نے ساتھیوں کو سوار ہونے کا حکم دیا اور خود پیغام رساں اور ایک رہنما کو ساتھ لے کر روانہ ہو گیا تاکہ چٹانوں کے اوپر سے کوئی ایسا راستہ مل جائے جو دوسری گھاٹی میں لے جائے جس میں بدخشانی تھے۔

اس کے آدمی گرتے پڑتے اس کے پیچھے آرہے تھے۔ کئی گھوڑے پھسلے اور سوار کے ساتھ برف پر سے لڑھکتے ہوئے اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو گئے۔ تیمور تیزی سے آگے بڑھتا گیا اور جب دوسری گھاٹی میں پہنچا اس وقت اس کے ساتھ صرف تیرہ آدمی تھے۔ وہ بدخشانیوں کو آتا دیکھ کر جلدی سے ان کے سامنے پہاڑ کی بلندی پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھا تاکہ ان سے پہلے پہنچ جائے۔ اس نے اپنے تیرہ جوانوں کے ساتھ اس بلندی پر چٹانوں کی اوٹ میں اپنا مقام مضبوط کر لیا۔ ان تیرہ میں ایلچی بہادر بھی تھا۔

دوسری طرف سے پچاس سوار سامنے آئے مگر ان سے کچھ پیچھے دو سو اور بھی تھے۔ ایلچی بہادر نے جب یہ دو سو پیچھے آتے دیکھے تو وہ ایک پہلو کو نکل

گیا۔ اس کا سمور کا کوٹ، طرہ، کلغی اور چمکیلا کمربند دیکھ کر وہ رک سے گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ سوار کہیں غیب سے نمودار ہوا ہے۔ اس کا گھوڑا بھی اعلیٰ نسل کا تھا۔ کمان پہلو سے لٹک رہی تھی۔ اس کی تلوار ہاتھی دانت کے نیام میں رکھی تھی اور اس کا سنہری دستہ چمک رہا تھا۔

"او! کون ہو تم، بدبخت و بدنسل انسان!" ایلچی بہادر نے دور سے پکارا! "روکو اپنے گھوڑوں کو۔ جانتے ہو سامنے کون ہے؟ یہ امیر تیمور ہے۔"

ایلچی بہادر ان میں شامل ہو گیا۔ جیسے جنگ کا خیال تک بھی اس کے دل میں نہ ہو۔ نہایت تسلی سے اس نے تیمور کے مقام کی طرف اشارہ کیا جہاں تیمور کا کلغی دار خود چٹانوں میں سے نظر آ رہا تھا۔ وہیں سے تیر اڑتے ہوئے آ رہے تھے۔

"سوچو تو سہی" ایلچی نے اپنا بیان جاری رکھا "اگر تم اس جگہ مارے جاؤ تو تمہارے خاندان اور اہل و عیال بھی تمہیں بے وقوف کہیں گے۔ ایسے وقت میں یہاں موت کو دعوت دینا کتنی نادانی ہے۔ تیمور تمہارا راستہ روک کر کھڑا ہے۔ اس وقت صلح کر لینا اچھا ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ تم قیدیوں کو یکجا کر لو اور انھیں لوٹا کر تیمور کی خوشنودی حاصل کر دو۔"

ایلچی کی اس تقریر سے وہ متاثر ہوئے۔ وہ گھوڑوں سے اتر آئے اور ایلچی کے سامنے تعظیم بجا لائے۔ وہ حق بجانب تھے۔ انھوں نے سوچا، تیمور اس مقام پر ضرور طاقتور ہوگا ورنہ اتنا بلند مرتبت سردار یوں تنہا ان کے پاس نہ آتا۔ ایلچی بھی گھوڑے سے اتر پڑا اور ان کے کاندھوں پر تھپکی دی۔ تیر برسنا رک گئے اور قیدیوں کو یکجا کیا گیا۔

ایلچی ان سے ایک بار پھر مخاطب ہوا:

"یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تیمور کے آدمیوں کو یوں بھیڑ بکریوں کی طرح تم روانہ نہیں کر سکتے۔ جب تم نے انھیں قید کیا تھا تو ان کے پاس تلواریں تھیں"

بدخشانی حقیقتاً خوف زدہ ہو چکے تھے۔ سامنے امیر تیمور تھا جس کی دلیری کے چرچے وہ ہر روز سنتے رہتے تھے۔ وہ تھا بھی انھیں کا منتظر اور ان کا راستہ روکے ہوئے، بچ نکلنے کا واحد راستہ۔ یہ سردار درست تھا۔ قیدیوں کی تلواریں انھوں نے لوٹا دیں۔ لوٹے ہوئے ہتھیار واپس کر دیے گئے۔ ایلچی بہادر نے چھ سو قیدیوں کو ساتھ لیا اور پہاڑی پر چڑھ کر تیمور سے درخواست کی کہ بدخشانیوں کو رکاب بوسی کا شرف بخشے۔

تیمور اسی وقت نیچے اتر آیا۔ بدخشانی پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی کمان نحر جیبوں پہ ہاتھ رکھ کر صلح کی قسم اٹھائی۔ تیمور اور ایلچی بہادر ان سے باتوں میں مشغول ہو گئے۔ اس دوران میں تیمور کے لشکر کے جو دستے پیچھے رہ گئے تھے وہ بھی پہنچ گئے۔

ایلچی ہر بات کا خیال رکھتا تھا۔ کہنے لگا:

"یہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے! نہ کھانے کو کچھ اور نہ سونے ہی کا انتظام"

بدخشانی سردار نے تجویز پیش کی کہ پہاڑ کے دامن کے دیہات اس مقصد کے لیے اچھے رہیں گے۔ تجویز قبول کر لی گئی اور سب مل کر جشن منانے کے لیے سقفِ جہاں سے نیچے اتر آئے۔

ایلچی بہادر کی بہادری کا یہ واقعہ صریح دیدہ دلیری سے کم نہیں۔ اس سے مارشل مورانٹ کا وہ واقعہ یاد آتا ہے جب وہ رومال ہلاتا ہوا ڈیانا کے پل پر آسٹرین فوج میں جا کر شامل ہو گیا اور جب وہ ان کی توپ کے دہانے پر بیٹھ کر ان سے باتوں میں مشغول تھا اس کے فرانسیسی ساتھی پل پر پہنچی ہوئی

سرنگیں ہٹا رہے تھے۔ اس واقعے کے ایک سال بعد ایلچی بہادر ایک دریا سے تیر کر پار ہوتے ہوئے جاں بحق تسلیم ہؤا۔

ملک تاتار کے یہ جانباز سردار جانتے تھے کہ تیمور کی زیادستی میں یوں بھی ان کی زندگی کے دن گنتی کے تھے۔ مگر انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ تیمور خود بھی خطروں کو اسی طرح لبیک کہتا تھا جس طرح اسے ان سے توقع تھی۔ اس کے بدن پر بھی اتنے ہی زخم تھے جتنے ان کے جسموں پر نظر آتے تھے۔ اس کی معیت میں جو دن گزرتے تھے وہ عزت، سطوت اور جبروت کے حامل تھے۔ وہ جنگ میں قدم رکھتے ہوئے فخر سے اپنا سر بلند رکھتے تھے۔

ایک دفعہ تیمور نے ان سے کہا تھا:

"یہ جانبازوں کے رقص کا وقت ہے۔ جانتے ہو میدانِ جنگ رقص گاہ ہے۔ بہادروں کے نعرے اور تلواروں کی جھنکار موسیقی ہے اور دشمن کا خون شرابِ ناب ہے"

چھ سال کی مسلسل تگ و دو کے بعد اکثر تاتاری سردار تیمور کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ اس دوران میں ایسا وقت بھی آیا جب اسے قزاق کے نام سے یاد کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ ایک دن سے زیادہ وہ کسی مقام پر نہ رکتا تھا۔ قزاق کا نام آج بھی اس سطح مرتفع کے سپاہیوں کو کاسک کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ اب وہ حقیقی معنی میں لشکرِ سالار تھا جس کی کمان کے نیچے بہت بڑی فوج تھی۔ جب موسیٰ کی قوم کے آدمی جو جلائیر کہلاتے تھے تیمور سے آکر ملے ، اس وقت اس کشمکش کا اختتام یقینی ہو گیا۔ جلائیر قوم کی تعداد بہت بڑی تھی۔ وہ اچھے خاصے ملکوں کی فوج سے زیادہ سپاہی میدانِ جنگ میں لا سکتے تھے۔

وہ نیم مغل تھے۔ اُن کے ساتھ اس کا پُرانا رشتہ بھی تھا۔ وہ اس کے بڑے لڑکے کے ننھیالی عزیز بھی تو تھے۔

اتنی بڑی فوج اور تیمور کا سا کمانڈر۔ حسین ان کی تاب کیسے لا سکتا۔ حسین کی طاقت اس طرح زائل ہوگئی جس طرح موسم بہار کی برسات میں برف پگھل جاتی ہے۔ پہلے تو اسے آموکے جنوب کی طرف بھاگنا پڑا، پھر بلخ میں محصور ہوگیا۔

شہر نہایت آسانی سے فتح کر لیا گیا۔ حسین برباد شدہ مکانوں میں چھپ گیا اور وہاں سے تیمور کی خدمت میں آخری گزارش بھیجی اور کہا کہ اگر اسے حج پہ جانے کی اجازت مل جائے تو وہ ملک چھوڑ کر جانے پر رضامند ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوُا اس کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ تیمور نے حسین کی جان بخشی کا وعدہ کیا مگر حسین کو یقین نہ آیا اور وہ بھیس بدل کر مسجد کے مینار میں جا چھپا جہاں دوسری صبح مؤذن نے اسے دیکھ لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک سپاہی اپنا گھوڑا ڈھونڈنے کے لیے مینار پہ چڑھا تو اس نے حسین کو وہاں دیکھ لیا۔

حسین کی موت کے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب حسین گرفتار کر لیا گیا تو تمام سردار اس کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ تیمور یہ کہ کر اٹھ گیا:

"امیر حسین اور میرے درمیان دوستی کا عہد تھا۔ اس لیے میرے ہاتھوں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔"

ایک بیان کے مطابق معاہدہ اور ایک اور افسر چپکے سے اٹھ کر چلے گئے اور تیمور کو معلوم ہوئے بغیر انھوں نے اسے قتل کر دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے انھوں نے اس سے کہا تھا کہ ہم تمھیں بچ نکلنے میں مدد دیں گے۔

دراصل بات صرف اتنی ہے کہ تیمور نے اپنے سابق حلیف کو بچانے کی کوشش نہ کی۔ راوی لکھتا ہے "حسین کی موت کا وقت اور مقام تقدیر میں لکھا جا چکا تھا اور انسان تقدیر سے ہرگز نہیں بچ سکتا۔"

زین الدّین کی آواز

تیمور بلخ میں کچھ دنوں کے لیے رُک گیا۔ یہ وادی خاصی گرم تھی۔ یہاں گنّے کی کاشت عام تھی اور تجارت بافراط تھی۔ یہاں سے ہندوستان جاتے ہوئے کاروان گزرتے تھے اور یہاں سے گزر کر سرزمین آفتاب میں داخل ہوتے تھے۔ یہاں کوہستانی سردار بھی اپنے کوہستانی مسکنوں سے نیچے اُتر آیا کرتے۔ اس شہر کے ساتھ ہزاروں یادیں وابستہ تھیں اور فضا میں تیرتے ہوئے گرد و غبار کے ذرّے ان یادوں کو تازہ رکھتے تھے۔

گزشتہ تہذیبوں کے کھنڈروں کے درمیان کہیں وہ معبد بھی پوشیدہ تھا جو آتش پرستوں نے تہذیب و تمدن کے ابتدائی ایام میں تعمیر کیا تھا۔ قریب ہی شب و روز کی روندی ہوئی گلیوں میں مہاتما بدھ کے مجسمے کے وہ ریزے بھی تھے جو اپنے عہد میں زعفرانی لباس میں لپٹے ہوئے عبادت گزاروں کی عقیدت کا ماویٰ و ملجا ہوا کرتے تھے۔ لوگ اسے عروس البلاد کہتے تھے۔ سکندر اعظم اسے بکتریا کے نام سے جانتا تھا مگر اب یہ قبۃ الاسلام بھی کہلاتا تھا۔ چنگیز خاں کے لاتعداد سپاہی اسے مٹی اور پتھر کا ڈھیر چھوڑ کر گئے تھے جہاں مقبروں اور مسجدوں کے سوا بعد میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ تیمور نے اسے حیات نو بخشی اور نئے سرے سے تعمیر کیا۔

اب تیمور انتظار کر رہا تھا۔ اسی شہر میں جہاں حال ہی میں اس نے حسین کو سپرد خاک کیا تھا۔ حسین کی موت سے تاتاری قوم کو نیا سردار چننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنگیز خاں کا قانون یہی کہتا تھا۔ قوم کے امور کی صدارت خاخان (خاقان) مغل کی اولاد

یعنی چنگیزی خاندان کا "طرہ" ہی کر سکتا تھا۔

اس قبائلی مجلس "کورتائی" کی جانب تمام سردار اپنے کوہستانی مسکن چھوڑ چھوڑ کر آرہے تھے۔ ہندوستان کے دروں سے شمالی سطح مرتفع کے مرغزاروں تک کے سرداران قبائل اپنی رائے پیش کرنے جا رہے تھے۔ مجلس کی جانب ایران کے عمامہ پوش شہر اور بخارا کے علماءِ باکمال اور معروف خطیب بھی جوق در جوق آرہے تھے۔ ان میں زین الدین اور اس کا درویش صفت ساتھی، ماوراءالنہر کے باشندوں کا مصدقہ مرشد و ہادی خواجہ بہاءُ الدین بھی شامل تھے۔ فوج، علماء، صوفیہ اور سرداران قبیلہ تو قوم کی سرداری کا مسئلہ حل کرنے کو یکجا ہو رہے تھے مگر تیمور کنارہ کش رہا۔ اس کا دل بہلانے کے لیے نوخیز جہانگیر موجود تھا۔

بعض سرداروں نے تیمور کی نمائندگی کی مخالفت کی۔

"بہتر ہوگا کہ ہم ملک کو صلح سلوک سے بھائیوں کی طرح بانٹ لیں۔" یہ بدخشانیوں کی رائے تھی۔ "ہر ایک اپنے اپنے ملک اور اپنے اپنے صوبے پر قابض رہے۔ جب کبھی باہر سے حملہ ہوگا ہم یقینی طور پر متحد ہو جائیں گے۔"

تیمور کے دیرینہ ساتھیوں نے اس خیال کی مخالفت کی اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔

"بھائیوں کے امور بھی اسی صورت بخیر و خوبی انجام پاتے ہیں جب بڑا بھائی موجود ہو۔ اگر تم ملک کو تقسیم کر کے صوبوں کے انتظامات میں لگ جاؤ گے تو موقع پا کر جاٹ حملہ آور ہونگے اور مقابلہ مشکل سے ہو سکے گا۔"

جو سردار قومی طاقت رکھتے تھے اور ان کے قبائل کی تعداد زیادہ تھی انھوں نے بھی تیمور کی مخالفت کی اور وجہ بھی پیش کی۔

"بہتر ہوگا کہ ہم آبائی قانون کی طرف لوٹ جائیں۔ ہمارے قانون میں بادشاہی

کا وجود ہی نہیں۔ ہم صرف اتنا کریں کہ چنگیز کی اولاد سے ایک حکمران مقرر کر دیں اور زیادہ سے زیادہ یہ کریں کہ تیمور اس کا نائب مقرر ہو جاتے۔"

اب ایک درویش اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے علماء اور شیوخ کا نظریہ پیش کیا۔ یہ اپنے تقویٰ و طہارت کی وجہ سے ابوالخیر کا لقب پا چکا تھا۔

"یہ قانونِ اسلام کے صریحاً خلاف ہے کہ امتِ محمدی کسی غیر مسلم[1] کے تابع ہو کر رہے۔ جہاں تک چنگیز خاں کا تعلق ہے وہ محض صحرانشین تھا اور تلوار کے زور سے مسلمان اقوام پر مسلط ہوا۔ آج تیمور کی تلوار کا زور چنگیز کی تلوار سے کسی طرح بھی کم نہیں۔"

اس نے جنگجو تاتاریوں کے قلوب کو اتنا گرمایا کہ وہ جذبات کی شدت سے گرمجوش ہونے لگے۔

"تم سب حسین سے خوفزدہ تھے اور صحرا و کوہستان میں پناہ لینے کی فکر میں رہتے تھے۔ جب تیمور اُٹھا تو تم نے بھی ہمت باندھی اور اپنے دُور دراز مسکنوں سے نکلنے پر آمادہ ہوئے۔ اس نے نہ اس وقت تم سے دشمن کو زیر کرنے کی مدد مانگی اور نہ اب وہ تمھاری مدد کا خواستگار ہے۔ اب تک میں نے تمھیں تاتاری سمجھ کر مخاطب کیا ہے۔ اب میں تم سے بحیثیت مسلمان گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ تمام شیوخ اور علماء میرے ہم نوا ہیں۔ ہم تیمور کو پورے ماوراء النہر کا حکمران تصور کرتے ہیں اور یہاں توران کے میدانوں کا بھی"

یہ تھا مذہبی نمائندوں کا نقطۂ نظر۔ اس لیے نہیں کہ تیمور عبادت گزار اور زاہد و متقی تھا بلکہ صرف اس لیے کہ تیمور ہی اس طوائف الملوکی اور مسلسل لوٹ مار کا قلع قمع کرنے

---

[1] یہ اشارہ جلایر اور بلیدوز قبیلوں کی طرف تھا جو قدیم تاتاریوں سے نسبت رکھتے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک چنگیزی قانون کے تابع چلے آتے تھے۔ بلخ کی اس تاریخی مجلس میں چنگیز کی وفات سے ایک سو چالیس سال بعد پہلی مرتبہ اپنی خوشی سے چنگیزی قانون سے انحراف کیا گیا۔

کا اہل تھا۔علاوہ بریں صرف تیمور ہی ایسا سردار تھا جو شمال سے جاٹ مغلوں کے حملوں کو روکنے کے قابل تھا۔جن لوگوں نے تیمور کے انتخاب کو حتمی بنا دیا وہ صف کے سپاہی تھے جو کسی اور شخص کو حکمران ماننے پر کسی صورت رضامند نہ تھے۔

دوسرے دن تمام سردار اور قبائلی بزرگ تیمور کے شامیانے پر حاضری دے کر اس کے سامنے دو زانو ہو گئے۔اس کا بازو تھاما اور سفید نمدے کے فرش پر لے گئے۔مغلوں کی کہنہ ترین رسوم کے مطابق سفید نمدے کا فرش سردار قبیلہ اور حاکم وقت کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔یوں یہ خود پوش جواں مرد اپنی اطاعت کا اعلان کیا کرتے تھے۔

اگر تاج پوشی کی کوئی رسم ہوتی تھی تو وہ اس روز پوری ہوئی۔زین الدین نے قرآن کریم کا نسخہ ہاتھ میں لیا اور سردار کو اس پر ہاتھ رکھ کر تیمور کی اطاعت کا اقرار کرنے کو کہا۔یہ درست کہ تیمور حقیقت میں پہلے ہی سے حکمران تھا، اس کی طاقت اس کا حکم منوا سکتی تھی مگر اطاعت کا اظہار اس رسم کے بغیر ممکن نہ تھا۔کم از کم ان مردان میدان کے قریب یہ اظہار ضروری تھا۔

آج سے سپہ سالار تیمور کا لقب امیر تیمور ہو گیا تھا۔آج وہ اس کا نمک کھانے کے خواہاں تھے۔آج کے بعد اس کی اطاعت گزاری ان کے لیے عزت و وقار کا موجب تھی اور اس سے غداری ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے باعث شرم و خجالت۔ تیمور ہی ان کی جائداد کا محافظ تھا اور تیمور ہی ان کے درمیان اختلافات رفع کرنے کا واحد ذمہ دار۔اگر وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام ثابت ہوا تو وہ دوسری مجلس مشاورت منعقد کرنے اور نیا امیر منتخب کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ یہ تھا قبول شدہ دستور اور اس سے انحراف ناممکن تھا۔

نئے منتخب امیر کے سامنے قالین کے سرے پر کھڑے ہو کر عالم دین زین الدین نے اعلان کیا:

"مشیتِ ایزدی کو یہ منظور ہے کہ تم فاتح بنو اور طاقت حاصل کرو۔ تمہارے ذریعے سے اسلام کو بھی تقویت پہنچے گی۔"

سفید نمدے کے فرش اور معمولی بلندی کے ہاتھی دانت کے تخت پر متمکن امیر اپنے ارد گرد کے مباحث کو مسکراہٹ سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے اسے سروکار نہ تھا کہ کونسا عالم یا سید اس کے داہنے ہاتھ کی نشست پر جلوہ گر ہو۔ اس کے چہرے، بدن یا ملبوسات پر ایسا کوئی نشان نہ تھا جس سے اس کا مذہبی رجحان ظاہر ہو۔ وہ حسبِ معمول اپنی زرہ پہنے تھا۔ چہار آئینہ سجائے، بازوبند اور شانہ گیر لگائے اور سر پہ خود جو زرین کام سے جگمگا رہا تھا۔

اس نے اپنے نئے سرداروں میں دل کھول کر تحائف بانٹے۔ جو کچھ اس کے پاس تھا وہ آن کی آن میں سرداروں کے پاس پہنچ گیا۔ اصیل نسلی گھوڑے، بیش قیمت خلعت، قبائے شاہی، مختلف ہتھیار اور مرصع زین۔ جب شام ہوئی تو ان کے شامیانوں کی طرف خوانِ نعمت اور انواع و اقسام کی اشیاء خوردنی کا تانتا باندھ دیا۔ دوراندیش بزرگ اور علماء و سادات جو اس کے شامیانے میں موجود تھے انھوں نے اس دریا دلی سے اسے روکنے کی کوشش کی۔ تیمور نے نہایت سادگی سے کہا:

"اگر میں بادشاہ ہوں تو یہ سب کچھ اب بھی میرا ہی ہے۔ اور اگر میں بادشاہ نہ رہا تو پھر یہ دولت اگر میرے پاس رہی بھی تو میرے کس کام کی؟"

دوسرے دن اس نے نئے افسروں، وزیروں اور مشیروں کا اعلان کیا جو ان مناصب کے لیے چُنے گئے۔ ان میں معروف نام بھی تھے۔ امیر داؤد کو سمرقند کی حکومت ملی اور مجلس مشاورت یعنی ایوان کا سردار مقرر ہوا۔ قبیلۂ برلاس کا امیر جاکو جو اب بوڑھا ہو چکا تھا، اُسے علمبرداری اور نقارہ باشی کی عزت بخشی گئی۔ ساتھ ہی اسے "تاواچی" یعنی اڈی کانگ کا رتبہ عطا ہوا۔

رجمنٹ کمانداروں کی فہرست میں دو نئے نام بھی نظر آتے ہیں۔ ایک مغل ختائی بہادر اور دوسرا عرب شیخ علی بہادر

ایک بات شروع سے ظاہر ہوتی ہے۔ کوئی بھی امیر تیمور کے ارادوں اور احکام میں دخل دینے کا مجاز نہ تھا یہ درست کہ زین الدین اور چند اور پرانے رفقائے کار اس کے خیمے میں جب چاہتے داخل ہو سکتے تھے انھیں کو دوسروں پر کوئی خاص فوقیت حاصل نہ تھی اور ان میں سے کوئی بھی خاص طور پر تیمور کا منظورِ نظر نہ تھا۔ وہ ہر ایک کو مشورہ دینے کی اجازت دے دیتا تھا مگر فیصلہ شدہ امور میں کسی کا دخل نہ ہوتا تھا۔ حصولِ مقصد کے لیے ایسی یک جہتی مشرقی شاہوں میں بہت کم نظر آتی ہے اور عجیب تر بات یہ ہے کہ تیمور آج تک اپنے ذاتی معاملات میں از حد بے توجہی برتتا رہا تھا۔

وہ اختلاف کو فرو کرنے پر پوری تندہی اور تیزی سے کام لیتا۔ حسین کے بہی خواہوں پر اسی وقت حملہ کر دیا گیا۔ بلخ سے ابھی دربار منتقل بھی نہ ہوا تھا۔ قیدیوں کو زنجیروں سے باندھ کر لایا گیا اور کئی ایک کا سر قلم کیا گیا۔ ان کے گھروں کو نذرِ آتش کیا گیا حتیٰ کہ مخالفت کا نام تک نہ رہا۔ وہ شروع سے جاٹ مغلوں کی طرف سے چوکنا رہا تھا۔ اب وہ ہر سال شمالی پہاڑوں کی طرف حملہ آور ہوتا اور صریح احکام تھے کہ فولاد اور آتش کے استعمال میں کوئی فروگزاشت روا نہ رکھی جائے۔ وہ اس فیصلے پر پہنچا تھا کہ ملک کے دفاع کا بہترین طریقہ حملہ ہے۔ تجربے سے وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ جاٹ مغل حملہ کرتے وقت خطرناک ہوں تو ہوں دفاع میں وہ ہرگز ایسا نہ تھا۔

جب جاٹ مغل قبائل کے خلاف ان کے اپنے اصول و آئین دہرائے گئے تو وہ سرحدی وادیوں سے منتقل ہو کر شمال کی جانب اپنے مرکزی حصار المالیک کی طرف چلے گئے۔ تیمور نے فوراً ہی اس سمت ان کا تعاقب نہ کیا۔ دریائے سیر اور ہندوستان کے درمیانی خطے میں تیمور کے مضبوط ہاتھوں سے ایک نیا نظام پرورش پا رہا تھا اور وہ

اپنی فوجوں کو ایک نئے انضباط کا عادی بنا رہا تھا۔ ایک مرتبہ جاٹوں کو سزا دینے کے لیے دو سردار شمال کی جانب روانہ کیے گئے۔ جب وہ پہنچے تو جاٹ اپنی چراگاہیں چھوڑ کر وہاں سے جا چکے تھے۔ تاتاری سردار یہ سمجھے کہ اب ان کا فرض پورا ہو چکا تھا اور وہ واپس چلے آئے۔

جب وہ سیر دریا کو عبور کر رہے تھے اور اس خیال میں تھے کہ پار ہو کر وہ تھکان کو جشن سے مٹائیں گے تو انھوں نے دیکھا کہ دوسری طرف ایک اور لشکر شمال کی جانب جا رہا ہے اور وہ حرکات سے اپنی فوج کا لشکر نظر آ رہا تھا۔ قریب آنے پر پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو، جواب ملا:

"جس جاٹ قوم کو تم نہ ڈھونڈ سکے انھیں ڈھونڈ کر سزا دینے جا رہے ہیں"۔

پہلے تو دونوں سرداروں کو غصہ آیا مگر پھر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ تیمور کے دربار کا رُخ بدل کر وہ شمال کو جاتے ہوئے لشکر کے ہمراہ ہو لیے۔ ایک سال کے بعد یہ متحدہ لشکر واپس سمرقند آیا۔ انھیں موسم سرما بھی شمال کی بلندیوں پر گزارنا پڑا تھا مگر وہ اپنا فرض ادا کرنے کے بعد واپس آئے تھے۔ جاٹ قبیلے کا مال اسباب اور ان کی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ وہ ساتھ لے آئے تھے اور ان کی آبادیاں خاک میں مل چکی تھیں۔ تیمور نے سب کو یکساں طور پر انعامات بانٹے۔ پہلی بار دو سرداروں کے ناکام لوٹ آنے کا ذکر تک نہ کیا۔ اگر وہ اس ناکامی کا ذکر چھیڑتا تو دونوں سردار خجالت محسوس کرتے اور یقینی تھا کہ وہ اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر ایک علیحدہ محاذ قائم کر دیتے جسے توڑنے کے لیے بے وجہ جانیں ضائع ہوتیں۔

ایسے سردار بھی تھے جو خفا ہو کر اپنے آبائی قلعوں کو چلے جاتے تھے مگر مہینے کے اندر ہی تیمور کی فوجیں ان کا محاصرہ کر رہی ہوتیں اور انھیں چار و ناچار قلعے سے نکلنا پڑتا۔ جب وہ تیمور کے دربار میں آ کر دست بستہ حاضر ہوتے تو انعامات و اکرامات سے

نوازسے جاتے مگران پر اپنی خفگی کی بے ثباتی ضرور عیاں ہو جاتی۔ ایک مرتبہ ایک افسر جنگ سے بھاگ آیا۔ اسے کافی جستجو کے بعد ڈھونڈ نکالا گیا۔ اس کے ہتھیار اس سے لے لیے گئے اور منہ پیچھے کی طرف کر کے اسے گدھے کی پیٹھ پر کس کر باندھا گیا۔ پھر کئی دنوں تک ہنستے، چیختے، چلاتے اور فقرے کستے شہروں کی تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔

کتلان کا شہزادہ کیخسرو، ایران کے ایک نہایت معروف خاندان کا چشم و چراغ ایک بار خیوا کے صحرا میں تیمور سے عین جنگ کے دوران میں الگ ہو گیا، یہیں ایلچی بہادر دریا تیر کر عبور کرتے ہوئے ڈوب گیا جب وہ عین شیخ علی بہادر اور ختائی بہادر کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ آخر میں فتح تیمور ہی کی ہوئی۔ مگر کیخسرو کو ڈھونڈ نکالا گیا پکڑ کر سرداروں کی عدالت کے سامنے لایا گیا اور فوراً سر قلم کر دیا گیا۔

اس کے پرانے وفادار ساتھی جب نئے حلیفوں سے ملتے تو ہمیشہ کہتے:

"ہمارے امیر کا حکم ماننا ہی اچھا ہے۔ وہ جھوٹے ہیں جو کچھ اور کہتے ہیں۔"

ایسے منضبط امیر کا حکم نہ ماننا اور اپنی موت کے حکم پر اپنی ہی مہر ثبت کرنا ایک ہی بات تھی۔ ان نوواردوں میں چند جاٹ شہزادے بھی تھے جو مقابلے کو بے سود سمجھ کر تیمور کے اطاعت گزار بن گئے تھے۔ ایک تو بلی کی چوک کا لڑکا بایزید تھا جسے یاد تھا کہ نئے امیر نے اس کے باپ کی جان بخشی کی تھی۔ دوسرا ختائی بہادر تھا خطا کا امیر جو ہمیشہ چمڑے کا کوٹ پہنے رہتا تھا اور اس کی پیٹھ پر گھوڑے کی ایال لٹکتی رہتی تھی۔ عجیب و غریب طور پر ختائی بہادر کی دوستی شیخ علی بہادر سے ہو گئی۔ یہ عرب بھی اسی کی طرح تند مزاج اور غصیل تھا۔

یہ دونوں ایک مرتبہ ایک لشکر کی کمان میں باقی فوج سے بہت آگے چلے گئے تھے اور جاٹوں کی فوج کا صحیح مقام ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر ایک دریا کے پار انھوں نے جاٹ فوج کو ایک مضبوط مقام پر دیکھ لیا۔ دونوں بہادر دریا کے کنارے رک گئے۔

زین الدین کی آواز

انتظار میں کئی دن گزر گئے۔ آخر دونوں مشورے کی غرض سے اکٹھے ہوئے۔ ختائی سمجھ بوجھ اور احتیاط سے کام لینے کے حق میں تھا۔ اس نے بہت سی تجویزیں پیش کیں جن کا لب لباب یہ تھا کہ دریا کو ایسی جگہ پار کیا جائے جہاں جاٹوں کو خبر نہ ہو۔

شیخ علی خاموشی سے سنتا رہا۔ شاید اس کے دماغ میں کوئی تجویز تھی ہی نہیں۔ ختائی سمجھا کہ شیخ علی متفق نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہے۔ مغل خون فطرتاً تنگی مزاج ہوتا ہے۔ اس نے ذرا درشتی سے پوچھا:

"تمھارا کیا خیال ہے؟"

"واللہ" شیخ علی نے آہستگی سے کہا "میرے خیال میں مغل ایسے ہی لڑتے ہیں۔"

سطح مرتفع کے پروردہ مغل کا چہرہ خون کی شدت سے قرمزی ہو گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا تو پھر دیکھنا" اس نے نہایت خفگی سے کہا "اور تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ مغل اپنا سر کس طرح بلند رکھتا ہے"

شیخ علی ایک کہنی پہ زور دے کر بلند ہوا جیسے کوئی چیز دیکھنے میں منہمک ہو۔ ختائی نے گھوڑا منگوایا اور زین لگائے بغیر ہی دریا میں اتر گیا۔ پار پہنچ کر اس نے جاٹوں پر حملہ کر دیا۔ جب وہ پہلے دو آدمیوں کو گھیر چکا تو جاٹوں نے اسے گھیر لیا۔

شیخ علی تعجب سے حیرت اور حیرت سے تحسین کی منزل پر جا پہنچا تھا کہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنا گھوڑا مانگا۔ کود کر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور سیدھا دریا کے پار ہو کر مغلوں پر تیغ لے کر ٹوٹ پڑا۔ جب ختائی کے گھوڑے کے قریب ہوا تو پکار کر کہا:

"تم پاگل ہو۔ اس طرح لڑنا حماقت ہے۔ واپس جاؤ۔"

"تم واپس جاؤ" اس نے جواب دیا۔ مگر دونوں کے ہاتھ تیغوں کو بجلی کی سی

سرعت سے چلا رہے تھے۔

شیخ علی نے صرف اتنا کہا:

"نعوذ باللہ، خدا نہ کرے"

اور دونوں شانہ بشانہ مغلوں کے وار روک رہے تھے اور اس حلقے کو توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھی بھی جلد ہی پہنچ گئے اور انھیں جاٹوں کے نرغے سے نکال کر واپس لے آئے۔

واپس آکر پھر مشورہ کرنے بیٹھے۔ اس مرتبہ مزاج کی تندی کم ہو چکی تھی اور نہایت دوستانہ ماحول میں حملے کا منصوبہ بنانے میں منہمک ہو گئے۔

صوفی اور ملک

اسے ایسے آدمیوں کو قابو میں رکھنا اور ان کی کمان کرنا، یہ تھا تیمور کا کام۔ اس مشکل کام کے لیے فولادی عزم اور غیر معمولی عقل و ہوش کی ضرورت تھی۔ وہ خوشی سے کہا کرتے:

"امیر تیمور عادل ہے اور انعام و اکرام میں لاثانی۔"

انھیں یہ دیکھنے کا شوق بھی تھا کہ تیمور دوسرے شاہوں کے بھیجے ہوئے سفیروں سے کس طرح پیش آتا ہے۔ صحرا کے اس پار کے بادشاہ جاننا چاہتے تھے کہ تیمور کی طاقت کتنی ہے۔

یہ پڑوسی طاقتور تھے۔ تاتاریوں کی خانہ جنگی کے ایام میں انھوں نے تاتاری سرزمین پر حملے کیے تھے اور فائدے میں رہے تھے۔ خوارزم کا صوفی جو جلایر قبیلے سے تھا خیوا اور اُورگنج کا حکمران تھا۔ جاٹ خوانین کا ایک لحاظ سے اطاعت گزار تھا۔ وہ تیمور کو بادیہ پیما کی حیثیت سے جانتا تھا جب وہ سُرخ ریت کے ٹیلوں میں پناہ گزین کی حیثیت سے ترکمان قبائل کے ساتھ رزم آرا ہوا تھا۔ اُورگنج کا شہر آموودیا کے دہانے پر واقع تھا اور تجارت کے فروغ کی وجہ سے دولت کا مرکز تھا۔ صوفی غرور و تکبّر میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔

اس نے قیمتی تحائف ارسال کیے۔ تیمور نے اس کے سفیر کے ہاتھ ان سے بھی قیمتی تحائف بھیجے اور درخواست کی کہ خان زادی یعنی صوفی کی لڑکی جو خوبصورتی اور حسن میں یکتا تھی۔ اس کی شادی تیمور کے لڑکے جہانگیر سے قرار پاتے۔ یوں تو درخواست

دوستی کے مترادف تھی مگر صوفی یہ سمجھا کہ تیمور اب جاٹ خان کی پرانی حدود کو اپنی حدود تصوّر کرتا ہے اور صوفی کو اپنا باجگزار بنانا چاہتا ہے۔

"میں نے خوارزم کو تلوار سے جیتا ہے" اس نے واپسی پیغام بھیجا "اور تلوار ہی اب مجھ سے اسے لے سکتی ہے۔"

تیمور اسی وقت صحرا کو عبور کرنا چاہتا تھا مگر ایک درویش نے مشورہ دیا کہ پہلے خود جاکر صوفی کو شاہِ سمرقند سے بہتر تعلقات بنانے پر رضامند کرنے کی کوشش کرے لیکن جب یہ درویش صوفی کے پاس پہنچا تو اُسے قید میں ڈال دیا گیا۔ اب تیمور کا رُکنا مشکل تھا۔

امیروں اور سرداروں کو پیغام بھیجے گئے۔ اس صحرا کے سینے پر اس کے قدموں کے نقوش ایک بار پہلے بھی پڑ چکے تھے۔ اسی جنگ میں کنالان کے کیخسرو نے بے وفائی کی مگر اس کے باوجود تیمور نے خیوا پر لغب، منجیقوں وغیرہ سے حملہ کیا۔ اس نے خندق کو درختوں اور جھاڑیوں سے پُر کیا اور کمندوں سے شہر پناہ کو عبور کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ شیخ علی کا ہاتھ سب سے پہلے فصیل کے اوپر پڑا۔ اس کے پیچھے اس کا افسر آ رہا تھا اور وہ اپنے ماتحت کو آگے جاتا نہ دیکھ سکا۔ ٹخنے سے پکڑ کر اس نے شیخ علی کو نیچے گرایا اور خود اوپر چڑھ کر خیوا کے سپاہیوں پر پل پڑا۔ جلد ہی اس کے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ خیوا کو سر کرنے کے بعد تیمور اُرگنج پہنچا۔ صوفی اب وہیں قلعہ بند ہو چکا تھا۔ یہاں منجنیقوں اور دوسرے محاصرہ شکن ہتھیاروں کی ضرورت تھی اور ان کے تیار کرنے کے انتظامات شروع کر دیئے گئے۔ یہ انتظامات جاری تھے کہ صوفی کی طرف سے پیغام آیا:

"ہم اپنے ساتھیوں کا خون کیوں بہائیں۔ کیوں نہ تم اور میں آپس میں فیصلہ کر لیں۔ جس کے ہاتھ دوسرے کے خون سے رنگے جائیں وہی فاتح تصوّر کیا جائے۔

صوفی کے پیغام رساں نے شہر کے صدر دروازے کے سامنے والا میدان اس مبارزت کے لیے نامزد کیا اور وقت کا تعین بھی کیا۔
تیمور کے سرداروں نے یہ تجویز پسند نہ کی۔ خصوصاً بابی کی جوک کے لڑکے بائین نے زور دار لہجے میں کہا:
"امیر! اب لڑنا ہمارا کام ہے۔ آپ کا مقام تخت اور چتر شاہی سے حکم صادر کرنا ہے اور مناسب نہیں کہ آپ اپنا مقام چھوڑیں"
ہر ایک نے اس مبارزت میں اس کی جگہ لینے کی درخواست کی۔ مگر اس نے ان کو خوارزم کے بادشاہ کے پیغام کی طرف متوجہ کیا کہ اس نے اُسے للکارا ہے اس کے افسروں کو نہیں للکارا۔ پیغام رساں سے کہا کہ وہ ضرور صدر دروازے کے باہر آئیگا اور اکیلا۔
جب مبارزت کے لیے جانے کا وقت قریب ہوا تو تیمور کے افسروں کے چہرے گھبراہٹ ظاہر کر رہے تھے مگر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اپنی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ ہلکی کڑی دار زرہ۔ بائیں بازو پر ڈھال، کمر بند اور تیغ اور سر پر سنہری کلغی دار آہنی خود، جب وہ لنگڑا کر باہر گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جب وہ سوار ہو کر چلنے کو تھا بوڑھے زین الدین سے جذبات کی شدت نہ رک سکی اور افسروں کی صف سے نکل کر اس نے رکاب تھام لی اور درخواست کی کہ امیر ایک عام سپاہی کی حالت میں لڑنے نہ جائے۔ امیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ تلوار نکال کر چپٹی طرف سے اس پر وار کیا۔ زین الدین وار بچانے کی غرض سے پیچھے ہٹا اور گر پڑا۔
تن تنہا وہ اپنے معسکر سے روانہ ہوا۔ منجنیقوں کی قطاروں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا اور ہزاروں سپاہیوں کی خاموش نگاہوں کے سامنے سے گزر کر درمیانی

میدان میں صدر دروازے کے سامنے پہنچا۔

صدر دروازے پر جیوا والوں کا جو ہجوم تھا انھیں مخاطب کر کے تیمور نے کہا:

"اپنے بادشاہ یوسف صوفی سے کہو کہ امیر تمہارا منتظر ہے۔"

یہ تھی تیمور کی طبیعت۔ دلیر، نڈر، ضدی اور صاحبِ عزم تیمور، امیر ماوراء النہر اب بھی رزم کا دلدادہ تھا۔ اسے کسی نتیجے کی فکر نہ تھی۔ وہ اپنی طبیعت اور خواہش کے سوا کسی شے کی پروا نہ کرتا تھا۔ اپنے کمیت گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہزاروں کمانوں کا نشانہ۔ وہ اب بھی وہی عہدِ شباب کا نوجوان تیمور تھا جو اپنے دشمن کے انتظار میں گھنٹوں گزار دیا کرتا تھا۔ اس روز کے ردِ عمل نے ہمارے سامنے اصلی تیمور پیش کیا ہے۔ اس ایک واقعے سے اس کی جملہ خوبیاں، اولوالعزمیاں اور خامیاں پوری طرح عیاں ہوتی ہیں۔

یوسف صوفی باہر نہ نکلا۔ تیمور تنگ آ گیا اور للکار کر کہا:

"جو اپنے عہد کا ایفا نہیں کرتا اس کی سزا موت ہے۔"

اُس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور آہستہ سے اپنے معسکر کو چلا۔ وہ ضرور غصے میں ہو گا مگر اس کے تمام امیر، سردار اور افسر اس کے استقبال کو آگے بڑھے۔ ہزاروں کے لشکر سے نعرے بلند ہوئے۔ نقارے پر ضرب پڑی اور ہزاروں گھوڑے ہنہنائے۔ ظاہر تھا کہ لشکر نے اس واقعے کو کس رُخ سے دیکھا تھا۔

تیمور کے الفاظ کو شاید تائیدِ غیبی میسّر تھی۔ یوسف صوفی جلد ہی بیمار پڑ گیا اور اس کے مرنے پر شہر کے دروازے کھول دیے گئے۔ فیصلہ ہوا کہ صوفی کی لڑکی خان زادی کو فاتح معسکر میں جہانگیر کی دلہن کے طور پر روانہ کیا جائے۔ خوارزم کو ایک صوبہ بنا کر تیمور کے بڑے لڑکے کو وہاں کا حاکم بنایا گیا۔ یوں بادشاہ گر کی مملکت کو مغرب اور شمال میں وسعت دی گئی اور غربی جلا بر ماوراء النہر کے

نسبی بھائیوں کے ساتھ ملحق ہو گئے۔

تیمور اب جنوب کی جانب دریا پار کے پڑوسی کی طرف روانہ ہُوا۔ اس مرتبہ اس کی فوج کی تعداد پہلے سے زیادہ تھی۔ کم از کم پچاس ہزار کی فوج کے قدموں کی بازگشت اس تنگ گھاٹی میں گونجی جسے آہنی دروازہ کہا جاتا ہے۔ ان کی باربرداری ان کے پیچھے پیچھے گاڑیوں پر آ رہی تھی۔

اس بار بھی حسب دستور معاملہ سفیروں کی آمد و رفت کے بعد شروع ہُوا۔ ہرات کا ملک نوجوان غیاث الدین تھا۔ غیاث کے باپ نے ایک بار بادشاہ گر کے پاس پناہ لی تھی اور تیمور اپنے آپ کو بادشاہ گر کا جائز وارث سمجھتا تھا۔ تیمور نے غیاث الدین کی طرف سالانہ مجلس میں شرکت کرنے کے لیے پیغام بھیجا۔ ظاہر تھا کہ تیمور اسے بھی طور پر باجگزار کی حیثیت سے بلانا چاہتا تھا۔

ہرات کے حکمران نے سمرقند آ کر مجلس میں شرکت پر خوشی کا اظہار کیا بشرطیکہ سیف الدین اس کے ہمراہ جانے کے لیے ہرات کو شرف بخشے۔ تیمور نے اپنا بزرگ ترین امیر ہرات روانہ کیا مگر وہ تنہا واپس چلا آیا اور تیمور کو بتایا کہ ملک نے محض بہانہ بنایا تھا اور وہ سمرقند آنا نہ چاہتا تھا۔ حقیقت میں وہ ہرات کے گرد ایک نئی فصیل تعمیر کرنے میں مصروف تھا۔

تیمور نے ایک اور سفیر روانہ کیا۔ اسے غیاث الدین نے روک لیا۔ اب تاتاری علم بلند کر لیے گئے اور خود پوش جوان جنوب کو روانہ ہو گئے۔ دریائے آمو پر کشتیوں کا پل تعمیر کیا گیا۔ اس مرتبہ جنگ تاتاری ممالک سے باہر تھی اور جوش و خروش کا نیا عالم تھا۔ موسم بہار تھا اور چراگاہوں میں سبزہ سبز گھاس کی فراوانی تھی تاتاری اپنے گھوڑوں کو چراتے ہوئے پہاڑوں کی جانب بڑھتے۔ دروں سے گزر کر وہ فوشنگ کی طرف ہو لیے۔ فوشنگ کے مقام پر مضبوط قلعہ تھا اور غیاث الدین نے

اسے اچھی طرح محفوظ کر رکھا تھا۔ تیمور نے انتظار کی زحمت کو بیکار سمجھا اور پہنچتے ہی حملے کا حکم دے دیا۔ خندق کے اوپر لکڑی کے تختے ڈال کر اسے عبور کیا اور تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کے باوجود کمندیں ڈالنا شروع کر دیں۔

اپنے جوانوں کو جوش دلانے کے لیے تیمور خود اگلی صف میں شامل تھا۔ اس روز اس نے زرہ نہ پہنی تھی۔ دو بار تیروں سے زخمی ہوا۔ کمند اندازوں میں شیخ علی اور مبارک جس نے اسے کھینچ کر نیچے گرا دیا تھا اور ایلچی بہادر کالڑ کا سابق کی طرح مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ طبل کی آواز کے ساتھ ساتھ تاتاری فصیل کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ دفعتہً کچھ آدمیوں نے شہر میں جاتی ہوئی نہر کو بھی ڈھونڈ لیا۔ وہ پانی کے بیچوں بیچ سے گزر کر برہنہ تلواریں لیے شہر میں داخل ہو گئے۔ اس دوران میں فصیل میں بھی شگاف کر لیا گیا تھا اور دیوار کا ایک حصہ بھی دشمن سے خالی ہو چکا تھا۔ بہت جلد فوشنگ میں قیامت کا نقشہ تھا۔ مقامی فوج اور اہل شہر بے تحاشا ہر طرف بھاگے جا رہے تھے۔

فوشنگ کی فتح نے ہرات والوں کی ہمتیں پست کر دیں۔ غیاث الدین نے جب دیکھا کہ اس کے حفاظتی دستے بھی تیمور کے آگے نہیں رک سکے تو اس بدبخت نے صلح کے لیے شرائط پیش کرنا شروع کر دیں۔ تیمور کا رویہ نہایت مشفقانہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ نہایت عزت سے پیش آیا اور اسے سمرقند روانہ کر دیا۔ شہر سے تاوان وصول کرنے کے بعد نئی فصیل کو گرا دیا گیا۔ ہرات کے دروازے شہر سبز منتقل کر دیئے گئے اور ملک کے زر و جواہرات، سونا چاندی، ہیرے اور خاندان کا پرانا سنہری تخت بھی۔

ہرات کی فتح سے تیمور کی مملکت میں ایک اور شہر شامل ہو گیا۔ یہ واقعی مرکزی شہر تھا۔ اس کی گولائی نو ہزار فٹ سے زائد تھی اور اڑھائی لاکھ کی آبادی تھی

تاتاریوں نے جب حساب لگایا تو دیکھا کہ شہر میں کئی سو مدرسے تھے تین ہزار حمام اور تقریب
قریب دس ہزار دکانیں تھیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب لندن اور پیرس میں سے کسی میں بھی
ساٹھ ہزار سے زائد باشندے نہ تھے۔ گو اس وقت پیرس میں مکتب موجود تھے، البتہ
لندن کے متعلق تاریخ کسی مکتب و مدرسہ کا ذکر نہیں کرتی مگر تاتاری سب سے زیادہ ان چکیوں
کو دیکھ کر حیران ہوئے جو پانی کے بجائے ہوا سے چلتی تھیں۔

تاریخ دان کہتا ہے، تیمور کی اس فتح کے بعد اس کی مملکت اس قدر محفوظ ہو گئی تھی
کہ عیش و آسائش کے سوا اس کا کوئی دشمن نہ تھا۔ یہ قریب کی جنگیں یعنی جاٹوں کی طاقت
کو ملک سے نکال باہر کرنا، صوفی یوسف اور ملک غیاث الدین کی شکست ایک لحاظ
سے خانگی معاملات کا سلجھانا تھا۔ ان میں جرأت و دلیری اور تدبیرات کا دخل ضرور تھا،
البتہ ان میں تزویراتی عنصر مفقود تھا۔ ان جنگوں کے نتیجے سے یہ ضرور ثابت ہوا کہ تیمور
فوق العادہ کماندار اور قائد تھا اور اس کی دور اندیشی بھی مسلّم تھی۔ اس نے قریب کی ان
تمام طاقتوں کو زیر کرنے میں دیر نہ کی تھی جو اس سے الجھ کر اسے بیکار کر دیتیں۔ اوائل
ایام میں ملک ہرات کی طاقت تیمور سے بہت زیادہ تھی۔ اگر کئی سال پیشتر وہ حسین
کی طاقت سے بھاگ کر ہرات کے ملک کے پاس پناہ گزیں ہو جاتا اور کرشی کا رُخ
نہ کرتا تو کون جانتا ہے کہ تاریخ کے اہم واقعات کون سا رُخ اختیار کرتے۔ مگر ان باتوں
میں جانے سے کیا حاصل؟

اب تیمور ایک زبردست طاقت بن چکا تھا۔ اس میں فتوحات کا جذبہ تھا اور
اس موقع پر اس کا جوش و خروش عین شباب پر تھا جب بلخ میں وہ سفید نمدے کے
فرش پر متمکن ہوا تھا اس وقت اس کی عمر چونتیس سال کی تھی۔ یہ واقعہ ۱۳۶۹ء کا ہے
اس عہد میں تیمور کی مملکت کے چاروں طرف جنگ کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ گزشتہ
صدی میں چنگیزی سیلاب کی سیاہ دبا جو مشرق سے مغرب تک پھیلی تھی اس کے اثرات

ابھی تک موجود تھے۔ ملک ملک میں پرانے خاندان مٹ رہے تھے اور نئے حکمرانوں کے خاندان وجود میں آ رہے تھے اور تو اور کاروانوں کے نئے نئے راستے معلوم کیے جا رہے تھے۔ فوجی معسکروں کی زندگی قابلِ فخر بھی تھی اور عزت و دولت کا موجب بھی۔ سرسبز کھیتوں کو روندتے ہوئے شہسوار گزر جاتے۔ آباد بستیاں ایک لمحے کے لیے آگ کے شعلوں سے روشن ہو کر ظلمت کا سیاہ لبادہ اوڑھ لیتیں اور کسی کو اُف تک کرنے کی مہلت نصیب نہ ہوتی۔

یہی تھا کہ تیمور اس وسیع تر پس منظر میں داخل ہو کر ان نت نئے بدلتے ہوئے نقشوں میں اپنی خواہش کے رنگ بھرتا۔

دوسرا حصّہ

سمرقند

حالات کا تقاضا تھا کہ تیمور اب اپنا دربار سمرقند لے جاتا۔ ماوراءالنہر کی سرزمین میں شہر سبز سے زیادہ دلکش اور روح افزا مقام کوئی نہ تھا مگر اب تیمور کی مملکت پھیل چکی تھی۔ حدود بڑھ کر سمرقند سے ہر جانب پانچ سو میل دُور جا پہنچی تھیں۔ شمالی راستے کی روک تھام سمرقند ہی سے ہو سکتی تھی۔ امورِ مملکت کے تقاضوں کی وجہ سے شہر سبز کو اس عزت و عظمت سے سمرقند کے حق میں دست بردار ہونا پڑا۔

دربار منتقل کرنے سے پہلے تیمور نے اپنے وطنِ عزیز کو سجانے کی کوشش ضرور کی۔ باپ کی قبر پر اُس نے ایک مزار تعمیر کرایا اور اس کے گنبد پر سنہری کام کرایا۔ مٹی کا وہ پرانا محل جہاں الجائی کے حسن نے زندگی کو حسین و رنگین بنایا تھا گرا دیا گیا اور اس کی جگہ مضبوط اور بلند کاخ شاہی نے لی جس کے صدر دروازے کی محراب دُور سے نظر آتی تھی۔ اس کی ساخت سفید اینٹ کی تھی۔ تاتاریوں نے اسے "آق سرائے" یعنی سفید محل کا نام دیا۔ جب کہیں وہ ملک سے باہر مہمات میں برسرِ پیکار نہ ہوتا تو موسم سرما یہیں گزارتا۔ اسے اس وادی سے عشق تھا۔ سرسبز گھاس سے لدی ہوئی چراگاہوں پر جب موسم سرما کا سورج پڑتا تو ان کی سبز چمکیلی سطح پر دُور کوہِ سلیمان کی برفانی چوٹیوں کا عکس پہاڑوں کی دھند میں تیرتا ہوا نظر آتا۔ سُرخ، سفید اور سبز، یہ تینوں رنگ مل کر ایک عجیب ہی منظر پیش کرتے۔

تاریخی روایات تیمور کو سمرقند کے بوسیدہ خدوخال میں لے گئیں۔ یوں تو بخارا ابھی موجود

تھا۔ وہاں مدرسے، مکتب، کتب خانے اور علومِ شرقی کے ماہر بھی تھے۔ اس وقت بخارا، سمرقند سے بڑا شہر تھا مگر اسے تاریخی حیثیت حاصل نہ تھی۔ سمرقند ہی میں سکندرِ اعظم نے کلائیٹس کا کام تمام کیا تھا اور تیمور سے ڈیڑھ سو سال قبل چنگیز خاں نے اپنے بے پناہ لشکر کا اجتماع بھی یہیں کیا تھا۔

ابنِ بطوطہ جس نے مارکوپولو سے کہیں زیادہ ممالک کی سیاحت کی تھی، سمرقند کے متعلق لکھتا ہے: "یہ بہت بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ از حد پُر شکوہ اور نہایت شاندار۔ یہ جس دریا کے کنارے پر واقع ہے اس کا نام کھاروں کا دریا ہے۔ دریا کے کنارے لاتعداد پن چکیاں ہیں اور نہروں سے پانی کھینچ کر باغات کو سیراب کیا جاتا ہے۔ لوگ مغرب کی نماز کے بعد چہل قدمی کے لیے دریا کے کنارے بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔ یہاں نشست گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے جھروکوں میں کھڑے ہو کر دریا کے نظارے سے آدمی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے محلات اور تاریخی مقامات ہیں جن سے اس ملک کے باشندوں کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ شہر کا بیشتر حصہ برباد ہو چکا ہے۔ اب نہ تو شہر پناہ موجود ہے نہ شہر کے دروازے ہی۔ شہر کے باہر اب باغات بھی ہیں۔"

یہ تھا سمرقند جہاں تیمور نے اپنا دربار منتقل کیا۔ کوہستان کی قابلِ برداشت گرمی شمالی علاقوں کی خنک اور ٹھنڈی ہوا اور عہدِ رفتہ کی عظمت کی یاد سمرقند کے باشندوں کے شب و روز میں سکون سا پیدا کرتی رہتی تھیں۔ زمین زرخیز تھی۔ سال میں چار فصلیں اٹھائی جاتی تھیں۔ نہروں کا پانی با افراط تھا۔ ہر گھر میں سے نہر کا پانی گزرتا تھا اور صحن پھولوں سے بھرے رہتے تھے۔ وہ مشقت کے بغیر ہی دنیا کی ضروریات پوری کر سکتے تھے۔ ان کی کرگھیں قرمزی اور دوسرے کپڑے بنانے میں تمام دن چلتی رہتی تھیں۔ ان کپڑوں کی مانگ دنیا میں بہت تھی۔ قرمزی رنگ اسی کپڑے سے دنیا میں پھیلا۔

انگریزی زبان کا کرمزن (CRIMSON) بھی اسی کپڑے کے رنگ سے لیا گیا ہے۔ ان کی آبی گھڑیاں ان کے اوقاتِ شغل اور تفریح میں فرق معلوم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی تھیں۔ شاید یہ ان کی اپنی ہی تخلیق تھی۔ ان کا کاغذ دنیا میں بہترین مانا جاتا تھا۔ دنیا جہان کے گوشے گوشے سے چل کر کاروان سمرقند کی راہ پر ہو لیتے۔ بازار سے گزرتے ہوئے کسی محراب کے سایے میں انجم شناس کی مختصر سی دکان کے سامنے بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق معلومات حاصل کرنا بھی تفریح میں شامل تھا۔ دو قدم چل کر بازی گر کی کرتب دیکھنے میں بھی چنداں مضائقہ نہ تھا۔ یہ سب کچھ خدا نے انسان کو خوش رکھنے ہی کے لیے تو بنایا تھا۔ اور کھنڈر ان کا معاملہ بھی کچھ مشکل نہ تھا۔ ان کا قول تھا "خدا نے جو کچھ کیا ہے انسان کی بہتری کے لیے کیا ہے۔"

تیمور کی پذیرائی کے لیے وہ جوق در جوق شہر کے باہر آئے مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ انھوں نے اسے شیر ببر، فاتح اور شاہِ بلند بخت، کے خطابات دیے۔ اس کی شان و شوکت نے ان کی آنکھیں کھول دیں مگر انھیں یاد تھا کہ صرف دس سال قبل وہ وہاں سے ایک سایے کی طرح گزرا تھا۔ معمولی سا بادل جس کو ہوا اڑا کر لے جاتی۔ نہ معلوم کہاں سے آیا تھا اور کدھر چلا گیا۔ انھیں یہ بھی یاد تھا کہ وبا کی مدد سے انھوں نے نہایت زبردست دشمن، جاٹ مغلوں کو بھگا دیا تھا۔ وہ خوش تھے نہایت خوش۔ ریشمی عباؤں والے امراء، زینوں کے تاجر، نفیس و رنگین برتنوں والے، گھوڑوں کے سوداگر اور بردہ فروش۔ تیمور نے تمام لگان معاف کر دیے۔ مگر اس نے بیگار لازم قرار دی۔

اس کے زیر اہتمام شہر پناہ کے شگاف درست کیے گئے اور شہر کے دروازوں کو مضبوط کیا گیا۔ دروازوں سے بازار تک کشادہ سڑکیں بنائی گئیں۔ سڑکوں کے فرش پر پتھر بچھا دیے گئے اور جنوب کی سمت پہاڑی سے تمام بوسیدہ مکان اور جھونپڑیاں

مثالی حصار کی بنا ڈالی گئی۔

شہر کے مضافات میں جہاں فوجی معسکر قائم کیا گیا تھا وہاں چھاؤنی کی بنا ڈالی گئی۔ کشادہ سڑکوں کا جال ہر طرف پھیلا دیا گیا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باغات لگائے گئے اور ان کے گرد دیواریں چن دی گئیں۔ دُور فاصلے پر جو نیلے رنگ کے پہاڑ تھے وہاں سے پتھر بیل گاڑیوں پر لاد کر لائے گئے اور ہر طرف وسیع محلوں کی بنا ڈالی گئی۔ ملک ملک اور شہر شہر سے فنکار کھنچ کر سمرقند میں آنا شروع ہوئے۔ سفیروں اور غیر ملکی نمائندوں کی آمد شروع ہوئی اور شہر کی رونق کہیں سے کہیں جا پہنچی۔

"تاتاریوں کا مرغوب رنگ نیلا تھا۔ آسمان کی بے اندازہ بلندیوں اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کا رنگ۔ دُور افق پر پہاڑوں کی لکیر اور ان میں بہتی ہوئی صاف شفاف ندیوں کا رنگ۔ تیمور نے ہرات کے گنبدوں کی نیلی سطح بھی دیکھی تھی۔ اس نے سمرقند کی پرانی مٹیالی رنگ کی اینٹوں کے بجائے اب کاشی کی نیلی اینٹوں کے استعمال کا حکم دیا۔ جس میں سفید اور سنہری مینا کاری عجیب دلکشی پیدا کرتی تھی۔

سمرقند کو لوگ اب 'گرگ کنڈ' نیلا شہر کہنے لگے۔

سمرقند کے باشندوں کو محسوس ہوا کہ یہ بادشاہ سابق بادشاہوں سے مختلف تھا۔ 'فولادی پنجے میں' یعنی تیمور کے ہاتھوں میں، ایک ضرب المثل بن گئی۔

جب وہ خیابانوں میں سے گزرتا تو لوگ راستہ چھوڑ دیتے۔ صبا رفتار گھوڑوں پر زریں اور نیلے ریشم کے لباسوں کی جھلکیاں اڑتی ہوئی گرد کے درمیان سے دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ ہمیشہ اس کے سپہ سالار اور زیرک و معاملہ فہم وزراء اپنے گھوڑوں پر موجود ہوتے۔ اب وہ بات نہ تھی جو سابقہ بادشاہوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ جب وہ مسجد سے نکل کر بلند محراب کے نیچے بالائی سیڑھی پر کھڑا ہوتا، علماء اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے اور گداگر اس سے بھیک مانگ رہے ہوتے تو سمرقند کے

ان باشندوں کی ہمت نہ پڑتی کہ داد خواہی کے لیے اس کے سامنے پیش ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ امیر صرف ان لوگوں کی باتیں صبر و ضبط سے سننے کو تیار ہوتا ہے جنھوں نے جنگی خدمات پیش کی ہوں۔ اگر ایک شہری دوسرے کے خلاف داد طلب ہو تو ان میں سے ایک کے سر کے خاک میں لوٹنے کا احتمال بلکہ امکان تھا۔

اہلِ سمرقند نے خان زادی کی آمد کو برسوں یاد رکھا۔ اُرگنج کے ترکمان بادشاہ کی لڑکی کی پذیرائی انتہائی شان و شوکت سے کی گئی تھی۔ مغربی دروازے کا خیابان قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا اور تیمور کے معسکر کے فرش پر کمخاب اور اطلس کے تھان بچھے ہوئے تھے۔ اس کے استقبال کو مملکت کے وزیر، امیر، تاواچی اور علمبردار علم اور چتر شاہی لیے سجے ہوئے گھوڑوں پر دوڑ نکل گئے تھے۔

اس شام کی یاد تازہ رکھنے کے قابل تھی۔ غروب آفتاب کے وقت ہوا شامیانوں کو لوریاں دیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ درختوں میں رنگین چراغ رنگا رنگ کے پھولوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ صندل کی خوشبو خیموں کی چوبوں کے قریب سے اٹھ کر چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ تیمور مہمانوں کی قطاروں کے درمیان پھر رہا تھا اور اس کے غلام مہمانوں کی دستاروں میں موتی اور جواہرات بکھیر رہے تھے۔

مؤرخ لکھتا ہے: "ہر شے مسحور کُن تھی۔ وہاں غم و اندوہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ بڑے شامیانے کی چھت آسمان کی صورت نیلے رنگ کی بنائی گئی تھی جس میں ہیروں کی چمک ستاروں کے ٹمٹمانے کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ دلھن کا کمرہ کمخاب اور زربفت کے پردوں سے تقسیم کیا گیا تھا اور اس کا پلنگ عہدِ قدیم کی شہزادی قدسیہ کے پلنگ کی طرح خوبصورت تھا۔"

جہیز اور تحائف جو خان زادی اپنے ساتھ سسرال لائی تھی، وہ حسبِ دستور دکھائے گئے۔ تیمور نے ساتھ کے کمرے میں وہ تحائف سجا کر رکھوائے جو جہانگیر کی

طرف سے دلھن کو پیش کیے گئے تھے۔ زریں کمر بند، زر و جواہرات، لعل و گہر، مشک نافہ، کمخواب، اطلس اور ململ کے تھان، قیمتی لبادے، بہترین گھوڑے اور حسین و جمیل کنیزیں
راوی ان تحائف کی تفصیل پیش کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ہر روز ایسا ہی ایک کمرہ خالی کر دیا جاتا اور ایک اور کمرہ سجا دیا جاتا۔

کون جانتا ہے کہ تیمور نے جب جہانگیر اور خوارزم کی سیاہ زلفوں والی حسین شہزادی کی طرف اس شام دیکھا تو اس کا ذہن الجائی کی آمد کی طرف نہ گیا ہوگا۔ جب اس کی غمگسار رفیقہ جنگی طبل و نقارہ کی آوازوں بھرے معسکر میں اس کے پاس پہلی بار آئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آگیا ہوگا کہ ایک روز صحرا میں اس نے مسکرا کر کہا تھا:

"میرے سرتاج! اس سے زیادہ بدبختی کیا ہو سکتی ہے کہ اب آپ پیدل چل رہے ہیں۔"

خان زادی کا بخت مختلف تھا۔ وہ جہانگیر کی پہلی بیوی تھی۔ جہانگیر ایک فاتح کا بڑا بیٹا تھا جس کا اپنا علیحدہ دربار تھا۔ وہ حسین تھی اور خوبرو، وہ بے دھڑک تیمور کے سامنے جو چاہتی کہہ سکتی تھی چاہے تیمور کو غصہ ہی کیوں نہ آجائے۔

"اے شاہِ معظم" اس نے کہا "فاتح وہ ہے جو شاہ و گدا کو یکساں طور پر بخش دیتا ہے جب وہ غلطی کے مرتکب ہوں تو عفو سے کام لیتا ہے اس لیے کہ جب دشمن معافی کا خواستگار ہو جاتا ہے تو دشمن نہیں رہتا۔ جب فاتح کوئی شے دیتا ہے تو وہ اس کا بدلہ نہیں چاہتا۔ وہ کسی ایک آدمی کی دوستی کا سہارا نہیں لیتا اور نہ وہ اپنے غصے کا بوجھ صرف ایک ہی دشمن پر ڈالتا ہے اس لیے کہ سبھی اس کے زیر ہیں اور وہ ان سب سے بلند و بالا۔"

"نہیں دخترِ نیک اختر! یہ بات نہیں" تیمور نے جواب دیا "امیر و وزیر، سردار اور شہزادے میرے حضور میں دست بستہ کھڑے رہتے ہیں مگر درویشوں سے میں

خوف کھاتا ہوں۔"

تیمور کو خان زادی کی عقلمندانہ گفتگو پسند آئی۔ وہ جانتا تھا کہ شہزادی اپنے ہم قبیلہ ترکمانوں کی برائت کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ جہانگیر اور خان زادی کی پہلی اولاد نرینہ ہو۔

اس دوران میں اس نے امیر حسین کی بیوہ سرائے خانم سے شادی کر لی تھی۔ یہ پرانی مغل رسم تھی کہ جب سردار قتل ہو جاتے تو اُس کی بیوی فاتح بادشاہ کے حرم میں داخل ہو جاتے اور سرائے خانم کی رگوں میں تو چنگیز خاں کا خون بھی تھا۔ وہ حقیقی معنی میں اس کی بیگم تھی۔ تیمور کی دیواروں کے اندر کی ملکہ۔ جب تیمور میدانِ جنگ میں ہوتا تو دربار اسی کے سامنے دوزانو ہوا کرتا۔ وہ سپاہیوں کے خاندان سے تھی اور اکثر شکار میں شامل ہوا کرتی۔ تیمور کی ذات سے اس کی وفاداری مسلّم تھی اور اس کی اس وفاداری سے تیموری خاندان کے بیٹوں اور پوتوں کے تعلقات وابستہ تھے۔

سمرقند کے لوگ تیمور کو بہت کم دیکھتے۔ مگر سانڈنی سوار یا سرحدی دستوں کے ذریعے اس کی خبر ہر روز دارالسلطنت میں پہنچ جایا کرتی تھی۔ جب کوئی شہر یا ملک فتح ہوتا تو تاوان لانے والے دستے جنگ کی تفاصیل ساتھ لاتے۔ اب ماوراءالنہر میں امن و سلامتی کا دور دورہ تھا۔ وہ ہر سال مغرب کی طرف کوچ کرتا۔ خراسان کی تاریخی شاہراہ کے ساتھ ساتھ نیشاپور سے گزر کر مشہد کے گنبدوں کو پیچھے چھوڑ جاتا اور اس دوسرے سمندر کے کنارے جا پہنچتا جسے بحیرۂ خزر کہتے ہیں۔ سمرقند میں خبر پہنچی کہ اس نے ان عجیب و غریب درویشوں کا خاتمہ کر دیا ہے جو سبزوار کے نام سے مشہور تھے اور جنھوں نے عرصے سے لوٹ مار اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔

اس کی شمالی مہم کے متعلق معلومات بہت کم تھیں۔ اس مرتبہ وہ جاٹ مغلوں

کے صدر مقام سے بھی آگے گزر گیا۔ سمرقند کی کارواں سراؤں میں اس وسیع و عریض صحرا کے قصے سنائے جانے لگے جہاں ریت کے تودے چلتے نظر آتے تھے اور جسے صحرائے گوبی کا نام دیا جاتا تھا۔ قمرالدین وہ آخری مغل تھا جسے تیمور کے مقابل رزم آرا ہونے کی ہمت ہوئی۔ اس کی طاقت اب ختم ہو چکی تھی۔ اور تو اور اس کا گھوڑا بھی پکڑ لیا گیا تھا اور اسے تن تنہا جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا۔

تیمور نے جہانگیر کو کہلا بھیجا "پہلی بار ہم نے صرف چنگاریاں بجھائی تھیں، اس بار ہم نے پوری آگ کو سرد کر دیا ہے"

جب وہ ختطا کی ایک ہزار میل لمبی مسافت طے کر کے لوٹا تو اہل سمرقند نے باغوں کے باہر اس کا استقبال کیا۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے اور فضا میں خاموشی تھی۔

سیف الدین، امراء کا سردار، دو بڑے سرداروں کے آگے آگے تیمور کی طرف بڑھا۔ سب نے اپنے لبادوں پر خاک ڈال رکھی تھی۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر تیمور نے باگ کھینچ لی۔ سیف الدین گھوڑے سے اُتر آیا۔ سر جھکائے تیمور کی طرف پاپیادہ بڑھا اور اس کی رکاب تھام لی۔

"کیا تم خوفزدہ ہو؟" تیمور نے پوچھا، پھر کہا "بولو سیف الدین!"

سیف الدین نے دبی زبان میں کہا "میرے دل میں خوف تو کوئی نہیں نوجوان شہزادہ ابھی اپنے شباب کے عروج پر تھا کہ اس نازک پھول کی طرح آپ سے چھین لیا گیا ہے جو باد تند کے جھونکوں سے اپنی ٹہنی سے جدا ہو جاتا ہے۔"

جہانگیر کی بیماری کی خبر تیمور کو نہ دی گئی تھی اور وہ باپ کے آنے سے چند روز قبل راہی عدم ہو چکا تھا۔ سیف الدین شہزادے کا مشیر بھی تھا۔ اسی کی ہمت تھی کہ امیر کو اس صدمے سے مطلع کرے۔

تسوار ہو جاؤ اور اپنا مقام لے لو" تیمور نے ایک لمحہ رک کر کہا۔
جب بوڑھا امیر سیف الدین اپنی جگہ جا چکا تو روانگی کا اشارہ دیا گیا اور آہستہ آہستہ لشکر آگے بڑھا۔ یہ خبر پورے لشکر میں آناً فاناً پھیل گئی اور دارالسلطنت کو فاتح فوج کی واپسی غم کے سایے میں ہوئی۔
جہانگیر کے طبل اور نقارے امیر نے اپنے سامنے منگوا کر ٹکڑے ٹکڑے کرا دیئے وہ کسی اور سردار کے علم کے سایے میں کس طرح بج سکتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے تیمور کے دل میں درد و غم کی لہر اٹھی اور اس کے فولادی ہونٹ بھنچ گئے۔
دنیا میں اسے جہانگیر سے عزیز تر شے کوئی نہ تھی۔ جہانگیر بہترین دوست اور ساتھی، الجائی کا بڑا لڑکا۔

سُنہری غول

اس وقت کے واقعات کو صحیح پس منظر میں دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک سو
سال قبل کے واقعات کا جائزہ لیا جائے اور کُبلائی خان پر روشنی ڈالی جائے۔
کُبلائی خان کے وقت کی مغل سلطنتوں پر بھی ایک نظر ضروری ہے۔

چنگیز خاں کی فتوحات اس سرعت سے وقوع پذیر ہوئی تھیں اور اتنی وسیع
تھیں کہ انھیں سنبھالنا کسی ایک انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہ درست کہ اس کا پوتا
کُبلائی خاں خانخان (خاقان) یعنی خانِ اعظم تصور کیا جاتا تھا مگر حقیقت میں وہ صرف
ختا کا حاکم تھا۔ اپنے دارالسلطنت کمبالو سے وہ صحرائے گوبی، چین اور کوریا پر حکومت
کرتا تھا۔ دوسرے ممالک میں چنگیز کے دوسرے پوتے حکمران تھے۔

یہ خانہ جنگی تھی، مسلسل، بے رحم و کرم اور اکثر و بیشتر بے نتیجہ۔ مغلوں کے اکثر
شہر قائم رہے اور ان کے درمیان تجارتی شاہراہوں پر قافلے چلتے رہتے تھے۔
شمال کی طولانی شاہراہ ماسکو سے روم تک جو سطح مرتفع سے گزر کر المیک سے
گزرتی ہوئی صحرا کو عبور کرنے کے بعد کمبالو پہنچتی تھی، اب بھی استعمال میں تھی۔ کُبلائی خان
سے ایک نسل بعد مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ جس نے مارکوپولو سے کہیں زیادہ
سیاحت کی تھی، وہاں گیا۔ سن ۱۳۴۰ء میں پاپائے روم بنائے دوازدہم کے پادری
بھی ختا کے خان کے دربار میں حاضر ہوئے۔ جاٹ خوانین کے دارالسلطنت المیک
میں ایک تبلیغی مشن موجود تھا۔ گو مغرب نے اسے بھلا دیا تھا پھر بھی وہ کامیابی سے

تبلیغ میں مصروف تھا۔

مغل سلطنتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ٹوٹ چکی تھی۔ جنوب میں ایل خاں بیت المقدس سے ہندوستان تک حاکم رہے تھے۔ ان ایل خان شہزادوں کے درباروں میں ۱۳۰۵ء تک مغربی ممالک کے سفیر حاضر ہوتے نظر آتے ہیں انگلستان کے ایڈورڈ اوّل، اراگان کے جیمس دوم، قسطنطنیہ کے یونانی بادشاہ اور آرمینیا کے حکمران کے سفیران دُور دراز ملکوں سے سفر کرکے "مغل خانِ اعظم" کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے شاہوں کے نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔

اس عرصے میں وہ عیش و عشرت سے کھوکھلے ہو چکے تھے اور ایرانی، عرب اور مملوک شہزادوں کے حملوں کی تاب نہ لا سکے اور مٹ گئے نتیجہ طوائف الملوکی تھا۔ اس دوران میں ختا کا مغل خاخان بھی چینیوں کے حملوں کی وجہ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا اور بالآخر اس کے زیر اثر صرف اس کا اپنا وطن صحرائے گوبی رہ گیا۔ چینی تہذیب نے ان کی طاقت چھین لی تھی اور وہ جنگ کے ڈھنگ بھول گئے تھے۔ حیران و پریشان مگر ضدی۔ اس کے بعد وہ کبھی کبھی چین کی شمالی دیوار کے شمال میں لوٹ مار کے لیے حملہ آور ہوتے مگر وہ فاتح بن کر پھر ان شاہراہوں پر نہ جا سکے۔

مغلوں کی سب سے چھوٹی شاخ جاٹوں کی تھی۔ یہ چنگیز خاں کے لڑکے چغتائی کی اولاد تھے۔ بادشاہ گر نے جاٹوں کی مملکت کا شمالی حصہ جو سمرقند کے اردگرد تھا ان سے چھین لیا تھا۔ اب ۱۳۷۵ء میں امیر تیمور نے انھیں ان کے وطن یعنی المالیک کے اردگرد کے پہاڑوں سے بھی نکال دیا تھا۔

تیمور اپنی شمالی مہم میں محض پہاڑیوں کی محکم دیوار ہی سے آگے نہ گیا تھا بلکہ ایشیا کی مشہور شاہراہ پر بھی قابض ہو گیا تھا۔ اسے شاید معلوم نہ تھا

اور ممکن ہے اسے اس نتیجے کی پروا بھی نہ ہو مگر اس نے شمال سے آنے والے حملوں کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دیا تھا۔ ہُن، ترک اور مغل سبھی اس شمالی سطح مرتفع سے آئے تھے۔ اس کی رگوں میں ان کا خون تھا اور اب وہ اپنے نسبی بھائیوں پر فائق ہو چکا تھا۔ تمدن بربریت کو صحرا کے اندرونی حصوں میں دھکیل چکا تھا۔

اس عاشرہ یعنی ۱۲۷۰ء سے ۱۲۸۰ء میں مغل مملکت کا تین چوتھائی حصہ نقشے سے غائب ہو چکا تھا اور شاہراہیں بند ہو چکی تھیں جو چوتھائی حصہ ابھی مغلوں کے زیر اقتدار تھا وہ نہایت محکم تھا۔ یہ حصہ تیمور سے شمال اور مشرق کی جانب تھا اور اسے سنہری غول کہتے تھے۔

چنگیز کے بڑے لڑکے جوچی نے یہ جمعیت اپنے گرد اکٹھی کی تھی۔ اسے سنہری غول کا نام اس لیے دیا گیا تھا کہ جوچی کے لڑکے عظیم الشان باتو نے اپنا گنبد نما خیمہ سنہری کپڑے سے مزین کیا تھا۔ مغل خاندان کی یہ شاخ پھلتی پھولتی رہی تھی۔ روس اور وسطی ایشیا کے وسیع اور ویران میدان ان کی جولانگاہ تھے۔ یہ ہمیشہ ان میدانوں میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہتے اور بڑھتی ہوئی دولت کے بل بوتے پر ڈیڑھ سو سال تک یورپ کو تنگ کرتے رہے۔

تیمور کی ولادت کے وقت سنہری غول اپنی عظمت کے عروج پر تھا کھلے میدانوں کی زندگی لوٹ مار اور جنگ کے ماحول نے اس خانہ بدوش قبیلے کو ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند رکھا۔

وہ ٹنڈرا کے برفانی میدانوں میں ہمیشہ پھرتے رہتے۔ عورتیں اور بچے غلاف دار بیل گاڑیوں میں بیٹھے رہتے اور مرد گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ سفر کرتے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پورے شہر کے شہر پا بہ رکاب ہیں۔ چلتی گاڑیوں میں خورد و نوش کا انتظام ہوتا رہتا اور چولھے جلتے رہتے۔ نمدے کے گنبد میں خیموں کی مسجدیں اپنے

سنہری غول

جھنڈوں کے ساتھ چلتی رہتیں بعض اوقات وہ شمال میں بہت دُور نکل جاتے اور ایک چوبی قلعے میں بسیرا کرتے جہاں نیلے رنگ کے جنگل چراگاہ کی حد فاصل بنے ہوئے تھے۔

ان کا مذہب غیر واضح سا تھا۔ ابھی بت پرستی پوری طرح مٹی نہ تھی۔ ملا کے ساتھ ہی لمبے بالوں والے شمن بتوں کو کمر سے لٹکائے بیٹھے ہوتے اور ملاریوں کے ریچھ مسجدوں کی گاڑیوں کے پیچھے سونے سے نہ کتراتے۔ ان کے پاس لاتعداد گھوڑے تھے۔ ان کی بھیڑوں کی تعداد اور رکھوالے کتوں کی تعداد کا قیاس کیا جا سکتی تھی۔

صرف حکمران خاندان مغلوں کے تھے۔ باقی ماندہ اس شمالی علاقے کے کثیر النسل باشندے تھے جسے دنیا "جہانِ سیاہ" کے نام سے موسوم کیا کرتی ہے ان کے نام بھی عجیب و غریب ہوتے تھے۔

"مائی پر بورین" "کپ چاک" (صحرائی) "کنکائی" (اونچی گاڑی) "قازق" "کرغز" "مردوا" "بلگر" اور "آلان"۔

ان میں بیرونی دنیا کے لوگ بھی تھے۔ جینوا کے تاجر، یورپ کے سیاح، چند ارمنی اور روسیوں کی بہت بڑی تعداد۔ ان میں ترک اور تاتار زیادہ تعداد میں تھے مگر سب مل جل کر "سنہری غول" کہلاتے تھے۔

وہ تیموری تاتاریوں کے پچھڑے بھائی کہے جا سکتے ہیں۔ ترچھی آنکھیں، پتلی ڈاڑھی، متلون مزاج، عیاش اور زود گیر۔ وہ سمور کی کھالیں اور ریشمی صدریاں پہنتے تھے اور ان کی زرہ نہایت اعلیٰ قسم کی ہوتی تھی۔ ان کی بربریت ان کے ہمعصر روسیوں سے البتہ بہت کم تھی۔ وہ سکے بھی ضرب کرتے تھے مگر صرف اس لیے کہ روسی ان سکوں میں اپنا خراج پیش کر سکیں۔ روسیوں کو وہ گننے کی تختیاں بھی دیتے تاکہ صحیح رقم کی ادائی ہو سکے۔ وہ کاغذ بھی بناتے تھے تاکہ

روسی شہزادوں کے ساتھ معاہدے رقم ہو سکیں۔

روس پر وہ اپنے دُور دراز ملک سے حکومت کرتے تھے۔ روس کی جانب ان کے قریب ترین شہر والگا کے کنارے سرائے اور استراخان تھے۔ روسی شہزادے اپنا خراج اور تحائف لے کر مغلوں کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ روس کی حدود کے اندر وہ صرف ان موقعوں پر داخل ہوتے جب خراج کی ادائی میں کوتاہی برتی جاتی۔ ایسے حالات میں خون کے دریا بہتے۔ آگ ہر شے کو لپیٹ میں لے لیتی اور جو چیز انھیں پسند آتی وہ ان کی خرجیوں میں چلی جاتی۔

یورپ کا سیاسی توازن ان کے ہاتھ میں تھا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا جب وہ ایک خان کی قیادت میں پولینڈ کے مرکز تک جا پہنچے تھے۔ اس خان نے یونانی بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ان کے دربار میں سرائے کے مقام پر وینس اور جینوا کی تجارتی شرکتوں کے نمائندے جایا کرتے۔ ان کے تجارتی اڈے پوری مغل مملکت میں پھیلے ہوئے تھے۔

روس کی سمت ان کی طاقت صرف ایک بار روکی جا سکی تھی۔ ماسکو کا شہزادہ ڈمٹری ان کے مقابلے میں ڈیڑھ لاکھ کی جمعیت لے کر میدان میں اترا تھا اور دریائے ڈان کے کنارے سنہری غول کے سردار ماما ئی کے سامنے اپنے علم بلند کیے تھے۔ روسیوں کے لیے یہ دن نہایت شاندار تھا۔ مگر یہ خوشی دیرپا نہ تھی۔ وہ بہت جلد یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

"ہم نے تلوار اٹھائی اور کامیاب ہوئے مگر ہم اپنے آباؤ اجداد سے زیادہ نقصان میں رہے جو اپنی گردنیں جھکائے رہتے تھے۔"

سنہری غول کا شہزادہ توک تمیش جو کریمیا کا حکمران تھا اپنی قوم سے خفا ہو کر علیحدہ ہو گیا اور تیمور کے پاس جا کر پناہ لی۔ اس کے پیچھے پیچھے سفید گھوڑے

پر سوار ایک مغل شہزادہ سفیر بن کر آیا۔

"اے تیمور لنگ[1]" سفیر نے کہا "اُدروس خان حاکمِ شرق و غرب نے یہ پیغام دیا ہے۔ اُدروس خان حاکم سرائے و استراخان جو نیلے غول اور سفید غول کا خان ہے یوں کہتا ہے۔ توک تمیش نے میرا لڑکا قتل کیا ہے اور تمھارے پاس آکر پناہ لی ہے، تم اسے میرے حوالے کر دو ورنہ میں تم سے جنگ کا اعلان کر دوں گا اور میدانِ جنگ کا انتخاب ہو گا!"

تیمور کو یہ منظور تھا۔ اس کی فتوحات پہلے ہی غول کی سرحدوں میں داخل ہو چکی تھیں اور مقابلہ ناگزیر تھا۔ چنگیز خاں کی اولاد میں سے ایک شہزادے کا اس کے دربار میں موجود ہونا خوش قسمتی تھی۔ بہر کیف کچھ بھی ہوتا تیمور کسی صورت بھی ایسے آدمی کو نہ دیتا جس نے اس کے پاس پناہ لی تھی۔ اس نے سفیر کو جواب دیا:

"توک تمیش نے میرے پاس پناہ لی ہے۔ میں اسے تمھارے ہاتھوں سے بچاؤں گا۔ اُدروس خاں سے جا کر کہ دو کہ میں نے اس کے الفاظ سن لیے ہیں اور میں تیار ہوں۔"

اس نے توک تمیش کے لیے جشن منعقد کیا اور اسے بیٹا کہ کے پکارا۔ شمالی سرحد پر دو قلعے اس کے حوالے کیے اور ضرورت کے مطابق افسر اور سپاہی

---

[1] اپنی مملکت سے باہر تیمور کو تیمور لنگ کہ کے پکارتے تھے۔ صرف وہ حکمران ایسے تھے جنھیں تیمور کو تیمور لنگ کہ کر مخاطب کرنے کی ہمت ہوئی۔ ان میں سے ایک اُدروس خان تھا۔ اس وقت اُدروس خان سفید غول کا خان تھا جو سنہری غول کے مشرق کی طرف تھا اور جس کا خان ماماؤں ابھی زندہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد دونوں خاندان توک تمیش کے نیچے متحد ہو گئے۔

مہیا کیے۔ یہ دونوں شہر اتفاقاً غزلوں سے لیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ تیمور نے اسے ہتھیار، زر و جواہر، اونٹ، گھوڑے، خیمے، نقارہ و طبل اور علم بھی عطا کیے۔

یوں کیل کانٹے سے لیس ہو کر وہ شمال کو بڑھا مگر غزلوں نے اسے بری طرح شکست دی۔ تیمور نے اسے دوبارہ ہرشے دی مگر دوبارہ وہ بھاگنے پر مجبور ہوا۔ مشکل سے وہ تیمور کے اپنے گھوڑے "ابیر خاکی" پر سیر دریا عبور کرنے میں کامیاب ہوا۔ زخموں سے چور وہ جنگل میں چھپ گیا مگر تیمور کا ایک برلاس افسر اسے دربار تک لے آیا۔ پھر یک بیک قسمت کا پانسا پلٹ گیا۔

اور وس خاں مر گیا۔ اب توک تمیش سنہری غول کی سرداری کا خواہاں تھا۔ آدھے کے قریب قبیلے اس کے حق میں تھے۔ مزید برآں تیمور کی فوجوں کی مدد بھی اسے میسّر تھی۔ اب وہ فتوحات سے لذت آشنا ہونے لگا۔ وہ حد درجہ ظالم تھا اور ضمیر کی ملامت سے نا آشنا۔ سطح مرتفع پر وہ کالی آندھی کی طرح چھا گیا۔ اس نے ماما ئی کو نکال باہر کیا اور والگا کے کنارے سرائے کے تخت پر متمکن ہو گیا۔

اس نے روسی شہزادوں سے خراج کا مطالبہ کیا مگر وہ دو سال قبل کی فتح کے گھمنڈ میں تھے۔ خون اور آگ سے اس نے انھیں بیکار کر دیا اور جلتی ہوئی آبادیوں کے شعلوں میں سے گزر کر اس نے ماسکو کا رُخ کیا۔ ماسکو کا محاصرہ آگ، دھوکا اور بربادی۔ عظیم شہزادہ اپنے کیے پر پچھتا رہا تھا۔ سرائے کے مقام پر توک تمیش کے دربار میں روسی شہزادوں کے لڑکے پابجولاں پہنچے اور وینس و جینوا کے امراد تجارت کے اجازت ناموں کی درخواستیں پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔

قسمت کے چکّر نے پھر حرکت کی۔ توک تمیش اب سنہری غول کا سردار تھا۔

سنہری غول

وہ پناہ گزیں توک تمیش کو بھول چکا تھا۔اس نے سمرقند کی شان وشوکت اور تاتاریوں کے جگمگاتے ہوئے شامیانے دیکھے تھے۔شکر گزاری اس کی طبیعت سے کوسوں دور تھی۔اس نے تیمور پر حملہ کر دیا۔کہا جاتا ہے کہ اس کے بعض امراء نے اس غلط اقدام سے اسے روکنے کی کوشش کی اور کہا:

"تیمور کی دوستی نے تمھاری مدد کی تھی۔صرف خدا ہی جانتا ہے کیا معلوم تمھارا نصیب پھر بدل جائے اور تمھیں اس کی دوستی کی دوبارہ ضرورت پڑ جائے۔"

مگر توک تمیش کو اپنی کامیابی کا یقین تھا۔اس کے علاوہ تیمور نے اُورگنج فتح کیا تھا اور یہ کسی وقت سُنہری غول کی مملکت سمجھا جاتا تھا۔توک تمیش اپنی قومی احتیاط اور تیاریوں کے بعد روانہ ہوا۔تیمور اس وقت بحیرہ خزر کے قریب جنگ میں مصروف تھا۔سنہری غول کے کچھ دستے وہاں نمودار ہوئے۔جلد ہی تیمور کے پاس ایک تھکا ماندہ پیغام رساں پہنچا جو بمشکل زین میں بیٹھنے کے قابل تھا۔اس نے سمرقند سے نو سو میل کی مسافت دنوں میں طے کی تھی۔اس نے اطلاع دی کہ توک تمیش سنہری غول کی فوج کے اعظم الجیش کے ساتھ سیر دریا عبور کرکے تیمور کے وطن میں داخل ہو چکا ہے اور سمرقند سے صرف چند دن کی مسافت پر ہے۔

تیمور فوراً روانہ ہوا اور اس سرعت سے خراسان کی شاہراہ کو عبور کیا کہ توک تمیش ابھی سمرقند نہ پہنچا تھا کہ وہ وہاں پہنچ گیا۔یہ درست کہ راستہ بھر وہ مردہ گھوڑے پھینکتا چلا آیا مگر اس قیمت پر وطن کا تحفظ ارزاں تھا۔

بہت سے قلعے حملہ آور کے خلاف آخر دم تک لڑتے رہے۔تیمور کا بڈّھا اُلّو کا عمر شیخ مغلوں کی راہ میں حائل ہوا مگر انتہائی بے جگری سے لڑنے کے باوجود شکست کھائی۔اس کے آدمی منتشر ہو گئے جب تیمور پہنچا تو توک تمیش کے لشکر بٹ چکے تھے اور آدھے سے زیادہ علاقے پر پھیلے ہوئے تھے۔تیمور کی آمد کی انھیں توقع نہ تھی۔بخارا کے مضافات

میں ایک محل کو آگ لگائی اور دریائے سیر کو عبور کر کے شمال کی جانب لوٹ گئے۔

تیمور کا وطن برباد ہو چکا تھا۔ اس کی فصلیں روندی جا چکی تھیں۔ گھوڑے اور انسان مالِ غنیمت بن کر جا چکے تھے۔ مغلوں کے قرنی عَلم ظاہر ہونے پر بغاوت کے کئی عَلم بلند ہو چکے تھے۔ یہ اس سرزمین کا خاصہ تھا۔ تیمور کے بائیں بازو پہ اُور گنج کے صوفی، خان زادی کے رشتہ دار، میدان میں اُتر چکے تھے۔ اس کی داہنی طرف جاٹ قبیلے بھی گھوڑوں پر زین کس کر لوٹ مار کے آبائی شغل میں از سرِ نو مشغول ہو گئے تھے۔

طاقت کے حصول کے لیے آخری دَور شروع ہو چکا تھا۔ توک تمیش اب چنگیز کی اولاد کا نمائندہ تھا۔ یاسا کا طرفدار، خانہ بدوشوں کا سردار جس کی پشت پر پوری مغل اقوام تھیں۔ تیمور ایک چھوٹے سے قبیلے کے سردار کا لڑکا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے اپنے چند قبائل تھے جو اس کی وفاداری کا حلف اٹھا چکے تھے۔

اُدھر توک تمیش پھر سطح مرتفع کے وسیع میدانوں میں غائب ہو چکا تھا جس طرح لومڑی جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہے۔ کون جانتا تھا کہ اس کا دوسرا حملہ کس جگہ اور کون سے رُخ سے ہو گا؟

تیمور نے اپنے تمام سرداروں کو جمع کیا اور ان میں سے جنھوں نے مغلوں کا مقابلہ کیا تھا اور شکست کھائی تھی ان کو فرداً فرداً سامنے بلایا۔ جنھوں نے جرأت اور بہادری سے کام کیا تھا ان کو انعامات اور تحائف دیئے۔ جنھوں نے بزدلی سے کام لیا تھا انھیں سزائیں ملیں۔ ایک شخص جو دشمن کے سامنے سے بھاگ آیا تھا اس کے بال عورتوں کی طرح بنائے گئے۔ اس کے منہ پہ غازہ اور سرخی مل کر اسے زنانہ کپڑوں میں سمرقند کی گلیوں میں پھرایا گیا۔

اچانک توک تمیش پھر ایک بہت بڑی فوج لے کر سیر کی طرف بڑھ آیا۔ اگر تیمور کی جگہ کوئی یورپی بادشاہ ہوتا تو وہ دارالسلطنت میں قلعہ بند ہو جاتا مگر تیمور نے کبھی

ایسی تدبیریں اختیار نہ کی تھیں۔کرشی کے تحفظ کے وقت بھی وہ قلعہ بند نہ ہوا تھا۔
اس کی فوج کا تھوڑا سا حصہ اس کے ساتھ تھا۔باقی ماندہ فوج مشرقی ودروں سے
جاٹ مغلوں کو نکالنے میں مصروف تھی۔یوں تو اس بلا کی سردی میں بہتر یہی معلوم ہوتا
تھا کہ تیمور خود سمرقند کی فصیل مضبوط کرکے بیٹھ رہے اور توک تمیش کو برف و باراں کا مقابلہ
کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دے مگر توک تمیش اور اس کے سنہری غول کو ملک میں آزاد
پھرنے کی اجازت دے دینا تباہی کے مترادف تھا۔یہ شمال کے باشندے برف و
باراں کے عادی تھے اور یہ بھی امکان تھا کہ صوفی اور جاٹ خان بھی ان کے ساتھ مل جاتے
تیمور کے امیروں نے مشورہ دیا کہ جنوب کی جانب پس نشینی کر جانا اور طاقت اکٹھی
کرکے واپس آنا بہتر ہوگا۔
"انتظار کروں؟ انتظار؟" تیمور نے جوش میں آکر کہا "کس بات کا انتظار؟ یہ
انتظار کا وقت نہیں۔"
اس نے فوج درست کی۔اسے اپنے مخصوص انداز سے بانٹا۔ پھر علم بلند کرکے
سیر کی طرف روانہ ہوگیا۔وہ برف وباراں کے طوفان کے باوجود بڑھتا گیا۔گھوڑے
بعض جگہ پیٹ تک کیچڑ اور دلدل میں پھنس جاتے تھے۔جونہی سنہری غول کی بیرونی
چوکیوں سے دو چار ہوئے ان پر حملہ کر دیا۔وہ بکھرے ہوئے سواروں کے بیچ میں سے
گزر کر توک تمیش کے مرکزی لشکروں کے قریب جا پہنچے۔تیمور نے فوج اس طرح
ترتیب دی تھی جیسے وہ کسی بہت بڑی فوج کا مقدمۃ الجیش تھی۔
جب توک تمیش نے محسوس کیا کہ گھیرا ڈال کر تیمور اس کے عقب پر حملہ آور ہونا
چاہتا ہے تو اسے یقین ہوگیا کہ تیمور کی فوج کی تعداد بہت زیادہ ہے۔وہ عقبی علاقوں
سے منقطع نہ ہونا چاہتا تھا۔خصوصاً اس موسم میں۔اس نے اسی وقت پس نشینی شروع
کر دی اور تیمور نے اپنے دستوں کو تعاقب کا حکم دے دیا۔

جب آئندہ بہار میں سڑکیں خشک ہوگئیں تو تیمور نے بھی فوج کو حرکت دی مگر مغرب کی سمت۔ اس نے صوفیوں کو اپنا پہلا نشانہ بنایا اور اُورگنج کا محاصرہ کیا۔ اس بار شخصی مبارزت کا کوئی موقع نہ تھا، نہ اسے منظور ہی تھا۔ شہر کی فصیل کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ محلات اور مریض خانوں کو بھی زمین سے ملا دیا گیا۔ جب تیمور لوٹا تو وہاں انسان و حیوان کا نام و نشان نہ تھا۔ بقیۃ السیف کو وہ سمرقند لے آیا۔

انھیں ساتھ لے کر وہ مغرب کی طرف روانہ ہوگیا اور جاٹ قبائل کو اپنے دورد(ا) سے نکال کر الملیک تک ان کا تعاقب کیا تاکہ وہ سالہا سال تک پلٹنے اور اس کی سرحدوں پر فتنہ برپا کرنے کے قابل نہ رہیں۔

جب ان دو دشمنوں سے فراغت ہوئی اور سرحدیں محفوظ ہو چکیں تو وہ توک تمیش کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سنہری غول کی فوجوں کا انتظار کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس نے اپنی فوج کو سمرقند کے باہر جمع کیا۔ اس کا معاینہ کیا۔ اور اسے اس لام بندی کا مقصد بتایا۔ اس نے شمال کی جانب سنہری غول کے مقبوضات کا رُخ کرنے اور توک تمیش سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سطح مرتفع کے راستے

اس فیصلے سے چند خدشات بھی تھے۔ خصوصاً مکمل تباہی کا ڈر بھی تھا۔ تیمور سے چار سو سال بعد نیپولین نے اپنی بے پناہ فوج بھی اسی طرح استعمال کی تھی۔ گو وہ ماسکو تک پہنچ گیا مگر اس کی فوج پولینڈ اور روس کی برف باری کی تاب نہ لا سکی اور اس کا بیشتر حصہ ان برفانی میدانوں ہی میں کھیت رہا۔

تیمور اب تک سنہری غول کے بالمقابل نہ آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ توک تمیش کی فوج اس کی فوج سے تعداد میں بہت زیادہ ہے اور چونکہ اس کے پاس بے اندازہ گھوڑے ہر وقت موجود رہتے تھے نقل و حرکت میں بھی اسے تیمور پر فوقیت حاصل تھی۔ تیمور کی فوج مقامی علاقوں کے محاصل پر زندگی بسر کر سکتی تھی۔ گھوڑوں کے لیے چارہ اور آدمیوں کے لیے پانی، یہ دو ضروریات البتہ اشد ضروری تھیں۔ مگر سنہری غول اسی ملک میں نسلوں سے آباد تھے اس بنا پر ان کے لیے وہاں زندہ رہنا اور لڑنا آسان تر تھا۔

تیمور کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایک ایک قدم سوچ کر رکھے۔ ریت کے تودوں اور ان غیر آباد پہاڑیوں میں انسانی ضروریات کی کوئی شے مہیا نہ ہو سکتی تھی۔ فوج کے ساتھ زیادہ سے زیادہ دو تین مہینوں کا سامان خور و نوش لیا جا سکتا تھا۔ اگر ایسی حالت میں توک تمیش اس کے سامنے آیا تو غیر آباد صحرائی علاقے عقب میں ہوتے ہوئے بھی اسے لڑائی لڑنی پڑے گی۔ ایسے میں شکست کے معنی مکمل تباہی ہوں گے اور اس کا اپنا بچ نکلنا بھی قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا۔

پیٹر اعظم نے ۱۷۱۶ء میں خیوا اور ترکمانوں کے خلاف روسی فوج روانہ کی۔ اس فوج کے کمانڈر روسی سپہ سالار شہزادہ بیکووچ چرکاسی کی موت صحرا ہی میں واقع ہوئی۔ اس کی فوج کے اکثر افراد مارے گئے یا بھوک پیاس سے مر گئے اور باقی ماندہ غلام بنا لیے گئے۔ ایک سو سال بعد ایک اور لشکر کاؤنٹ پیروواسکی کی کمان میں روانہ کیا گیا اور خورد و نوش کے پورے انتظامات کیے گئے۔ اس فوج کا حشر بھی یہی ہوا۔ دس ہزار اونٹ، اتنی ہی گاڑیاں اور بیشتر فوج اس خشک صحرا ہی میں رہ گئے اور جو بچ نکلے وہ ایک سال کے بعد واپس ہوئے۔

ایشیا کی یہ غیر آباد وسعتیں فوجی نقطۂ نظر سے آج بھی ناقابلِ تسخیر ہیں۔ تیمور اس صحرا کے گرد چکر کاٹ کر بھی نہ جا سکتا تھا۔ سیدھے مغرب کا رخ کرنے سے وہ سنہری غول کے شہروں سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہ سفر نہایت غیر یقینی سا تھا۔ یہ بھی امکان تھا کہ تیمور ابھی صحرا ہی میں ہو اور توک تمیش دوسری طرف سے بڑھ کر سمرقند کی دیواروں تک پہنچ جائے۔ اگر توک تمیش اتنی دلیری سے نہ بھی کام لے تو بھی کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں مقابلے کے لیے آمادہ ہو گا۔ صحرا کے عین ختم ہونے پر یا ڈیڑھ ہزار میل دور بحیرۂ اسود کے کنارے، یا پھر بالکل ہی دوسری طرف بحیرۂ بالٹک کے کنارے یا طلوع ہوتے ہوئے سورج کے عین نیچے صحرائے گوبی میں۔ دراصل توک تمیش نے ان جگہوں میں سے کوئی بھی نہ چنی۔ اور بالکل ہی غیر متوقع جگہ نمودار ہوا۔ اس دوران میں تیمور کا سامانِ خورد و نوش ختم ہو چکا تھا۔ اس کے خبر رسانی کے وسائل بے کار ہو چکے تھے اور اس کی فوج سنہری غول کے قرمزی علم دیکھنے سے پہلے راستہ کھو چکی تھی۔

فوجی تزویرات کے تمام اصولوں کے مطابق تیمور شکست اور موت کو دعوت دے رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا اقدام صحیح تھا۔ وہ محض جرأت نہ دکھا رہا تھا اور نہ جذبات ہی کے تحت اتنا دور نکل آیا تھا۔ وہ انسانی فطرت اور نفسیات کا ماہر تھا۔

خیال رہے کہ توک تمیش چند سال اس کے دربار میں رہ چکا تھا اور دوبار لڑائی سے بھاگ آیا تھا۔ تیمور مغل فطرت کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ ان کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف تھا۔

وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ دفاعی جنگ سے وہ کبھی فتح مند نہیں ہو سکتا خصوصاً ایسی فوج کے خلاف جس کا سوار دنیا میں لاثانی تھا اور جب تک شمال میں توک تمیش طاقتور تھا اس وقت تک سمرقند بھی خطرے میں تھا۔ تیمور جب اتنی خطرناک مہم پر روانہ ہوا تو اس کشمکش کو جلد از جلد ختم کرنا ہی اس کے پیش نظر تھا۔ علاوہ بریں وہ توک تمیش کو ایسی جگہ دعوت رزم دینا چاہتا تھا جہاں کا اس کو وہم و گمان بھی نہ ہو۔

اس مہم سے تاتاری امیر کے تین اصول صاف عیاں نظر آتے ہیں۔ اولاً اپنے ملک کو جنگ کا میدان بنانے سے گریز، دوم دفاعی جنگ سے احتراز اور سوم حملے کے لیے اتنی سرعت، سختی اور تندی جتنی اس کے سوار اور گھوڑوں کے امکان میں ہو۔

ایک بار تیمور نے کہا تھا "صحیح مقام اور صحیح وقت پر نہ پہنچنے سے ہزار بار بہتر ہے کہ آدمی صرف چند آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ جائے۔"

وہ اکثر کہا کرتا "دشمن کے طاقت پکڑنے سے پہلے ہی اس پر حملہ کر کے اس کی گردن توڑ دینی چاہیے۔ جتنی فوج کا انتظام ہو سکتا ہو اس سے زائد ایک بھی آدمی نہ لے جانا چاہیے۔"

سیر دریا تک کا علاقہ ان کا دیکھا بھالا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ جا رہے تھے اور سلسلۂ کوہ کارا تاغ کے قلعوں کو یکے بعد دیگرے سر کرتے جا رہے تھے۔ فروری کے مہینے میں یہاں برف اور کیچڑ کی وجہ سے وہ رک گئے۔ یہیں توک تمیش کا ایلچی ان کے پاس پہنچا۔ ایلچی نے کہا کہ توک تمیش اپنی گزشتہ غلطیوں پر نادم ہے اور صلح کا خواہشمند ہے۔ یہ محض دکھاوا تھا اور وہ جانتا تھا کہ دکھاوے سے زیادہ اس پیغام کو اہمیت نہ دی

جائے گی۔

تیمور نے ایلچی کو جواب دیا "جب تمہارا سردار زخمی تھا اور اپنے دشمنوں سے بھاگ کر آیا تھا تو سبھی جانتے ہیں کہ میں نے اس کو پناہ دی تھی اور اسے بیٹا کہہ کے پکارا تھا میں نے اُوروس خان کے خلاف اس کی مدد کی تھی۔ اس لڑائی میں میرے بہت سے شہسوار کام آئے تھے۔ جب تمہارا سردار طاقتور ہو گیا تو وہ یہ سب احسان بھول گیا۔ میں ایران میں تھا اور اس نے میری غیر حاضری میں میرے ملک کو برباد کیا۔ اس کے بعد بھی اس نے ایک مرتبہ فوج میرے خلاف روانہ کی اور اب کہ ہم اس کے خلاف روانہ ہوئے ہیں وہ سزا سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ کئی بار اپنے عہد سے پھر چکا ہے۔ اگر وہ ایماندارانہ صلح کا خواہشمند ہے تو علی بے کو گفت و شنید کے لیے روانہ کرے۔"

سنہری غول کا وزیر اعظم علی بے جب نہ آیا تو تیمور نے کوچ جاری رکھا۔ شاہی حرم کی مستورات یہاں سے ان افسروں کے ساتھ واپس بھیج دی گئیں جنھیں سمرقند کے دفاع کے لیے مامور کیا گیا تھا اور تیمور کی فوج پہاڑوں سے نکل کر سفید ریت میں داخل ہو گئی۔

تین ہفتے وہ ریت کے خشک تودوں پر چلتے رہے۔ سحر سے قبل سات فٹ لانبے قرن بجائے جاتے اور لشکروں کو تیاری کی خبر دی جاتی۔ قرن بجنے پر گھوڑوں کا ساز درست کیا جاتا۔ خیمے لپیٹ کر ان گاڑیوں پر لاد دیے جاتے جن کے پہیے آدمی کے قد سے بھی اونچے تھے۔ بیل گاڑیوں کے ساتھ ساتھ بار برداری کے اونٹ بھی سفر میں شامل تھے۔ گاڑیوں میں ہر دستے کا زائد سامان بھی رکھا جاتا تھا۔ ہر دستے میں دس آدمی ہوتے اور وہ ایک ہی خیمے میں رہتے۔ ہر دستے کے زائد سامان میں دو بیلچے، ایک آری، ایک کلہاڑی، درانتیاں، موٹے رسے کی ایک گچھی، دیگچہ اور بیل کی کھال شامل ہوتے۔ کھانے کا سامان نہایت مختصر تھا۔ آٹا، بھُنے ہوئے جو، خشک میوہ

اور ایسی ہی اور چند چیزیں جب سفید ریت میں داخل ہوئے تو فی آدمی آٹھ سیر آٹا مہینے کے لیے قرار پایا۔

ہر سپاہی کے پاس ایک فالتو گھوڑا تھا۔ ہر جوان کے پاس زرہ، خود ڈھال اور دو کمانیں تھیں۔ ایک فاصلے کے لیے اور دوسری تیز تیر اندازی کے لیے۔ ہر ایک کے پاس تیس تیر تھے اور تیغ بھی۔ اس کے علاوہ اپنی خواہش کے مطابق سپاہی چھوٹے دستی ہتھیار بھی رکھ سکتے تھے۔ اکثر رجمنٹوں کے پاس لانبے عَلم بھی تھے جو کاندھوں کے ساتھ لٹکے رہتے تھے۔ بعض کے پاس چھوٹے پھینکنے والے نیزے بھی تھے۔

لشکر ایک خاص ترتیب سے حرکت کرتے۔ علٰحدگی خطرناک ثابت ہوتی۔ اس لیے وہ معسکر میں بھی اسی ترتیب سے رکتے۔ ہر افسر کی جگہ مقرر تھی اور امیر کے عَلم سے ہر افسر کی جگہ اس کے رتبہ اور کمان کے مطابق کھینچی گئی تھی۔ اندھیرے میں بھی کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ باوجودیکہ وہ آرام کی حالت میں کوچ کر رہے تھے۔ تمان باشی، لشکر سالار اپنے اپنے لشکر کو لڑائی کی ترتیب میں قائم رکھتے۔ اس طرح پھیل کر اقدام جاری رکھنے سے کہیں نہ کہیں گھوڑوں کو چرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

نصف النہار سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے قرن پھر بجتا اور وہ گھوڑوں کو آرام دینے کے لیے رک جاتے۔ کمزور جانور پانی کی قلت کی وجہ سے مرنا شروع ہو گئے تھے۔

شام کے قریب وہ پڑاؤ کرتے۔ معسکر کی جگہ سکاؤٹ پہلے ہی سے چن رکھتے۔ تیمور کا عَلم جس کی چوب کے اوپر سنہری ہلال چمک رہا ہوتا اس کے خیمے کے سامنے گاڑ دیا جاتا اور سرداروں کے خیمے سفید محلوں کی طرح اس کے گرد وجود میں آنا شروع ہو جاتے۔

اب ایک نہایت پُر اثر تقریب دیکھنے میں آتی۔ اسے برطانوی فوج کی ریٹریٹ سے مشابہت دی جا سکتی ہے۔ جیسے ہی ایک لشکر پہنچتا اور وہ معسکر میں اپنی جگہ کا

رُخ کرتا۔ نقاروں پر چوٹ پڑتی لشکر سالار دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوتا۔ اپنے افسروں کو ساتھ لیتا اور مرکزی یعنی امیر کے عَلم کی طرف بڑھتا۔ اس کا باجا یعنی بانسریاں، شہنائیاں بین اور قرن اس کے آگے آگے ہوتے۔

باجے کی آواز سے گھوڑے بھی اچھلنا شروع ہو جاتے اور بمشکل قابو میں رکھے جاتے۔ گانے والوں کا طائفہ جنگی گانوں کی لَے اٹھاتا۔ سر پیچھے کو پھینکے اور آنکھیں بند کیے وہ بلند آواز میں اس فوج کی دلیری اور جرأت کے گیت گاتے۔

غروب ہوتے ہوئے سورج کی سُرخ سُرخ روشنی میں یہ شہسوار سینہ نکالے سر اٹھائے اپنے کماندارِ اعلیٰ کے سامنے سے گزر جاتے۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ باجے کی آواز اور گیتوں کی صدا سے بلند نعرہ

'داراُوگز'

لگا کر وہ تیمور کو ہر شام سلامی پیش کرتے۔

جب آخری لشکر سالار سلامی دے کر گزر جاتا تو تیمور پلٹ کر اپنے رفیقوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتا۔ صحرا میں بھی اس کا لباس بہترین ریشم اور زربفت کا ہوتا۔

رات کے وقت اندھیرے میں چراغ جلا کر فوج کے مختلف افسر پیش ہوتے۔ اور سکاؤٹوں سے حاصل شدہ اطلاعات سے تیمور کو مطلع کرتے۔ یہ سکاؤٹ میلوں تک داہنے، بائیں اور سامنے پھیلے رہتے تھے۔ اسی وقت تیمور کو بیماروں اور گھوڑوں کی حالت بھی بتائی جاتی۔

تیمور اس ریت کے سمندر سے جلد از جلد پار جانا چاہتا تھا۔ جو شخص پیچھے رہ جاتا اس کے جوتے ریت سے بھر کر اس کی گردن کے گرد لٹکا دیئے جاتے اور اسے دوسری منزل پیدل طے کرنا پڑتی۔ اگر دوبارہ پیچھے رہ جاتا تو موت کا شکار ہو جاتا۔

سطح مرتفع کے راستے

تین ہفتوں کے بعد وہ چراگاہوں میں پہنچے۔ یہاں نشیب کے اوپر دھند کے بادل موجود رہتے۔ یہاں وہ ایک دریا پر پہنچے جس کے کنارے انھوں نے رُک کر گھوڑوں کو آرام لینے دیا اور لشکر باری باری پار اُترے۔ اس کا نام انھوں نے ساری سُو[1] یعنی زرد دریا رکھا۔

وہ مرغزار کو دیکھ کر حیران سے ہو گئے۔ سبز گھاس کا سمندر۔ جب وہ دو پہاڑوں کے قریب پہنچے تو انھوں نے ایک کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا پہاڑ کے نام دیے۔ فوج رُک گئی اور تیمور سب سے اونچے مقام پر پہنچا۔ وہاں سے اس نے اس سبز سمندر کو افق تک پھیلتے ہوئے دیکھا۔ یہ اپریل کا مہینا تھا۔ گھاس میں معمولی سی نیلاہٹ آگئی تھی۔ تیتر اس جنگلی گندم میں سے اڑ اڑ کر ان کے سروں پر سایہ کرتے۔ دُھند میں سے جھیلوں کا سا عکس نظر آتا۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے ایک بھی آدمی نہ دیکھا تھا۔

البتہ کچھ آثار ضرور تھے۔ گیلی مٹی پر اونٹوں کے پاؤں کے نشان، راکھ اور بجھے ہوئے کوئلے یا گھوڑوں کے ریوڑوں کی لید۔ کہیں کہیں انسانی ہڈیاں بھی نظر آجاتیں جو سرما کے طوفان نے قبروں سے باہر نکال پھینکی تھیں۔

وہ ہر روز فوج کے سامنے شکار مارتے۔ مگر کھانے کے جانور بہت کم تھے۔ کہیں کہیں ہرن مل جاتا۔ گوشت کمیاب تھا۔ بھیڑ کی قیمت ایک سو دینار تک جا پہنچی تھی۔ تیمور نے حکم دیا کہ گوشت بھونا نہ جائے گا نہ روٹی ہی پکائی جائے گی۔

---

[1] اس وقت نقشوں کا نام تک نہ تھا۔ آج بھی اس سطح مرتفع کی ساحت نامکمل سی ہے۔ تیمور نے جو راستہ اختیار کیا وہ صحیح معلوم نہیں۔ خصوصاً ساری سُو عبور کرنے کے بعد کا حصّہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں سے وہ کسی قدر مغرب کے رُخ کوہ یورال کی طرف ہو لیا۔

گوشت کو اُبال کر اسی میں آٹا ڈال لیتے ، پھر کچھ جُڑی بوٹیاں وغیرہ ڈال کر شوربا سا تیار کر لیتے۔ اسی پر سب کا انحصار تھا۔

سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لیے امیر خود بھی یہی کھانا کھاتا اور ان کے ساتھ دونوں وقت شامل ہوا کرتا۔ شکاری جو تھوڑے بہت پرندے اور پرندوں کے انڈے لاتے وہ بھی شوربے میں ڈال دیے جاتے۔ بہت جلد صرف ایک وقت کے کھانے تک نوبت پہنچ گئی۔ اب فوج زمین کی طرف دیکھ دیکھ کر جا رہی تھی۔ جہاں کہیں جڑیں نظر آ جاتیں انھیں نکال لیا جاتا۔ آٹا قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔

گھوڑے البتہ اچھی حالت میں تھے۔ ان کے لیے گھاس افراط سے مل رہی تھی۔ مگر وہ کھانے کے استعمال میں نہ لائے جا سکتے تھے۔ اس ملک میں پیدل سپاہی بیکار تھا۔ گھوڑوں کی زیادہ تعداد ضائع ہو جانا تباہی کا پیش خیمہ ہوتا۔ جوں جوں حالات بدتر ہوتے گئے افسروں کے دلوں میں مستقبل کے متعلق شبہات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ واپس جانا بھی خطرناک تھا۔ راشن کے بغیر کمزور سپاہیوں کو اس صحرا کے پار لے جانا ناممکنات میں سے تھا۔ سنہری غول کو نظر نہ آتے مگر ان کا بہیں کہیں قریب موجود ہونا امکان میں سے تھا اور واپس جاتی ہوئی فوج پر وہ لامحالہ اپنی پوری طاقت سے ٹوٹ پڑتے۔ جب یہ حالت ہوئی تو تیمور نے تواچیوں کو حکم دیا، لشکر سالاروں کو مطلع کریں کہ شکار کی کھلی اجازت ہے۔

اب تک کہیں کہیں سوار لشکروں سے بہت آگے شکار کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ اب ایک لاکھ کی فوج تیس میل کے نیم دائرے میں پھیل کر شکار میں مصروف ہو گئی۔ مرکز رُک گیا اور نیم دائرے کے دونوں کنارے اندر کی طرف سمٹنا شروع ہوئے۔ ان کے آگے آگے تمام چوپائے مرکز کی طرف آنے لگے جب دائرہ مکمل ہو گیا تو وہ آہستہ آہستہ مرکز پر سمٹنے لگا۔ اب بھیڑیے، ہرن اور ریچھ اپنی زندگی کے لیے بھاگنے

لگے۔ جو جانور اس شکار میں ہاتھ لگے ان میں ایک دو نے تاتاریوں کو حیران کر دیا۔ ایک تو اتنا بڑا ہرن تھا کہ وہ بھینس سے بھی بلند قامت تھا۔ خیال ہے کہ یہ ایلک ہوگا۔ حسبِ دستور دائرے میں پہلے تیمور داخل ہوا۔ اس کی تیراندازی ہمیشہ داد پاتی تھی۔ اکثر تاتاری لانبی کمان کو سینے تک کھینچ سکتے تھے مگر تیمور اسے کان تک کھینچ لیا کرتا تھا۔

اب گوشت کی فراوانی ہو گئی۔ تاتاریوں نے صرف موٹے جانور ذبح کیے اور نہایت شاندار جشن منایا۔

تیمور انھیں آرام طلب نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ دوسرے ہی دن اس نے معاینے کے احکام جاری کر دیے۔ گھنٹہ بھر کے بعد وہ بہترین لباس پہنے باہر نکلا اور معاینہ شروع کیا۔ سفید عمامہ ہیروں سے جگمگا رہا تھا۔ ہاتھ میں ہاتھی دانت کی چھڑی اور اس کے سٹاف کے افسر اس کے پیچھے پیچھے۔

امیر جب کسی لشکر کے سامنے پہنچا تو لشکر سالار گھوڑے سے اتر کر رکاب پر جھک جاتے۔ اپنی کمان کے دوسرے سرے تک اس کے ساتھ پاپیادہ جاتے اور اس کی توجہ کشادہ سینے والے تنومند شہسواروں کی طرف دلاتے۔ وہ ان جانے پہچانے ہوئے گندمی چہروں پر نظر ڈالتا جیتی رنگ کے برلاس، پتلے اور بلند سلدوز ترک، سپاہیانہ خو بو کے جلاپر اور جنگجو بدخشانی جن کے ساتھ وہ ستقب جہاں پر جنگ آزما ہو چکا تھا۔

اس کی نگاہ میں یہ معاینہ کافی نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے طبل پر چوٹ پڑی۔ اس آواز کو سن کر لشکر دل کے طبل بھی بول اٹھے اور معاً سوار لشکر جمنتوں میں بٹ گئے جو لڑائی کی ترتیب میں پھیل گئیں۔ چشم آفتاب نے دنیا کے اس خطۂ سرزمین پر یعنی سائبیریا کے ٹیلوں کے درمیان اتنے پرشکوہ معاینے کا منظر کبھی

نہ دیکھا ہوگا - افسر اپنے نئے مقامات کی طرف گھوڑے دوڑا کر بڑھے - جب میلوں تک صفیں درست ہو چکیں تو بیک آواز سب نے نعرہ لگایا

" داراُو گر"

یہی نعرہ تاتاری حملہ کرتے وقت لگایا کرتے تھے -

تیمور خوش تھا، فوج کا جوش برقرار تھا - دوسرے دن کوچ جاری رکھا گیا -

---

سایوں کا ملک

جوں جوں وہ آگے بڑھتے دھند کے بادل اور آگے کو بڑھ جاتے۔ اور چٹانوں پر خاموش بیلیں جیسے پتھروں کو اپنے پنجے میں لیے کھڑی ہوں۔ نیچے خطرناک دلدلیں جو خاموشی سے انسان اور حیوان کے پاؤں کے گرد گرفت مضبوط کرنے سے دریغ نہ کریں۔ یہ جگہ ازحد خاموش تھی۔ درختوں کے اوپر سے باز اڑتے ہوئے گزر جاتے۔ مگر پرندے موجود نہ تھے جو چہچہا کر اس خاموشی کو توڑتے۔ آسمان کا رنگ اب وہ گہرا نیلا نہ تھا جو سمرقند میں ہوا کرتا تھا۔ کہیں کہیں مٹی کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر بھی سامنے آجاتے۔ بھولے بھٹکے مسافروں کی یادگار قبریں۔

" یہ جگہ سایوں کا ملک کہلاتا ہے۔" ابن بطوطہ نے اس کے متعلق لکھا تھا" پھر تاجر جو یہاں آتے ہیں وہ اپنا سامان چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ دوسرے سال جب اسی جگہ جاتے ہیں تو چمڑا اور کھالیں اس سامان کے بدلے موجود پاتے ہیں۔ یہاں جو لوگ رہتے ہیں انھیں کسی نے نہیں دیکھا۔ یہاں گرمیوں میں دن بہت لمبے ہوتے ہیں اور سردیوں میں راتیں ازحد طویل ہوتی ہیں۔"

یہ سیمیرین قوم کا مسکن تھا۔ ہائپر بوریں کا ملک۔ اصطلاح عام میں شمال کے رہنے والے۔ خانہ بدوش قبیلے اگر وہاں موجود بھی تھے تو تیمور کی آمد پر بھاگ گئے تھے۔ جنوب میں لوگ اس لیے نظر نہ آئے تھے کہ توک تمیش نے اپنی فوج کے ذریعے سے انھیں وہاں سے ہٹ جانے کو کہا تھا مگر یہاں تو شاید رہتا ہی کوئی

نہ تھا۔[1]

راوی کا بیان ہے کہ جتنے بھی سکاؤٹ روانہ کیے جاتے۔ وہ آوارہ گردوں کی طرح اس وسیع صحرا میں پھرتے رہتے۔ حقیقتاً یہ صحرا نہ تھا مگر تاتاری کنوؤں اور دریاؤں کے عادی تھے اور یہ وسیع سرزمین جس میں انسان کا نام و نشان نہ تھا انھیں صحرا سے بدتر نظر آتی تھی۔ نمازیوں کو بھی دقت تھی۔ وقت کا تعین مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

سحر بہت دیر پا ہوتی۔ گھنٹوں سورج طلوع نہ ہوتا۔ وہ رات ختم ہونے سے پہلے ہی اذان کی آواز سے باہر نکل آتے۔ سحر اور نماز کے درمیان گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا اور اندھیرے کی مدت اتنی کم ہوتی کہ وہ صحیح معنی میں آرام نہ کر سکتے۔

علما نے اس معاملے پر غور کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ نماز کے اوقات میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اس دوران میں تیمور نے ایک لشکر جو بیس ہزار نفوس پر مشتمل تھا خروج سے علیحدہ کیا اور انھیں سنہری غول کو ڈھونڈنے پر مامور کیا۔ قریب قریب ہر افسر چاہتا تھا کہ اس لشکر کے ساتھ جائے مگر تیمور نے اس کی کمان اپنے نوجوان شہزادے عمر شیخ کو سونپی۔ یہ بیس ہزار غائب ہو گئے۔ چند روز کے بعد ایک پیغام رساں واپس آیا اور ایک نئے دریا کے متعلق اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور سوار پہنچا اور اس نے بتایا کہ پانچ چھ جگہ سلگتی ہوئی آگ دیکھی گئی ہے۔

دشمن کی موجودگی کے متعلق یہ پہلی اثباتی خبر تھی۔ تیمور نے اسی وقت اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے تجربہ کار سکاؤٹ بلوائے اور انھیں اپنے لڑکے کی طرف روانہ کیا

---

[1] وہ اب ۵۵ زاویہ عرض بلد شمالی پر تھے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے توبول کو اس کے منبعوں کے شمال کی جانب سے عبور کیا۔ اس کے بعد جو دریا انھوں نے عبور کیا اس کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ یورال تھا۔ یورال کے بعد انھوں نے سیدھا مغرب کا رخ کیا اور یہیں وہ یورپ کی سرحد کے پار پہنچے۔

کہ تمام علاقہ چھان ڈالیں۔ خود بھی چھوٹا سا محافظ دستہ ساتھ لے کر ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔
یہ دریا ترنول تھا جو بحیرۂ منجمد شمالی میں جا کر گرتا ہے۔ جو آگ نظر آئی تھی وہ دریا کے مغربی کنارے پر تھی۔ تیمور نے دریا تیر کر عبور کیا اور مقدمۃ الجیش میں شامل ہو کر اس کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

سکاؤٹ واپس آئے تو انھوں نے اطلاع دی کہ پچھلے ایک دو دنوں میں کم از کم ستر جگہ آگ جلتی نظر آئی ہے اور بتایا کہ اس علاقے میں گھوڑوں کے نشان بھی تھے۔ تیمور نے شیخ داؤد کو طلب کیا۔ یہ چھاپا مارنے اور غیر معمولی کارناموں میں مشہور تھا۔ اسے حکم دیا کہ مغرب کی جانب پورا علاقہ چھان بین سے دیکھے۔ شیخ سرپٹ روانہ ہوا۔ دو دن اور دو رات کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اسے گھاس کے بنے ہوئے چند جھونپڑے نظر آئے۔ اس نے ان کا چکر کاٹا اور ایک رات چھپ کر بیٹھا رہا۔ دوسری صبح اس کے انتظار کا پھل اسے مل گیا۔ ایک سوار جھونپڑوں سے نکل کر اس کی طرف آیا۔ اس نے اس پر قابو پا لیا اور اس کی مشکیں کس کر تادم لشکر کی طرف لے گیا جو اس دوران میں اور قریب آ گیا تھا۔ مگر قیدی کو توک تمیش کا کچھ علم نہ تھا۔ اس نے صرف زرہ پوش سوار دیکھے تھے جو اس کے جھونپڑوں کے قریب ہی جھاڑیوں میں خیمہ زن تھے۔

ساٹھ تاتاریوں کو فاضل گھوڑے دے کر روانہ کیا گیا کہ ان دس سواروں کو پکڑ لائیں۔ آخر کار تیمور کو کچھ خبر مل ہی گئی۔ قیدیوں نے بتایا کہ سنہری غول سات دن کی مسافت پر مغرب کی طرف خیمہ زن ہے۔

تیمور کا شمال کی جانب جانا آج کل کے تزویراتی ماہروں کو شاید مخمصے میں ڈال دیتا مگر یہ جنگ ہی ایسی تھی۔ اس میں اصول و ارکان کا خیال کم اور دشمن کے نفسیاتی مطالعے کو زیادہ دخل تھا۔ کمزوری کا اظہار اتنا ہی خطرناک تھا جتنا اپنے خلاف متحیرانہ حملہ ہونے دینا۔ اسے احساس تھا کہ آن دیکھے دشمن تمام عرصہ اس کی حرکات سے واقف تھے۔

ادھر تیمور کا سامانِ خورد و نوش ختم ہو چکا تھا۔ لڑائی میں التوا اس کے لیے خطرناک تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ سنہری غول کو جلد از جلد لڑائی پر مجبور کرے۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو ضروری تھا کہ وہ اپنی فوج مزروعہ علاقے میں موسم گرما گزرنے سے پہلے ہی لے جائے۔ اس کے برعکس ترکمان کے لیے انتظار فائدہ مند تھا اور وہ اس کا پورا پورا استعمال کر رہا تھا۔

تیمور کی تیز حرکت سے دشمن پریشان سا ہو گیا تھا۔ اسے مجبوراً تیمور کے متوازی حرکت جاری رکھنا پڑی۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنا لشکر تیمور اور اپنی سرزمین کے درمیان رکھے اور اسے اس طرف بڑھنے سے روکے۔ اس دوران میں مشرق بعید کی سطح مرتفع، والگا اور بحیرۂ اسود سے قبائل جمع کیے جا رہے تھے۔ پوری طاقت یکجا ہونے کے بعد توک تمیش کی تعداد تیمور سے دگنی ہونے کی توقع تھی۔

اب دونوں فوجوں کے درمیان تدبیراتی حرکات شروع ہوئیں۔ دشمن محتاط تھا اس لیے تیمور کو بھی احتیاط لازم تھی۔ دشمن کی ایک اور خصوصیت بھی ذہن میں رکھنے کے قابل تھی۔ دن بھر میں سو میل کا سفر کر جانا اس کے لیے معمولی بات تھی اور وہ اس وقت تک میدان میں نہ اترتا تھا جس وقت تک اس کی پسند کا مقام اسے میسر نہ آتا۔

تیمور کے عمل سے ظاہر ہے کہ وہ خطرات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اسے اپنی فوج کی تکلیفوں کا احساس بھی تھا۔ چھ دن تک وہ بہ حدِ امکان منزلیں طے کرتا ہوا مغرب کی طرف بڑھتا رہا اور یورال کے کنارے جا پہنچا۔ قیدیوں سے اسے معلوم ہوا کہ تین مقامات پر دریا پایاب تھا۔ یہ تینوں مقامات ایک دوسرے کے قریب تھے۔ ان میں سے ایک کو دیکھنے کے بعد تیمور نے حکم دیا کہ دریا کو ایک اور ہی مقام پر عبور کیا جائے اور وہ بھی تیر کر۔ وہ خود پہلے دستوں کے ساتھ گیا اور دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی اس نے اپنے سپاہی جنگل میں آگے کو بڑھا دیئے۔

سایوں کا ملک

یہاں انھیں کچھ اور قیدی ہاتھ آئے۔ ان سے معلوم ہُوا کہ وہ توک تمیش کے ساتھ شامل ہونے کے لیے دریا پر روانہ کیے گئے تھے مگر وہ اس کا معسکر نہ ڈھونڈ سکے تھے۔ پوری فوج نے دریا دو دن میں عبور کیا۔ جب سبھی مغربی کنارے پر پہنچ چکے تو دیکھ بھال سے معلوم ہُوا کہ تینوں مقامات پہ جہاں دریا پایاب عبور ہو سکتا تھا وہاں توک تمیش نے لشکر چھپا دیں بٹھا رکھے تھے جو منتظر تھے کہ تیمور کی فوج وہاں سے دریا پار کرے اور ان کے نرغے میں آ جائے۔

جب انھوں نے دیکھا کہ تیمور ایک اور جگہ سے دریا عبور کر چکا ہے تو وہ پیچھے کو ہٹ گئے تیمور جانتا تھا کہ مغل اتنے خطرناک کبھی نہ ہوتے تھے جتنے وہ پس نشینی کے دوران میں ہوتے تھے۔

تیمور نے حکم دیا کہ اپنی رجمنٹ سے باہر کوئی نہ جائے اور رات کے وقت آگ نہ جلائی جائے۔ جونہی اندھیرا ہوتا سوار دستے معسکر کے گرد حلقہ ڈالنے کے لیے نکالے جاتے۔ کئی دنوں تک انھوں نے یورال کی تنگ وادی کی دلدلوں سے مغرب کا رُخ جاری رکھا۔ جونہی وہ دلدلوں سے باہر نکلے انھوں نے رفتار تیز کر دی۔ آخری دن تمام نقاروں پر چوٹ پڑ رہی تھی اور سوار گاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

سکاؤٹ توک تمیش کے مؤخر الجیش کی بیرونی چوکیوں تک زیادہ پہنچ چکے تھے توک تمیش کا ابھی پتا نہ چلا تھا سنہری غول کے سردار کے پاس باقی فوج سے زیادہ تیز رفتار گھوڑے تھے اور ابھی اس کے ترکش میں ایک اور تیر باقی تھا۔

جب اس کا مؤخر الجیش تیمور سے برسرِ پیکار تھا اس نے سنہری غول کے اعظم الجیش کا رُخ شمال کی جانب کر دیا یہ درست کہ وہ تیمور سے علیحدہ نہ ہو سکتا تھا مگر اتنا تو اس کے لیے ممکن تھا کہ وہ اس سے آگے آگے ہی رہے۔ اور جہاں سے وہ گزر جاتا وہاں تاتاریوں کے لیے تیتر کے پر بھی نہ بچ سکتے تھے۔ جس طرف اس کا رُخ تھا وہ

مدنیت سے دُور تر ہوتا جا رہا تھا۔ سایبوں کے ملک کے اندر۔ جن جنگلوں سے یہ دونوں فوجیں اب گزر رہی تھیں ان میں سفیدہ اور اخروٹ نہ تھے بلکہ اب غوشہ کے اور سدا سبز جنگل شروع ہو چکے تھے۔ پھر جنگلوں کے بعد مرطوب ٹنڈرا کا علاقہ شروع ہو گیا۔

تیمور کے سوار بھوک کی وجہ سے کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ انھیں تین سرداروں کے مارے جانے کا بھی صدمہ تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اب مکمّل تباہی کی لڑائی سامنے تھی، چاہے تباہی کسی ہی فریق کی کیوں نہ ہو۔ مگر انھیں تیمور کی ذات پر پورا اعتماد تھا۔

پھر بارش شروع ہوئی اور معاً برف باری باوجودیکہ جون کا مہینہ تھا۔ چھ دن دونوں فوجیں اپنے خیموں میں رُکی رہیں۔ جونہی برف بند ہوئی تیمور نے باہر نکلنے میں پہل کی۔ عمر شیخ کے بیس ہزار جوان ترکمانی سواروں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس نے منزل بمنزل بڑھنا جاری رکھا۔ ساتویں دن اس کے سامنے سنہری غول کے قرنی عَلَم تھے اور ان کے گرد گنبد نما خیمے اور لاتعداد دشمن۔ تیمور کے لشکر شروع ہی سے جنگی ترتیب میں تھے۔ اسے صرف ایک ہی حکم دینا تھا۔ عجیب ترین بات یہ ہے کہ اس نے جو حکم دیا وہ گھوڑوں سے اُتر آنے اور معسکر لگانے کا تھا۔ اس نے مزید یہ حکم بھی دیا کہ بقیہ خوراک پکائی جائے اور پیٹ بھر کر کھانا کھایا جائے۔

اٹھارہ ہفتوں کے بعد اٹھارہ سو میل کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ تیمور سے آدھے میل کے فاصلے پر سنہری غول جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اُن کی گاڑیاں عقب کو بھیجی جا رہی تھیں۔ اب دونوں فوجیں علحدہ ہونے کے ناقابل تھیں۔ اب تلواریں نیام میں نہ جا سکتی تھیں۔ اب دوسرا مرحلہ لڑائی تھی۔ مگر ترکمان حیران تھے۔ تاتاری فوج یہ سمجھنے لگا کہ نہایت بے فکری سے کھانے پکانے میں مشغول تھی جیسے یہ شمالی ٹنڈرا کا علاقہ ان کا اپنا ہی ہو۔ بات صرف اتنی تھی کہ تیمور آخری لڑائی سے پہلے گھوڑوں اور سواروں کو آرام دینا چاہتا تھا۔

اس کی بیرونی چوکیاں چوکنی تھیں۔ رات کے وقت اس نے کوئی آگ جلنے یا روشنی

ہونے نہ دی اور نہ اس نے مجلس مشاورت ہی طلب کی۔ اس کے سٹاف کے افسر اس کے گرد ہی قالینوں پر دراز ہو گئے۔ پیغام رساں افسر بھی قریب ہی تھے۔ تیمور مدھم سا چراغ جلا کر شطرنج کے سپاہیوں سے دل بہلا رہا تھا۔

تمام انتظامات مکمل تھے۔ فوج سات لشکروں میں منقسم تھی، اسی طرح جس طرح کوچ کے وقت منقسم رہتی تھی۔ میسرہ کا مقدمتہ الجیش اور اعظم الجیش علیحدہ تھا۔ قلب کے پیچھے تیمور خود تھا۔ اس کے پاس بہترین اور آزمودہ کار شہسوار تھے۔ فوج کا کمزور ترین حصہ قلب میں تھا۔ میمنہ میں بہترین سردار تھے اور ان کے تحت بوجھل سوارہ تھا۔ میمنہ کی کمان برائے نام تیمور کے چھوٹے لڑکے میراں شاہ کے ہاتھ میں تھی مگر اس کے مشورے کے لیے آزمودہ کار سپاہی موجود تھے۔ یہاں وہ جانباز بھی تھے جو موت کو للکارنے کے عادی تھے اور جو 'تُوتُو بہاتر' سر پھرے بہادر کہلاتے تھے۔ شیخ علی بہادر اور اس کے ساتھی۔

تیمور نے اپنے دائیں پہلو ہی کی طرف سے حملہ شروع کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ سفید ریش سیف الدین نے پانچ ہزار سواروں کے ساتھ بے پناہ حملہ کیا اور بیک آواز یہ پانچ ہزار 'دار اُوگر' کا نعرہ لگاتے ہوئے سرپٹ آگے بڑھے۔

ترک تمبش کی صفیں نیم دائرے کی شکل میں تھیں۔ اس کے کونے تیمور کے پہلوؤں کے بالمقابل تھے۔ اس کا بایاں بازو آگے بڑھا اور سیف الدین کے حملے کو روکا۔ اس زور کی ٹکر ہوئی کہ تیمور کے نقارہ و طبل اور قرن کی آواز بھی اس کے سامنے مدھم معلوم ہوتی تھی۔ سوا اس مقام کے جہاں تیمور خود تھا لڑائی سرداروں اور امیروں کے ہاتھ میں تھی۔

ایک اور لشکر سیف الدین کی مدد کو پہنچا اور پورا داہنا بازو آگے بڑھا[1]۔ ان کے

---

[1] تیمور نے حسب معمول آزمودہ شہسوار میمنہ میں شامل کر رکھے تھے۔ اس کا مقدمتہ الجیش

باقی صفحہ ۱۲۶ پر دیکھیے

سروں کے اوپر سے تیر آگے کو جا رہے تھے۔ سنہرل غول بوجھل سوارہ کے اس حملے کی تاب نہ لا سکا تیمور نے قلب کو آگے بڑھ کر میران شاہ کو امداد دینے کا حکم دیا۔

قلب میں کیا کچھ ہوا، یہ معلوم نہ ہو سکا۔ پورے میدان میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ سوار مخالف سوار سے اُلجھا ہوا تھا۔ تیروں کی بوچھاڑ، تلواروں کی جھنکار اور انسانی خون کی ندیاں۔ زخمی اپنے زینوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ قریب الموت بھی اپنے ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔ رحم کی نہ درخواست تھی اور نہ رحم کی کسی طرف سے امید۔ سپاہی اس وقت تک اپنے ہتھیار چلا رہے تھے جب تک ان کی رگوں میں خون بہ رہا تھا۔ جب خون کی ندیاں بدن کو نچوڑ دیتیں وہ گھوڑوں کی پیٹھ سے جدا ہو کر گر پڑتے۔

بائیں طرف تاتاری کم تعداد میں تھے۔ اور پے بہ پے حملوں کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹنا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵) اور محفوظہ علٰحدہ ہوتا تھا۔ بہترین سپہ سالار پہلی صف میں ہوتے تھے۔ حرکات کے دوران میں لشکر اپنے اپنے محور پر قائم رہتے۔ عام طور پر ان کے مخالف بائیں بازو کو وہ پہلی ہی ٹکر میں تتر بتر کر دیتے۔ تاتاری فاتح کا دستور تھا کہ وہ اپنے میسرہ کو روکے رکھتا اور جب میمنہ کامیاب ہو جاتا اس وقت اسے استعمال کرتا۔ وہ خود قلب کے پیچھے مضبوط محفوظہ لشکر اپنے ساتھ رکھتا۔ ان محفوظہ لشکروں کے ساتھ وہ میمنہ کے کامیاب حملے کو قائم رکھتا یا اگر ضرورت پڑتی تو کمزور میسرہ کی مدد کو پہنچتا۔ وہ جنگ کے اختتام کے قریب سے پہلے شاذونادر ہی حرکت کرتا۔ اس کا قلب عام طور پر خندقوں کا استعمال بھی کرتا اور اسے میمنہ کے کامیاب حملے کے بعد ہی استعمال کرتا۔

وہ کھلے میدان کی جنگ کو پسند کرتا تھا اور پوری فوج کی سمت تبدیل کرنے پر اسے قدرت حاصل ہوتی تھی۔ محور کے طور پر وہ محفوظہ لشکر کو استعمال کرتا۔ میمنہ کے آگے بڑھ جانے سے اگر ترچھی حرکت کی ضرورت پڑتی تو اس کی مشق بھی اس کی فوج کو تھی ایسے حالات میں میسرہ کی حرکت قلب کے عین پیچھے پیچھے ہوتی تھی۔ یہ ترتیب اور حرکات کا یہ توارد پوری فوج جانتی تھی اس لیے لڑائی کے دوران میں غیر معمولی احکام بھیجنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

شروع ہوئے۔ سلدوز قبلیہ بکھر چکا تھا۔ عمر شیخ اپنے علم کو اب بھی سنبھالے ہوئے تھا جونہی توک تمیش نے یہ دیکھا وہ اس مقام پر پوری طاقت سے حملہ آور ہوا اور چیرتا ہوا تاتاری قلب کے عقب میں جا پہنچا۔

تیمور اپنے قلب کے حملے کو غور سے دیکھتا رہا تھا مگر یکایک قرنی علم اپنے اور بائیں بازو کی لڑائی کے درمیان دیکھ کر وہ حیران سا ہو گیا۔

وہ محفوظہ لشکر کے ساتھ پلٹ آیا اور سیدھا توک تمیش کے پہلو میں حملہ کر دیا۔ ایک تو یہ حملہ یک لخت تھا، دوسرے تیمور کے شخصی محافظوں کے کلغی دار خود اور ان کے درمیان تیموری علم کو اس قدر قریب دیکھ کر وہ سنبھل نہ سکا۔ اسے لڑائی ختم ہوتی ہوئی نظر آئی۔ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ جو چند امیر اس کے قریب موجود تھے انھیں ساتھ لیا اور بمشکل اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کیا۔ وہ اپنے ہزاروں کے لشکر کو بھول گیا۔ موت کا سایہ اسے تعاقب کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اس کے جانے کے ساتھ ہی بلند قرنی علم سرنگوں ہو گئے۔

تاتاری اب آرام آرام سے کوچ کر رہے تھے۔ توک تمیش کا معسکران کے ہاتھ آچکا تھا۔ اور خوراک کی کمی نہ رہی تھی۔ گھوڑے بھی افراط سے ہاتھ آگئے تھے۔ دس میں سے سات رجمنٹیں قیدی پکڑ لانے پر متعین کر دی گئی تھیں۔ سنہری غول کے باقی سردار عَلم گرنے کے بعد بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ غول کے باقی ماندہ آدمی مشرق کی طرف والگا کی دلدلوں کی طرف بھاگے جہاں ہزار ہا تاتاریوں کی تیغ کا شکار ہوئے۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک لاکھ کے قریب لڑائی کے دوران میں اور بھاگتے ہوئے مارے گئے۔ صحیح تعداد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ قتل خاصے ہوئے۔

ایک مرتبہ پھر فوج شکار کے لیے پھیل گئی مگر اس دفعہ جانوروں کے شکار کے بجائے والگا کی دونوں طرف کے دیہات میں لوٹ مار کا مقصد تھا۔ تاتاری وہاں سے جنوب کی جانب گرم علاقوں کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں گائے بیلوں کے ریوڑ، بھیڑیں، اونٹ اور لاتعداد گھوڑے ہاتھ آئے۔ گندم کی فصل پک چکی تھی۔ وہ بھی اکٹھی کر لی گئی۔ جو بھی چوبی مکان سامنے آتا اس کی تلاشی لی جاتی اور کنیزیں اور غلام پکڑ لیے جاتے۔ روس کی سرزمین کا چکر لگایا، وہاں دولت کی انتہا نہ تھی۔ چاندی اور سونے کی اینٹیں، سفید قاقم اور سیاہ سمور۔ ہر ایک سپاہی کو اتنی دولت ہاتھ آئی کہ اس کی اپنی اور اولاد کی زندگی میں ختم نہ ہو سکتی تھی۔

ہر آدمی کے پاس کپڑوں سے لدے ہوئے خچر، لومڑی کی کھالیں اور نوخیز

گھوڑوں کی قطاریں جمع ہو گئیں بعض چیزیں تو وہیں پھینکنا پڑتی تھیں۔ جنوبی علاقے میں پہنچ کر مختلف لشکر ڈھیر یکجا ہوئے۔ یہاں تیمور نے ایک ہفتے کے جشن کی اجازت دے دی۔

یہ جگہ ان تاتاریوں کو ازحد پسند آئی۔ اونچی گھاس سے جب ہوا سیٹیاں بجاتی ہوئی گزرتی تو دریا کی موجودگی کا گمان ہوتا۔ وہ دھند جس سے سایوں کا احساس ہوتا تھا اب قصۂ ماضی بن چکی تھی، اور تو اور چاند کی چاندنی اتنی روشن ہوتی کہ گھاس کے تنکے بھی علیحدہ علیحدہ نظر آتے اور جب سروں کے اوپر سے بادل گزرتے تو وہ اپنا سایہ ڈالتے ہوئے جاتے۔

رات کے وقت جھینگر کی آواز اور اکا دکا پرندے کی پرواز جب خاموشی کو توڑتی تو نہایت دلکش معلوم ہوتی۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ان سپاہیوں کے قویٰ ڈھیلے کرنے کی طرف اُکسا رہی تھی۔ تیمور بھی اب چاہتا تھا کہ ان فوق العادہ صعوبتوں کے بعد وہ ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کو دُور کر لیں۔ وہ اپنے امیروں کے ساتھ اس شامیانے میں بیٹھا تھا جو توک تمیش سے حاصل ہوا تھا۔ ریشمی پردے، چوبوں کے گرد سونے کی پتریاں جڑی ہوئی۔ ریشمی قالینوں پر عرق چھڑکا ہوا تھا۔ جنگی قیدی گوشت کی قابیں پیش کر رہے تھے۔

گویّے بلا لیے گئے۔ ان کے ساتھ بھی سپاہیانہ سے تھے۔ بنسری اور چھنتارا۔ یہ گویّے شاعر بھی تھے اور اکثر فی البدیہہ کہتے تھے۔ انھوں نے اپنے تاتاری سپاہیوں کے کارناموں کے گیت بنا لیے تھے "صحرا کی فتوحات کی خوشخبری" یہ تھا ان کے گیت کا عنوان۔ جب کھانا ختم ہوا اور مے و جام کی باری آئی تو موسیقی کی لے بھی بدل گئی۔ ساز اب نرم اور دھیمے سروں میں بج رہے تھے۔ بلالیکا کے تار اور بنسری کی لے اب استراحت کی طرف مائل کن تھی۔

سونے کے جام گردش میں تھے۔ ساقی بھی موجود تھے۔ جنگ کی قیدی کنیزیں، خوش گلو و خوبرو، دراز قد سیمیں بدن۔ ان جنگی قبائل کی رسم تھی کہ قیدی عورتیں جب ساقی کے فرائض ادا کرتیں تو ان کا لباس صرف ان کی دراز زلفیں ہوتیں۔ اب ان کنیزوں کے گانے کی باری آئی۔ جنگی گیت نہیں بلکہ عشق و محبت کے گیت، ہجر و وصال کے وہی گیت جو وہ اپنے ملک میں گایا کرتی تھیں۔ پھر جب مے و معشوق یکجا ہوں تو ہجر و مصیبت کی گھڑیاں بھول جاتی ہیں اور انسان لطف یک لحظہ و دو لحظہ میں اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے۔

وا ڈنگا کے کنارے جب جشن کے ایام ختم ہوئے تو تیمور فوج سے علیحدہ ہو گیا اور تیز رفتاری سے سمرقند کو واپس ہوا۔ فوج کی کمان سیف الدین کے ہاتھ میں دی گئی تاکہ وہ فوج کو واپس لے آئے۔ سمرقند میں آٹھ مہینوں سے امیر کے متعلق کوئی اطلاع نہ پہنچی تھی۔ جب اس کی آمد کی اطلاع پہنچی تو پورا شہر اس کے استقبال کے لیے شہر کے باہر موجود تھا۔ اب حملے کا خطرہ رفع ہو چکا تھا۔ لوگ اب سمرقند کو "محفوظ" کا لقب دینے میں فخر محسوس کرتے۔

تیمور نے توک تمیش کی طرف پھر توجہ نہ دی اور اس کی مملکت کے شمالی حصے میں دخیل نہ ہوا۔ یہ درست کہ وہ ایک خان کو اپنا نمائندہ بنا کر چھوڑ آیا تھا مگر یہ ایک رسمی سی بات تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ توک تمیش پھر لوٹ آیا۔

تین سال کے بعد توک تمیش نے پھر تیمور کی سرحدوں پر بحیرۂ خزر کے شمال میں یلغار شروع کر دی۔ تیمور نے نہایت خفگی سے اسے لکھا:

"تمھارے اندر یہ کونسا شیطانی جذبہ کارفرما ہے۔ تمھیں گزشتہ جنگ کیا بھول گئی ہے۔ تم جانتے ہو کہ صلح اور جنگ میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں اور تمھیں میری فتوحات کا بھی علم ہے۔ تم میری دوستی اور دشمنی سے یکساں طور پر واقف ہو۔

آئندہ کے لیے اپنا رویہ جُن لو اور مجھے مطلع کرو۔"

بے سمجھ توک تمیش نے دوبارہ جنگ کو بہتر سمجھا۔ اس بار تیمور شکست سے بال بال بچا۔ تیمور اپنی فوج سے کٹ گیا اور معدودے چند آدمی اس کے ساتھ رہ گئے۔ دشمن کا زور اتنا زیادہ تھا کہ گھوڑوں سے اُتر کر انھوں نے تیمور کے گرد ایک حلقہ بنا لیا۔ نورالدین نامی تاتاری دشمن کی چند بیل گاڑیاں کھینچ لایا اور ان کے پیچھے سے مدافعت جاری رکھی گئی۔ مگر جلد ہی کمک پہنچ گئی اور دشمن کو پیچھے ہٹا یا گیا۔ تیمور کا لڑکا میران شاہ اور امیرالامرا سیف الدین اسی معرکے میں زخمی ہوئے۔

مگر اس لڑائی نے سنہری غول کا خاتمہ کر دیا۔ توک تمیش شمالی جنگلوں کی طرف بھاگ گیا اور اس کے قبیلے بکھر گئے۔ کچھ کریمیا، کچھ ادرنہ اور کچھ ہنگری میں چلے گئے۔ چند ایک تیمور سے مل گئے۔

والگا کے کنارے مغلوں کا مشہور شہر سرائے تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس بار تیمور نے اس کے تمام شہروں کو بالکل تباہ کر دیا۔ وہ واپس سرائے پہنچا۔ وہاں کے باشندوں کو شہر سے نکال کر برف کی صعوبتیں جھیلنے پر مجبور کیا گیا اور چوبی مکانوں کو آگ لگا دی۔ والگا کے کنارے استراخان واقع تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس کی فصیل برف کی نہایت بلند دیوار کی تھی۔ اہلِ شہر اس پر پانی ڈالتے رہتے اور وہ برف میں تبدیل ہو کر اسے اور بھی بلند کر دیتا۔ تیمور نے انھیں یاد دلایا کہ بخارا کو مغلوں نے جلایا تھا اور اس کی پاداش میں انھیں بھی قتل کیا جائے گا۔ جب شہر فتح ہوا تو اس نے حاکم کو منجمد دریا کی تہ میں دفن کرا دیا اور تمام آبادی کو موت کے گھاٹ اتارا۔

جب تیمور کے علم ڈان کے کنارے کنارے بڑھ رہے تھے تو ماسکو میں بھی ہلچل پیدا ہوئی۔ روسی شہزادۂ اعظم اور فوج میدان میں اُتر تو آئے مگر انھیں مقابلے

کی امید کم نظر آتی تھی - برفانی گاڑیاں مریم کا مجسمہ لانے کے لیے ولیشا گوراڈ روانہ کی گئیں۔ جب یہ مجسمہ پہنچا تو عظیم الشان جلوس کے ساتھ اسے ہزاروں کے مجمع کے درمیان ماسکو لے جایا گیا - لوگ پکار پکار کر کہ رہے تھے :

"اے خدا کی ماں! روس کی حفاظت کر"

روسی اپنی نجات اسی واقعے سے منسوب کرتے ہیں - تیمور ڈان ہی سے لوٹ گیا۔[1]

کسی کو معلوم نہیں کہ تیمور کیوں ماسکو نہ گیا - البتہ ماسکو کا فائدہ یورپ کی ان بستیوں کے لیے مصیبت بن گیا جو آزاف کے کنارے آباد تھیں - وینس، جینوا، کیٹالان اور باسک کی فوجوں کو تاتاری ہجوم کے ہاتھوں شکست ہوئی اور ان کی بندرگاہیں جہاں سے وہ غلاموں کی تجارت کرتے تھے آگ کی نذر ہوئیں -

وہ مملکت جس میں جوجی نے چنگیز خاں کا قانون نافذ کیا تھا، وہاں اب سنہری غول کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اس موسم سرما میں دنیا کا عظیم ترین فاتح اس وسیع مملکت پر چھا گیا تھا - مغل خان اب صحرائے گوبی اور شمالی ٹنڈرا کے باہر محکوم قوم کے

---

[1] یاد رہے کہ توقتمش کی فوج نے سات سال قبل ماسکو کو جلایا تھا اور تیمور نے سنہری غول کی دولت ان سے چھینی تھی تیمور کی نگاہ میں پچاس ہزار باشندوں کا ماسکو معمولی قصبے سے زیادہ نہ تھا - اکثر تاریخیں مصر ہیں کہ اس نے ماسکو کا محاصرہ کیا مگر روسی وقائع نگار بالکل خاموش ہیں -

یہ ضرور ہوا کہ والی فورلڈ ویوک لیتھوانیا نے اس واقعے کے چار سال بعد ان تاتاریوں کے خلاف مذہبی جنگ کا اعلان کیا جو جنوبی روس میں رہ گئے تھے۔ دو تاتاری خانوں نے لیتھوانیا، پولینڈ، گیلی شیا کی فوجوں اور گرانڈ ماسٹر آف ٹیوٹانک نائٹس کو بری طرح شکست دی۔ (اس لڑائی کی دیگر تفاصیل حواشی میں دی گئی ہیں -)

یہ تیمور کی تلوار کے طفیل تھا کہ روسیوں نے مغلوں کے طوقِ غلامی کو اتار پھینکا -

افراد تھے۔

دور دراز شمالی ملکوں سے لوٹتے ہوئے تیمور نے بحیرۂ خزر کے مغرب سے چکر کاٹ کر
آنے کا فیصلہ کیا تاکہ کوہ قاف کی سنگلاخ سرزمین میں سے شاہراہ نکالی جاسکے۔

صحرا کے رہنے والے کپچاک اور برفانی خطوں کے بسنے والے کرلوک اب اس کے
ہمراہ تھے۔ کوہ قاف کی چٹانیں اور گھنے جنگل آج تک فاتح افواج کے راستے میں سدِ سکندری
بن کر کھڑے رہے تھے۔ تیمور اس عظیم الشان فوج کے ساتھ انھیں پہاڑوں پر حملہ آور ہوا۔
جیالے پُرہمت باشندوں نے حسبِ معمول اپنے بلند آشیاں نما قلعوں سے مقابلہ کیا۔

موسم سرما اسی میں صرف ہو گیا۔ ایک بار اس کام کو شروع کرنے کے بعد تیمور اسے
ادھورا نہ چھوڑنا چاہتا تھا اور وہ اپنے جوانوں کو یہ فرض سونپ چکا تھا۔ ایک جگہ
جنگل اتنا گھنا تھا کہ وہاں سے ہوا کا گزر بھی مشکل تھا اور جہاں صدیوں سے سورج
کی شعاعیں نہ پہنچی تھیں۔ اس جنگل کو کاٹ کر راستہ بنایا گیا۔

قریب ہی ایک کوہستانی قبیلہ نہایت مشکل گزار پہاڑوں میں مقابلے پر آمادہ
نظر آتا تھا۔ ان کا قلعہ عمودی چٹانوں کے اوپر تھا اور بلندی اتنی زیادہ تھی کہ نہ تو اس پر
تیر پہنچ سکتے تھے اور نہ اس کی طرف دیکھا جاسکتا تھا۔ اسے دیکھنے ہی سے تاتاریوں کو
چکر آجاتے تھے۔ تیمور نے اس قلعے سے بچ کر نکلنے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی نئی شاہراہ
پر ایسا کوئی مقام نہ دیکھنا چاہتا تھا جو مطیع ہونے سے بچ رہا ہو اور بعد میں آمد و
رفت میں دخیل ہو۔

اس نے بدخشانیوں کو بلایا اور راستہ ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ وہ کوہستانوں کے
باشندے تھے اور اودیال کے شکار میں شب و روز ایسی چٹانوں کے عادی تھے۔ وہ
بہت دیر تک تنگ غاروں اور ابھری ہوئی چٹانوں سے اُلجھنے کے بعد لوٹے اور اپنی ناکامی
کا اظہار کیا۔ اب بھی امیر مطمئن نہ تھا۔ اس نے ایک اور بلندی سے اس کا معاینہ

کیا اور سیڑھیاں بنا کر انھیں باندھنے کا حکم دیا۔

تین سو فٹ بلند چٹان کے ساتھ سیڑھیاں لگائی گئیں اور انھیں قریب کے درختوں کے ساتھ مضبوطی سے باندھا گیا۔ یہ سیڑھیاں ایک اُبھری ہوئی چٹان تک پہنچیں اور یہاں نئی سیڑھیاں لگائی گئیں۔ وہ قدم بقدم آگے بڑھتے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کو رسّوں سے اوپر کی طرف مدد دے رہے تھے۔ پاس ہی ایک اور جگہ سیڑھیاں لگانے کی بھی مل گئی۔ اس کے بعد ایک چوٹی تھی۔ یہاں سے تیر قلعے تک پہنچ جاتے تھے۔ جیارجی اس تمام عرصے میں اوپر سے وزنی پتھر نیچے پھینک رہے تھے مگر جب تیراندازی شروع ہوئی تو انھیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب سیڑھیاں بھی اوپر تک پہنچ گئی تھیں اور یوں یہ قلعہ فتح ہوا۔

اس طریقے سے انھوں نے اس کوہستان کے متعدد قلعے فتح کیے اور اُس وادی میں پہنچے جو سمندر تک جاتی تھی۔ اب ان کے سامنے البرز کا سلسلہ تھا جو شمالی ایران کو جدا کرتا ہے۔ یکے بعد دیگرے تیمور نے انھیں اطاعت کا پیغام دیا۔ جو اطاعت قبول کر لیتے وہ محفوظ رہتے۔

اس کے دو محاصرے تاریخ میں یادگار ہیں۔ ایک کلات کا اور دوسرا تکریت کا۔ پہلا مقام تو ایک بلند ہی کشادہ سطح پر واقع تھا جس کے اوپر چشمے اور چراگاہیں تھیں۔ اس کے گرد دشوار گزار چٹانیں تھیں اور جگہ اس قدر تنگ تھی کہ فوج کے لیے معسکر بنانا بھی مشکل تھا۔ یہ گھاٹیاں دشوار گزر گاہ ثابت ہوئیں۔ چٹانوں کو عبور کرنا مشکل تھا اور اوپر پہنچنا اس سے بھی مشکل۔ بعد کے ایام میں نادر شاہ نے اپنے خزانے یہاں محفوظ رکھے۔

چونکہ حملہ کامیاب نہ ہو سکا تھا تیمور نے محاصرہ جاری رکھا۔ کچھ فوج وہاں رکھی اور زیادہ حصہ اپنے ساتھ لے کر آگے نکل گیا۔ قلعے میں وبا پھیل گئی اور وہ نیچے

اُتر آنے پر مجبور ہو گئے ۔ یوں یہ رکاوٹ بھی بیکار ثابت ہوئی ۔ اس کے دروازے اور راستے آئندہ کے استعمال کے لیے از سرِ نو درست کیے گئے ۔

دوسرا قلعہ ٹکریت کا تھا ۔ یہ دجلہ کے کنارے ایک بلند چٹان پر واقع تھا ۔ یہاں ایک آزاد قبیلہ رہتا تھا جو ہر رہگیر کو بے دھڑک لوٹ لیا کرتا تھا ۔ تیمور کی آمد پر قبیلے کے سرداروں نے فیصلہ کیا کہ قلعہ تیمور کے حوالے نہ کیا جائے گا ۔ تمام راستے پتھروں سے چُن کر چھت سے مضبوط کر دیے گئے ۔

تاتاریوں نے نقاروں پر چوٹ لگائی اور فوراً حملہ کر دیا ۔ چٹان سے نیچے جو فصیل تھی وہ آسانی سے لے لی گئی مگر مدافعت کرنے والے اندرونی حصار میں قلعہ بند ہو گئے ۔ منجنیقوں کو آگے منگایا گیا اور وزنی پتھر اندر پھینکے گئے جن سے مکانوں کی چھتیں بیٹھنا شروع ہو گئیں ۔

بلندی کی وجہ سے حصار کی دیوار کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکا ۔ تیسری شب خواجہ کی رجمنٹ بیرونی برجوں میں سے ایک کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی مگر سید خواجہ کے جوان حصار کی دیوار تک نہ پہنچ سکے ۔ لکڑی کی چھت بنا کر ان کے نیچے ہندسی اپنے کام میں لگ گئے ۔ آہستہ آہستہ انھوں نے تختوں کے گڈھے بلند کرنا شروع کیے اور حصار کی دیوار کی بنیادوں تک جا پہنچے ۔

ہر لشکر کو اپنا علیحدہ حصہ بانٹ دیا گیا تھا ۔ بہتر ہزار آدمی مختلف اوزاروں سے سرنگیں کھودنے میں مصروف تھے ۔ وہ باری باری کام کرتے اور دن رات گنتی اور جبل سے چٹان میں شگاف پڑنے شروع ہو گئے ۔ سرنگوں کی خبر سن کر محصورین گھبرا گئے ۔ انھوں نے تیمور کی خدمت میں تحائف ارسال کیے مگر تیمور نے جواب دیا کہ ان کا سردار حسن اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے ۔ حسن کو یہ دعوت قبول نہ تھی ۔ حملے کا نقارہ پھر بجا ۔ ایک سرنگ میں کافی لکڑیاں اور جھاڑیاں ڈال دی گئی تھیں اور ان پر تیل

چھڑک دیا گیا تھا۔ جب آگ جلائی گئی تو فصیل کا یہ حصہ گر گیا۔ تاتاری شگاف میں سے اندر داخل ہوئے مگر مقابلہ سخت تھا۔ تیمور نے دوسری دو سرنگوں میں بھی آگ جلانے کا حکم دیا۔ حصار کے چاروں طرف دھوئیں کے بادل پھیل گئے۔ شاید یہ اس کی موت کا لبادہ تھا۔ جب دوسرے دو شگاف بھی کھل گئے تو بوجھل رجمنٹوں نے حملہ کر دیا۔ ٹکریت والے نیم تباہ شدہ قلعے کے پیچھے جو بلندی تھی اس کی طرف بھاگ گئے۔ وہاں بھی ان کا تعاقب کیا گیا۔ حسن کو مشکیں کس کر نیچے لایا گیا۔ شہری آبادی کو سپاہیوں سے علیحدہ کر کے آزاد کر دیا گیا مگر سپاہیوں کو موت کی سزا دی گئی۔

ان کے سروں کے دو کلہ مینار تعمیر کیے گئے اور دریا کی مٹی کے گارے سے انھیں مضبوط کیا گیا۔ میناروں کے نیچے یہ تحریر کندہ کی گئی:

"ڈاکوؤں اور باغیوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔"

گو حقیقت میں یہ تحریر قدرے مختلف ہونی چاہیے تھی، یعنی

"تیمور کی اطاعت سے انکار کرنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔"

دیوار کے شگاف اسی طرح رہنے دیے گئے۔ ایک عرصے تک لوگ دور دور سے آتے اور تاتاری امیر کی طاقت کا مظاہرہ دیکھتے۔ مگر رات ہو جانے پر اس جگہ کے قریب سے کوئی نہ گزرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہاں بھوت رات کے وقت کلہ میناروں کو دیکھنے آتے ہیں۔

ٹکریت کا یہ ناقابلِ تسخیر قلعہ سر کرنے میں تیمور نے سترہ دن صرف کیے۔ اب تیمور کی مملکت میں شمالی علاقے، بحیرۂ ارال، بحیرۂ خزر، ایران اور کوہ قاف کے کوہستان بھی شامل ہو چکے تھے۔ دو ہزار دو سو میل تک خراسان کی تاریخی شاہراہ اس کی مملکت میں سے گزرتی تھی۔ نیشاپور سے المالیک تک چودہ شہر

اسے خراج بھیجتے تھے۔

اس عظیم الشان کارنامے نے اپنا خراج انسانی جانوں کی شکل میں وصول کیا تھا۔ امراء کی مجلس میں اب وہ پرانے چہرے نظر نہ آتے تھے اور ان کی تعداد کم ہوگئی تھی بہادروں کی برادری بھی کم ہوگئی تھی۔ ختائی بہادر سیر دریا کی برف میں کام آیا تھا۔ شیخ علی بہادر جس نے ایک بار ترکمانوں کے انبوہ کے درمیان اپنا خود اتار کر پھینک دیا تھا اسے سنہری غول کے ایک جاسوس نے خنجر سے ہلاک کر دیا تھا۔ عمر شیخ تیمور کا دوسرا لڑکا کوہ قاف میں تیر کا شکار ہو چکا تھا۔ موت، وہی موت جو اس عظیم الشان فاتح کے سایے سے بھاگتی تھی اب اس کے دوسرے لڑکے کو اپنی آغوش میں لے چکی تھی۔

اس بار جب تیمور کو بیٹے کی موت کی اطلاع ملی تو اس نے جذبات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔

"خدا نے دیا تھا اور خدا نے واپس لے لیا" تیمور نے بلند آواز سے کہا اور سمرقند کی واپسی کے احکام جاری کر دیے۔

راستے میں وہ اک سرائے میں تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ سفید محل اب تیار ہو چکا تھا۔ شہر سبز کی سر سبز چراگاہوں کے درمیان۔ یہاں تیمور نے کچھ دنوں کے لیے آرام کیا اور دربار کا نام تک نہ لیا۔

وہاں اس نے وہ مزار بھی دیکھا جو اس نے جہانگیر کی قبر پر بنوایا تھا اور عمر شیخ کی قبر بھی اسی میں شامل کرنے کے لیے اسے کشادہ کرنے کا حکم دیا۔ گزشتہ چند برسوں میں تیمور پہلے سے زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔ وہ اب شطرنج کی بساط پر زیادہ دیر تک غور و فکر کرتا رہتا تھا اور سمرقند میں بہت ہی کم مدت رہتا تھا۔ اس نے اپنے منصوبوں کے متعلق کسی سے ذکر تک نہ کیا مگر عمر شیخ کی موت کے بعد اس نے اپنی دور دراز کی فتوحات کی پہلی کڑی کی تکمیل شروع کر دی۔

نااہل ندیم اور بے وفا ساقی

اب تک تاتاری فاتح نے جنوب کی طرف نگاہ نہ اٹھائی تھی۔ ہندوکش کے اس پار ہندوستان تھا مگر ہندوستان کے ساتھ سوا تجارت کے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ ایران اور اس کے درمیان شور صحراؤں کا وسیع سلسلہ تھا۔

ایران شان و شوکت کی جگہ تھی مگر اب برباد ہو چکا تھا۔ اسلام کے زبردست بادشاہوں کے مرمریں تخت اب ان کے ناخلف اخلاف کے قبضے میں تھے جو پیالے کے گرویدہ ہو چکے تھے اور اپنا وقت ہنسی مذاق میں ضائع کرتے رہتے تھے شہبازوں کے آشیانوں میں کرگس۔

برہنہ زائرین دھوپ تلے تپتے ہوئے نظر آتے۔ درویش ڈھول کی صدا پر ناچتے رہتے مگر ایک آنکھ چمکتے ہوئے سکوں پر لگی رہتی۔ قبیلوں کے سردار خچروں پر سفر کرتے اور ان کے غلام سر پر چھتر کا سایہ کر رہے ہوتے۔ اکثر ریشمی جائے نماز شراب سے گیلی ہوتی رہتی۔ "بہ مے سجادہ رنگیں کن" کی تشریح عملاً ہوتی۔ سفید داڑھیوں پر چرس کی رال عام طور پہ دیکھنے میں آتی۔

اس ملک کی سرزمین سخت تھی مگر سورج کی تپش نے اسے گرد آلود بنا دیا تھا۔ جب چاند نکلتا اور باغوں کی دیواروں کے اوپر سے نظر آتا تو یہ جنت ارضی کا نمونہ بن جاتی۔ مگر جب صحرا کی طرف سے جھلسانے والی لو چلتی تو اس کا رنگ ہی اور نظر آتا۔ تخت جمشید جسے سکندر نے پرسی پولس کے نام سے دیکھا تھا اس کے سفید

نااہل ندیم اور بے وفا ساقی

ستون اسی ملک میں تھے اور زرد سنگ مرمر کے فرش جہاں سمیرامیس کی کنیزوں نے مسحور کن رقص کیے تھے، وہ جگہ بھی اسی سرزمین میں تھی۔

حافظِ شیرازی کا قول تھا کہ ایران کے مغنّی اور موسیقار عجوبہ روزگار تھے۔ اس لیے کہ غیر معمولی موسیقار ہی ایسی لَے پیش کر سکتا ہے جس پر شستے سے چُور شرابی اور بے پیے سامعین یکساں طور پر رقص کناں ہو جائیں۔

مشکل تو یہ تھی کہ ایران عرصے سے دولت مند تھا۔ امیروں کے مزاج شکی تھے اور غریبوں میں تنک مزاجی تھی۔

بادشاہ اپنے بیٹوں کی آنکھیں نکلوا دیتے اور بھائیوں کی موت پر سجدۂ شکر بجا لاتے اور کہتے کہ اب وہ صحیح معنی میں خدا کی زمین کے یکساں طور پر وارث ہیں۔ وہ خود زمین کے اوپر اور بھائی زمین کے نیچے۔ ایک سنکی نے یہیں کہا تھا کہ قسمت بے وقوفوں کی دوست ہوتی ہے اور عالم وہ ہے جس میں روزی کمانے کی صلاحیت نہ ہو۔ خاتون وہ ہے جس کے متعدد عاشق ہوں اور بیوی وہ ہے جس کے عاشقوں کی تعداد کم ہو۔[1]

یہاں اونی لبادہ پہنے صوفی شاعروں سے الہیات اور فلسفے پر سرگرم بحث رہا کرتے۔ یہاں نااہل ندیم اور بے وفا ساقیوں کی افراط تھی۔

لکنتی، مسخرے، الفاظ کے مداری، حریر و پرنیاں پوش بھکاری۔ یہ تھے ان شہزادوں کے ندیم۔ ان میں چند شاعر بھی ہوتے۔ یہ شہزادے ممنوع دختر رز کو بھی عزیز جانتے تھے۔ اور زرہ پہن کر جنگ میں شامل ہونے کے بجائے رزمیہ شاعری کے دلدادہ تھے:

وطن کے نوجواں وطن کی راہ میں شہید ہو۔

البتہ یہ سب کچھ زبانی تھا۔ وہ شہادت کی باتیں ضرور کرتے۔ اس طرف رجوع کرنا

---

[1] ایرانی ادب تاتاریوں کی مملکت میں۔ از ای جی۔ براؤن

ان کے بس کی بات نہ تھی۔

اگر کوئی ان کے مذہب کی توہین کرتا تو اسے سنگسار کر دیتے مگر خود مذہب کی بیگانگی پر بحث "عکس رخ یار" دیکھتے ہوئے کرتے۔ وہ مشرق کے یونانی تھے مگر کبھی کبھی مذہب پر فدا ہونے کو بھی تیار ہو جاتے۔ انھیں تاتاریوں سے نفرت تھی اور انھیں کافر سمجھتے تھے۔

شاہ ِ ساتی جس کے دربار میں حافظ شمع بن کر چمکا تھا غیر معمولی طور پر شیراز کی شراب، شمع و پروانہ اور حسن کا دلدادہ تھا۔ آخری دنوں میں اسے یاد آیا کہ اس نے تیمور سے عرصہ ہوا دوستی کا عہد کیا تھا۔ جب موت قریب ہوئی تو اس نے آخری سفر کی تیاری نہایت سوچ بچار سے شروع کی۔ اپنا کفن اپنے سامنے سلوایا اور تابوت بھی تیار کرایا۔ تیمور کو اس نے عمر بھر نہ دیکھا تھا مگر فرصت کے لمحات میں اسے خط تحریر کرایا:

"جنھوں نے اسے غور سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا ناپائدار ہے۔ علم دوست اس دنیا کی فانی اشیاء کی طرف مائل نہیں ہوتے، نہ وہ حسن اور خوشی کو اہمیت دیتے ہیں اس لیے کہ وہ ان کی ناپائداری کا علم رکھتے ہیں . . . .

"جو عہد نامہ ہمارے درمیان ہوا تھا اس کے متعلق یہ کہنا کافی ہوگا کہ میں اس عظیم الشان دوستی کو بہت بڑی فتح سمجھتا ہوں۔ اور میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ قیامت کے دن میرے ہاتھ میں یہ عہد نامہ ہو تاکہ تم مجھے اسے توڑنے کا مجرم نہ قرار دو . . . .

اس دنیا میں انسان کے ساتھ جو گناہ وابستہ رہتے ہیں ان کے باوجود اور میری تریپن سال کی عمر کی خوشیوں سے پیدا کردہ آلودگیوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کریگا۔ اب میرا وقت قریب آگیا ہے اور میں عنقریب مالک العالمین کی بارگاہ میں پیش ہونے والا ہوں۔ ایسے وقت مجھے اپنے ضمیر کے صاف ہونے پر بڑی خوشی ہے . . . .

نااہل ندیم اور بے وفا ساقی

"مختصراً یہ کہ مَیں نے جس طرح زندگی بسر کی اسی طرح موت کی طرف جا رہا ہوں۔ مَیں نے دنیا کے جھوٹے افتخار ترک کر دیے ہیں۔ بارگاہِ ایزدی میں میری دعا ہے کہ خدا اس بادشاہ (تیمور) کو سلامتی میں رکھے جو سلیمان کی طرح دانا اور سکندر کی طرح عظیم المرتبت ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اپنے لڑکے زین العابدین کی سفارش کرنا ضروری نہیں۔ خدا اسے آپ کے سایے میں خوش و خرم رکھے۔ مگر میں اسے خدا اور آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ میں یہ گستاخی ہرگز نہیں کر سکتا کہ آپ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں گے۔

"مَیں آپ سے اپنے دوست کے حق میں دعائے مغفرت کی گزارش بھی کروں گا۔ آپ کا دوست خوش ہے کہ اس دنیا سے سفر کے وقت اسے آپ جیسے بادشاہ کی دوستی حاصل ہے اور امید ہے کہ آپ کی دعا کے وسیلے سے خدا مجھ پر رحم کریگا۔ اور قیامت کے دن اپنے پیاروں میں اٹھائے گا۔ میں اس سے زیادہ کس شے کا خواستگار ہو سکتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اپنے دوست کی آخری گزارش کو قبولیت کا شرف بخشیں گے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کا خط اور ایسے ہی تحائف کے ساتھ بغداد بھی ارسال کیا گیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد شاہ ایران نے داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔ مملکت کے مختلف حصوں کے لیے دس شہزادے دعویدار بنے۔ ایک کے حصے میں اصفہان آیا۔ دوسرا فارس پر قابض ہوا۔ تیسرے نے شیراز حاصل کیا اور علیٰ ہٰذا القیاس باقی صوبے دوسروں کے ہاتھ آئے۔ ہر ایک نے حکومت کی دکان علٰحدہ سجا دی۔ بعضوں نے اپنے نام کے سکے ضرب کیے اور لگان ہر ایک نے لگائے اور جن علاقوں کے دعویدار وہ اب تک نہ بنے تھے ان پر بھی اپنا حق تسلیم کرانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ یہ سب شہزادے 'مظفر' خاندان کے تھے اور ان کے رویے سے پرانی مثل صحیح ثابت ہوئی:

"چچیرے بھائیوں کی سی نفرت کرنا"

جیسے ہی ۱۳۸۶ء کے موسم سرما کی دھند نے صحرا کے سورج کی چمک مدھم کی تیمور

شمال سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ستر آزمودہ کار لشکر تھے۔ وہ آرام آرام سے آ رہے تھے کہ اصفہان کی شان و شوکت نے انھیں حیران کر دیا۔ گنبدوں کا شہر جس کے خیابان سایہ دار تھے۔ بازاروں پر محراب دار چھتیں تھیں اور پلوں پر بازار کی سی چہل پہل تھی۔ ابن بطوطہ جو ان سے کچھ عرصہ پہلے یہاں سے گزرا تھا اس کا بیان ہے :

"ہم باغات اور خوبصورت دیہات میں سے گزرے۔ یہاں نہریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں اور سڑک کے کنارے کنارے کبوتروں کے چھتے تھے۔ باوجودیکہ فرقہ دار جنگوں سے اسے نقصان پہنچا ہے یہ اب بھی بہت بڑا اور خوبصورت شہر ہے۔ یہاں کے زرد آلو، خربوزے اور بہی نہایت لذیذ ہیں۔ جس طرح ہم افریقہ میں انجیر کو خشک کر لیتے ہیں وہ زرد آلو اور بہی کو خشک کرکے پس انداز کر لیتے ہیں۔ اصفہان کے لوگ قد آور ہیں۔ ان کا رنگ سفید ہے اور سرخی مائل۔ وہ خوش اخلاق ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دعوتیں دیتے ہیں۔ گو وہ بلانے تو کھانے کے نام سے ہیں مگر ریشمی رومالوں کے نیچے انواع و اقسام کی لذیذ مٹھائیاں ڈھکی ہوتی ہیں"

تیمور جب اصفہان پہنچا تو جنگ کے لیے تیار ہونے کے باوجود وہ جنگ کی طرف مائل نہ تھا۔ اسے شاہ کا خط یاد تھا۔ وہ صرف اس بات سے خفا تھا کہ مظفروں نے بے وجہ اس کے سفیر کو روک لیا تھا کئی سال سے وہ ان کے اختلاف کو بھی دیکھتا رہا تھا اور آخر خود آ کر معاملات دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس کے استقبال کے لیے اصفہان کے امرا زین العابدین کے چچا کی قیادت میں شہر کے باہر پہنچے۔ وہ انھیں خندہ پیشانی سے ملا، تحائف پیش کیے اور اپنے پاس قالین پر بٹھا کر اصفہان کے مستقبل کے متعلق گفتگو شروع کی۔

تیمور کو تکلفات سے نفرت تھی۔ اس نے ایسی باتوں کا سلسلہ دفعتہً بند کیا اور کہا :

نا اہل ندیم اور بے وفا ساقی

"میں سب کو امان دیتا ہوں۔ تمھارا شہر بھی برباد نہیں کیا جائے گا البتہ خراج ضرور پیش کرنا ہوگا۔"

"مظفر" جانتے تھے کہ ایک لاکھ کی فوج ایک ہزار میل کی مسافت طے کرکے آنے کے بعد خالی ہاتھ نہیں جا سکتی۔ خراج کی رقم طے پائی اور خراج وصول کرنے کے لیے مغلوں نے نمائندے مانگے۔ شہر کے ہر حصے میں مختلف لشکروں سے ایک ایک سردار روانہ کیا گیا۔ ان سب کی قیادت ایک اعلیٰ مرتبت سردار نے کی۔

دوسرے دن تیمور رسمی طور پر شہر کے اندر سے ہوکر گزرا۔ شہر کے مرکزی خیابان سے ہوتا ہوا وہ واپس معسکر پہنچا اور دروازوں پر فوجی دستے چھوڑتا گیا تاکہ وہ شہر کو اپنے قبضے میں رکھیں۔

اس رات تک بالکل امن و امان تھا۔ ستر ہزار سپاہی دو مہینے کے سفر کے بعد آباد شہر میں پہنچے تھے۔ اس عرصے میں ان کی توجہ مبذول کرنے کے لیے کوئی چیز مہیا نہ ہوئی تھی۔ اب اصفہان کے روشن چراغوں نے ان کے دل میں کسک پیدا کردی تھی۔ جو دستے شہر میں کسی مقصد سے بھیجے جاتے وہ کسی نہ کسی بہانے شہر دیکھنے کے لیے دیر تک رک جاتے۔ بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے بازار جانے کے لیے بہانے تراش لیے تھے۔ خاصے آدمی شہر میں جمع ہوگئے اور شراب خانے ان اجنبی سپاہیوں سے پُر ہوگئے۔

اب جو کچھ ہوا اس کے بیان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ قیاس ہے کہ شہر کے خود سر قسم کے نوجوان ایک لوہار کی رہنمائی میں جمع ہوگئے۔ نقارہ بجایا گیا اور اسلامی جذبات کو اشتعال دیا گیا اور

"اے مسلمانو!"

کا نعرہ لگایا گیا۔

یہ سنتے ہی لوگ گھروں سے نکل آئے اور گلی کوچوں میں مجمع جمع ہو گیا۔ اس وقت تک تاتاری سپاہ نہایت خاموشی سے شہر میں پھر رہی تھی۔ اب فوراً ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ایسے محلے بھی تھے جہاں تیمور کے نمائندے شہر کے عقلمند لوگوں نے بچا لیے مگر اکثر مقامات پر وہ ہجوم کے ہاتھوں بے دردی سے مارے گئے۔

جب ایک بار خون بہ نکلے تو پھر اس کی ندیوں کا رکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہجوم مشتعل ہو چکا تھا اور شہر کے دروازوں پر جو تاتاری دستے مامور تھے ان پر بھی حملہ آور ہوا۔ انھیں تہ تیغ کیا اور دروازے بند کر دیے۔

جب دوسری صبح یہ خبر تیمور تک پہنچی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ قریب قریب تین ہزار تاتاری مارے گئے تھے۔ ان میں تیمور کا ایک منظور نظر امیر اور شیخ علی بہادر کالڑکا بھی شامل تھے۔ تیمور نے فوراً شہر کی فصیل پر پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ ایرانی امراء جو معسکر میں موجود تھے منت سماجت کرتے رہے مگر تیمور نے ان کی طرف توجہ تک نہ کی۔ ہجوم جنگ کا کھیل تھوڑی دیر کے لیے کھیل چکا تھا مگر اب دفاع کا کام ان کے بس کا نہ تھا۔

تیمور نے دروازے پر بلہ بول دیا اور قتل عام کا حکم نافذ کر دیا۔ ہر سپاہی کو حکم تھا کہ ایک ایرانی کا سر پیش کرے۔ شہر کے جو محلے خاموش رہے تھے ان کے متعلق ہدایات تھیں کہ انھیں زک نہ پہنچائی جائے۔ شہر کے شرفاء اور باعزت اشخاص کو بچانے کی کوشش بھی کی گئی۔ باقی ماندہ اشخاص کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا۔ پورا دن قتل عام جاری رہا۔ جو بدقسمت اندھیرے میں بچ کر شہر سے باہر بھاگ گئے تھے انھیں دوسرے دن برف سے ڈھکے ہوئے میدان میں سے ڈھونڈ نکالا گیا اور قتل کیا گیا۔

ایسے تاتاری بھی تھے جو قتل عام میں شہریوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہ چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں سے ایرانی سر خریدنے شروع شروع

ہیں ایک سر کی قیمت ایک دینار تھی۔ بعد میں نصف دینار ہوگئی، پھر ضرورت ختم ہو جانے پر کوئی قیمت ہی نہ رہی۔ ان سروں کو پہلے تو دیوار پر چن دیا گیا مگر بعد میں شہر کے خیابانوں میں کلہ مینار بنائے گئے۔

اس طرح اصفہان کے ستر ہزار کے قریب باشندے مارے گئے۔ اس قتل عام کی نہ تو پہلے سے تجویز تھی اور نہ اس کا کسی کو خیال ہی تھا۔ تیمور اپنے بے گناہ سپاہیوں کا بدلہ لینے پر مجبور تھا مگر یہ بدلہ انتہائی سنگین اور بے درد تھا۔ باقی مظفری شہزادے اس قتل کی خبر سن کر سہم گئے اور خاموشی سے اطاعت قبول کرلی۔ سوا منصور کے جو پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔

شیراز اور دوسرے شہروں نے خاموشی سے خراج ادا کردیا۔ تیمور کا نام خطبے میں شامل کیا جانے لگا۔ ہر مظفری شہزادے کو اس نے حکومت کا پروانہ دیا جس پر تیمور کی مہر ثبت تھی۔ اب وہ اس کی طرف سے صوبوں کے حاکم تھے اور وہ حکمران اعلیٰ، بادشاہِ مطلق۔ مملکتِ ایران ان کے تصرف میں صرف اس وقت تک رہ سکتی تھی جب تک تیمور ان سے خوش تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایران کے باشندوں پر نہایت بے جا بدگمان لگے ہوئے تھے۔ اس نے اس کا ازالہ بھی کیا۔

کہا جاتا ہے کہ شیراز میں اس نے حافظ شیراز کو بلا بھیجا۔ حافظ نہایت سادہ سے درویشانہ لباس میں حاضر ہوا جس سے شاید اپنی غریبی ظاہر کرنا مقصود تھا۔

تیمور نے ذرا خفگی سے پوچھا:

"کیا یہ تمہارے اشعار ہیں؟"

پھر یہ شعر پڑھا

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا

بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

"ہاں، اے شاہِ شاہاں یہ میرا ہی شعر ہے" حافظ نے جواب دیا۔
تیمور نے حافظ سے کہا:۔
"جانتے ہو میں نے بعد مشکل سمرقند حاصل کیا ہے اور اب دنیا کے باقی شہر اس لیے فتح کر رہا ہوں کہ شیراز کے حسن کو چار چاند لگاؤں، اور تم شیراز کے ایک غریب شاعر اتنے فراخدل بنتے ہو کہ دو کوڑی کے معشوق کو سمرقند بخش رہے ہو۔"
شاعر ایک لمحہ رک گیا، پھر مسکرا کر کہا۔
"شاہا! اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ آج اس افلاس زدہ حالت میں ہوں جو آپ دیکھ رہے ہیں" تیمور اس جواب سے خوش ہوا اور حافظ شیراز کی غریبی کا علاج کر دیا۔
ایران کے درباروں کے کئی شاعر تیمور کے ساتھ سمرقند گئے۔ مگر جنوب کے ہم پیالہ ندیم و ساقی کے اثرات سے تیمور کو بعد میں افسوس کرنا پڑا۔ اس کا تیسرا بیٹا میراں شاہ شروع سے خودسر تھا اور شراب کا دلدادہ تھا یہ درست کہ وقت پڑنے پر دلیر بھی تھا مگر حد درجہ ظالم اور سفاک۔ اس کا رویہ صرف اس وقت درست رہتا جب وہ تیمور کے ہمراہ کسی مہم میں شریک ہوتا۔
کئی سال بعد تیمور نے کوہ قاف کے علاقے کی حکومت میراں شاہ کو سونپی ہندوستان کی مہم پر ایک سال گزارنے کے بعد وہ لوٹا تو اس نے سنا کہ اس کا لڑکا نیم پاگل ہو چکا تھا۔ تاتاری افسروں نے عجیب و غریب بے وقوفی کی حرکتوں کی تفصیل پیش کی۔ جھروکے سے ہجوم پر زر و جواہر کی بارش اور عین مسجد کے فرش پر شراب خوری کی محفلیں انھوں نے بتایا کہ میراں شاہ کہتا ہے "میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو دنیا کا حکمران ہے۔ کیا ایسا کوئی کام نہیں جس سے میری یاد قائم رہے؟"
اور اس نے تبریز اور سلطانیہ میں مرقض خانوں اور محلوں کو مسمار کرنے کے احکام صادر کیے تھے۔ تیمور کے بیٹے کا حکم تاتاریوں کی نگاہ میں انکار سے بالاتر تھا اس لیے

اس پر فوراً عمل کیا گیا مگر اس سے بعد کے احکام کچھ کم نہ تھے۔ اس کے حکم سے ایک مشہور ایرانی شاعر کی لاش قبر سے کھود کر نکالی گئی اور یہودیوں کے قبرستان میں منتقل کی گئی۔ میراں شاہ کا ذہن شراب اور نشہ آور اشیاء سے معطل ہو چکا تھا۔

تیموری افسروں نے کہا:

"نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس پر خدا نے یہ عذاب ڈالا ہے اسی لیے تو جب وہ گھوڑے سے گرا تھا اس کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔"

جب وہ چلے گئے تو ایک عورت تیمور کے دروازے پر حاضر ہوئی۔ وہ نقاب اوڑھے ہوئے تھی اور سیاہ لباس میں تھی۔ اس کے ساتھ کوئی ملازم یا غلام نہ تھا۔ مگر اس کے ایک لفظ کہنے سے تیمور کا دروازہ کھول دیا گیا۔ دربانوں نے سر جھکا لیے اور محل کا حاجب اسی وقت تیمور کے حضور میں حاضر ہوا۔

"بادشاہ کی بیٹی باریابی کی منتظر ہے اور تنہا آنا چاہتی ہے۔" اس نے اطلاع دی۔ یہ خان زادی تھی جو تیمور کے پہلے بچے کی دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ اس کے محل میں حاضر ہوئی تھی اور منتظر رہی تھی کہ سردار چلے جائیں تو باریابی حاصل کرے۔ سیاہ لباس اس کا حسن دوبالا کر رہا تھا۔ اس نے نقاب الٹا اور تیمور کے پاؤں پر گر پڑی۔

"اے امیروں کے امیر!" اس نے رو کر کہا "میں تمہارے بیٹے میراں شاہ کے شہر سے آئی ہوں۔"

اس نے دنیا کے فاتح کے سامنے نہایت دلیری سے اپنے بیان دیے۔ پہلی بار اس نے اپنا دماغ اپنی قوم کو بچانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس کے لہجے میں مبہم سی فتح کی گونج تھی جن کو الفاظ کی شکل نہ دی گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے ملازموں اور اپنے دربار کے ساتھ میراں شاہ کے دارالحکومت میں رہتی تھی جب میراں شاہ کا دماغ پھر گیا اور وہ تخریب اور برائی کی طرف مائل ہوا تو خان زادی نے اسے سمجھانے کی کوشش

کی۔ اس کے ملازموں کے روکنے کے باوجود وہ اسے زبردستی اپنے محل میں لے گیا۔ اس کے حسن سے اپنی نفسانیت کی بھوک کو مٹایا، پھر اسی کو موردِ الزام ٹھہرایا۔

"اے امیر تیمور" اس نے رو کر کہا "میں تم سے پناہ کی درخواست کرتی ہوں اور شاہوں کے عدل کی بھیک مانگتی ہوں۔"

خان زادی اس شخص کی بیوہ تھی جو تیمور کا چہیتا بیٹا تھا اور جسے اس نے ہمیشہ اپنا جانشین سمجھا تھا۔ تاتاری رسم کے مطابق اب تاج و تخت کا مالک میراں شاہ تھا۔ زندہ بیٹوں میں سب سے بڑا۔ صحرا میں بسنے والے خوانین کے زمانے سے یہ دستور چلا آیا تھا کہ بادشاہ کے پہلے چار بیٹے اس کے وارث ہو سکتے تھے۔ جہانگیر اور عمر شیخ قبر میں جا چکے تھے۔ اب میراں شاہ اور سب سے چھوٹا شاہ رُخ ہی زندہ تھے۔ شاہ رُخ ملکہ سرائے خانم کا بیٹا تھا مگر شاہ رُخ خان زادی اور جہانگیر کے بیٹے سے تھوڑا ہی بڑا تھا اور شاہ رُخ بھائیوں سے مختلف تھا۔ نفیس و نرم مزاج جو حکومت کی نسبت کتابوں کی طرف زیادہ مائل تھا۔

جانشینی کا مسئلہ اب میراں شاہ اور خان زادی کے لڑکے کے مابین رہ گیا تھا۔ تیمور نے بڑے شہزادے کو بہت وسیع مملکت سونپی تھی مگر اس نے عیاشی کی وجہ سے مملکت کا انتظام درہم برہم کر دیا تھا۔ ممکن ہے کہ خان زادی نے میراں شاہ کے شہر میں سکونت اسی لیے کی ہو کہ اسے اکسائے اور شاید اس بے پناہ مگر معصوم حسن نے یہ آگ لگا دی ہو۔

سالہا سال بعد خلیل کے گرد وہ کشمکش اٹھ کھڑی ہوئی جس کی پیش بینی خان زادی کے امکان سے بھی بالاتر تھی۔

سر دست اس کی دلیری قابلِ تعریف تھی۔ اس نے نوشیرواں عادل سے عدل کی درخواست کی تھی۔ مدعا علیہ اس عادل کا اپنا بیٹا تھا۔ وہ بے خوف اس کے سامنے

نا اہل ندیم اور بے وفا ساقی

لکڑی عدل و انصاف مانگ رہی تھی اور تیمور نے فیصلہ دینے میں دیر نہ کی۔ خان زادی کے تمام مالی نقصانات کی فوراً تلافی کر دی گئی۔ اسے نئے غلام اور کنیزیں عطا ہوئیں اور جہانگیر کی بیوی جن مناصب کی حق دار تھی وہ اسے عطا ہوئے۔ وہ ایک دور دراز سفر سے اسی وقت لوٹا تھا مگر اس نے اسی وقت گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا اور سلطانیہ کا رخ کیا۔

وہاں جب اس نے میراں شاہ کی بربادیوں کی تحقیق کر لی تو اسی وقت اس کی موت کے احکام جاری کر دیے۔ تمام امرا نے میراں شاہ کی سفارش کی۔ وہی امراء جنھیں اس کے ہاتھوں نقصان پہنچے تھے۔ میراں شاہ کے گلے میں رسی ڈال کر اسے باپ کے سامنے لایا گیا۔ بادشاہ باپ کا مجرم بیٹا۔

تیمور نے امراء کے کہنے سے اس کی جان بخشی تو کر دی مگر اس سے تمام اختیارات اور مناصب چھین لیے گئے۔ مضمحل طبیعت، تمام طاقت چھنی ہوئی۔ اب اسے اسی صوبے میں رہنا پڑا جہاں اس کی جگہ کوئی اور حکمران مقرر ہوا۔

کچھ ہی عرصہ بعد ریوڈی گانزلیس کا لویخو کیسٹل کے دربار سے سمرقند جاتے ہوئے سلطانیہ سے گزرا۔ وہاں جو کچھ اس نے سنا، اسے نہایت سادگی سے قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"جب میراں شاہ نے یہ باتیں کیں تو اس وقت اس کے پاس گان زادہ نامی ایک عورت تھی وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی اور بھیس بدل کر دن رات سفر کرتی ہوئی امیر تیمور کے پاس پہنچی۔ اسے اس نے میراں شاہ کے تمام کارنامے بتائے۔ اس کی وجہ سے تیمور نے اپنے بیٹے سے حکومت لے لی۔ یہ عورت گان زادہ تیمور کے پاس ہی رہی اور وہ اس کے ساتھ نہایت احترام سے پیش آیا۔ اور اسے واپس جانے کی اجازت نہ دی۔ مگر میراں شاہ سے اس کا ایک لڑکا ہوا جس کا نام خلیل سلطان تھا۔"

میران شاہ کے ساتھیوں پر تیمور کا قہر نہایت سختی سے گرا۔ تنک بند، مسخرے اور بعض مشہور شعرا بھی، شہزادے کے ہم پیالہ ندیم، یہ سب جلّاد کے سامنے لائے گئے۔ کہتے ہیں کہ درباری مسخرہ وہاں بھی اپنی عادت سے باز نہ آیا۔ وہ اپنے سے بلند مرتبت ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

"شہزادے کے دربار میں آپ کو مجھ پر فوقیت حاصل تھی۔ یہاں بھی آپ پہلے چلیے۔

مملکت

۱۳۸۸ء میں جب اس کی عمر ترپن ۵۳ برس کی تھی تیمور بلا شرکت غیرے فتنہ و بغاوت کے لیے معروف وسیع خطے کا مالک تھا جسے وسطی ایشیا اور ایران کا نام دیا جاتا ہے ۔ سوا نام کے وہ ہر معنی میں شہنشاہ تھا مگر صرف امیر تیمور گورگان کہلاتا تھا۔ اس کا برائے نام بادشاہ اب بھی خان تھا۔ چنگیز کی نسل کا مطرہ۔

خان کے ہاتھ میں کسی قسم کی طاقت نہ تھی اور نہ اس کا کوئی فریضہ ہی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوج کے ایک لشکر کا کماندار ضرور تھا اور سمرقند میں اس کے تصرف میں ایک محل بھی تھا۔ بعض رسوم کے موقع پر وہ موجود ہوتا تھا۔ مثلاً سفید گھوڑے کی قربانی کے وقت جس سے عہد ناموں کی توثیق مراد ہوا کرتی تھی۔ یا جب سالانہ معاینہ ہوا کرتا اور تیموری علم کی سلامی دو لاکھ فوج دیا کرتی ۔ تاریخوں میں اس کا نام شاذونادر ہی آتا ہے ۔ جوں جوں تیمور کا بخت ظفر چمکتا گیا خان کا ستارہ مدھم ہوتا گیا ۔ وہ اس کے باوجود اس فوجی شان و شوکت کے ماحول میں از حد خوش تھا اور اپنی زندگی کے دن اس نے بغیر شکایت کے گزار دیے۔

تیمور کی اس بڑھتی ہوئی مملکت کا بھی کوئی نام نہ تھا۔ وہ اب بھی ماوراء النہر کا امیر کہلاتا تھا باوجودیکہ اس کا نام ان تمام ممالک کے خطبوں میں پڑھا جاتا تھا جن کا اپنا نام تو تھا مگر جو کسی نام کی مملکت میں شامل نہ تھے۔

اس کی طاقت کا راز نہایت سادہ تھا۔ وسطی ایشیا کے باشندے ہمیشہ

سے اپنے قبائلی سرداروں کے تحت رہتے تھے۔ اگر وہ کبھی اپنے سفید ریش سے ناخوش ہوتے تو کسی دوسرے ملک میں چلے جاتے اور اپنی جانیں وہاں کے سردار کے ہاتھوں میں دے دیتے۔ جب وہ ناخوش ہوتے تو بعید نہ تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنا سردار مقرر کر لیتے اور اس کے نمکخوار بن جاتے۔ ایک بار اپنا سردار چن لینے کے بعد اس کے لیے جان دینے سے دریغ نہ کرتے۔

وہ اپنے نام اور اپنے قبیلے پر فخر کیا کرتے۔ شخصی آزادی اور رسوم کے تحفظ اور مفاد کے تحفظ میں وہ جان پر کھیل جاتے۔ وہ مطلق العنان بادشاہوں کے گرویدہ تھے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی شخصی آزادی کے محافظ بھی تھے اور نئی اختراعات سے وہ ہمیشہ ڈرتے رہتے۔ خانہ بدوشی کی پیداوار۔ بادشاہوں کے پرستار اور غارتگروں اور لٹیروں میں نمایاں ہونے کے باوجود جب وہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گدھوں کی طرح حلقہ بنا کر بیٹھتے تو وہ سلیمان بادشاہ کی کہانیاں، سکندر اعظم ذوالقرنین کی فتوحات اور سنہری تخت پر بیٹھنے والے محمود کے قصے نہایت روانی سے سنتے اور سناتے۔ وہ نہایت فخر سے اپنے شجرۂ نسب کو نوح تک لے جاتے اور اپنے آپ کو پیغمبروں کی نسل بتاتے۔

حج کی راہ پر جتنے مزار تھے وہ ان سے واقف تھے اور ان کی تاریخ جانتے تھے۔ وہ انجیل سے بھی واقف تھے۔ ادب کے شہپارے اور شعراء کے کلام انھیں حفظ تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انھیں اپنے شجرہ ہائے نسب یاد تھے جنھیں وہ طوفانِ نوح تک لے جاتے تھے۔ حکومت کے قوانین کی انھیں ہرگز پروا نہ ہوتی۔ البتہ قبائلی روایات کے لیے وہ جان دینے پر آمادہ رہتے۔ سود خواری کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور ایسے لگان لینے والے جو انھیں تنگ کرتے، اکثر ان کے خنجر کا شکار ہو جاتے۔ وہ اس وقت تک تیمور کے ساتھ لڑتے رہے جب تک وہ اس مقابلے کی

بے بضاعتی کے قائل نہ ہو گئے ۔ پھر وہ آئے اور اس کے لشکر میں شریک ہو گئے۔ ان پر حکومت کرنے کے لیے طاقتور فولادی ہاتھوں کی آہنی گرفت کی ضرورت ہوتی تھی۔

وہ آج تک کبھی متحد نہ ہوئے تھے۔ محمود نے ان میں سے چند ایک کو اپنے علم کے نیچے یکجا کیا تھا۔ چنگیز خاں ان کے درمیان سے ہو کر گذرا تھا اور انھیں اپنے ساتھ یکجا کرتا ہوا آگے بڑھا تھا مگر اس کی موت پر وہ ایک بار پھر نئے اور متعدد سرداروں کے نیچے بٹ کر منتشر ہو گئے تھے۔ اسے واسطے انتشار!

اب وہ صرف ایک بات میں متحد تھے یعنی تیمور کی اطاعت۔ انھیں یکجا کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا بھیڑیوں کو چابک سے قابو میں رکھنا۔

دنیا میں کوئی ایسا قانون نہ تھا جو انھیں قابو میں رکھ سکے۔ ان کی روایات ہی کچھ ایسی تھیں۔ کاشغر کے پشت سبز ڈھونڈنے والے، ہندوکش کے ٹیرے کو ہستانی۔ جاٹ اور سنہری غول کے بقیۃ السیف، سرزمین آفتاب کے ایرانی شہزادے اور عرب کے پُر وقار و باعزت شہسوار۔

انھیں قابو میں رکھنے کے لیے تیمور کا لفظ قانون تھا۔ اپنی مملکت کی نئی اقوام اور نئے قبائل کے لیے خود احکام نافذ کرتا جس کی ہمت پڑتی وہ باریابی حاصل کر سکتا تھا۔ اس کا کوئی خاص منظور نظر نہ تھا جس کا کہا ماننے پر اسے مجبور ہونا پڑتا۔ جب کوئی نیا ملک فتح ہوتا یا خود بخود الحاق کا خواہشمند ہوتا تو وہ امیر تیمور کے ایک بیٹے یا کسی پرانے خدمت گزار امیر کو بطور صوبہ داری یا جاگیر عطا کیا جاتا۔ یہ نیا ملک اب صوبے کی صورت اختیار کر لیتا اور اس کا حاکم داروغہ کہلاتا جو براہ راست تیمور کے احکام کے تحت ہوتا۔ داروغے کے علاوہ قاضی بھی متعین کیا جاتا۔ فوج کے سپاہی اپنی مرضی سے بھرتی ہوتے البتہ فنکار اور مزدور جبراً بھرتی کیے جاتے۔ اس ملک کے سابق حکمران اور امراء کو دربار میں منتقل کر کے انھیں نئے مناصب اور نئی ذمہ داریاں

سونپی جاتیں۔ اگر اس کے بعد وہ شرارت کے مرتکب ہوتے تو زنجیروں میں جکڑ دیے جاتے یا قتل کر دیے جاتے۔

تیمور کی ان تھک طبیعت شکست و ناکامی کو قبول نہ کر سکتی تھی۔ اگر وہ کسی ٹوٹے ہوئے پُل کے اُوپر سے گزرتا تو حاکمِ صوبہ کو اسے مرمت کرنے کا حکم دیا جاتا۔ پُرانی کاروان سراؤں کی مرمت کی گئی اور مناسب مقامات پر نئی سرائیں تعمیر کی گئیں۔ تمام شاہراہوں کو موسم سرما میں کھُلا رکھنے کے انتظامات موجود تھے اور جگہ جگہ محافظ دستوں کے رہنے کے لیے ان شاہراہوں کے اوپر چوکیاں تعمیر کی گئی تھیں۔ محافظ چوکیوں کے افسر ڈاک کے گھوڑوں کے ذمہ دار تھے اور کاروانوں کی حفاظت بھی اُنھیں کی ذمہ داری تھی۔ اس حفاظت کے بدلے کاروانوں سے کچھ رقم وصول کی جاتی تھی۔

ہسپانیہ کے سفیر کلاویخو نے خراسان کی شاہراہ کی تفاصیل اس طرح بیان کی ہیں:

"وہ (مسافر) راستے کے کنارے کشادہ مکانوں میں سوتے تھے۔ ان مکانوں میں ویسے کوئی نہ رہتا تھا۔ دُور دراز فاصلے سے اِن مکانوں تک زیرِ زمین نالیوں سے پانی لایا جاتا تھا۔

سڑک کی سطح نہایت ہموار تھی اور اس کے اوپر ایک پتھر بھی نظر نہ آتا تھا جب وہ منزل پر پہنچتے تو انھیں کافی مقدار میں گوشت دیا جاتا اور تازہ دم گھوڑے فراہم کیے جاتے۔ بادشاہ (امیر تیمور) نے انتظام کر رکھا تھا کہ ہر منزل پر گھوڑے موجود ہوں۔ کہیں ایک سو میل کے فاصلے پر اور کہیں دو سو میل کے فاصلے پر۔ یہ سلسلہ سمرقند تک جاری تھا۔

جن لوگوں کو امیر مختلف سمتوں میں روانہ کرتا یا جو امیر کی طرف جا رہے ہوتے وہ ان گھوڑوں پر انتہائی تیز رفتار سے سفر کرتے اور دن رات سفر میں رہتے۔ صحرا

بیں بھی اس نے گھوڑوں کا انتظام کر رکھا تھا غیر آباد علاقوں میں بھی مکانات موجود تھے جہاں قریب ترین گاؤں اشیائے خوردنی اور گھوڑے مہیا کرتے تھے۔ ان گھوڑوں کی غور پرداخت کرنے والوں کو انجو کہا جاتا تھا۔

جب سفیر پہنچتے تو یہ لوگ ان کے گھوڑوں کو پکڑ لیتے۔ ان کے زین اتارتے اور نئے گھوڑوں پر زین کس دیتے۔ ایک یا دو انجو اُن کے ساتھ جاتے تاکہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کر سکیں اور دوسری منزل سے لوٹ آتے۔

اگر راستے میں کوئی گھوڑا تھک جاتا اور کوئی دوسرا گھوڑا نہ مل سکتا تو وہ اس گھوڑے سے اسے بدل لیتے۔ یہاں کا دستور تھا کہ چاہے کوئی سردار ہو یا امیر، سفیر ہو یا تاجر اسے اپنا گھوڑا اس شخص کی خدمت میں پیش کرنا ہوتا تھا جو بادشاہ کی طرف جا رہا ہوتا۔ اگر وہ گھوڑا دینے سے انکار کرتا تو اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ یہی امیر تیمور کا حکم تھا۔

وہ فوجیوں سے بھی گھوڑے لے لیتے تھے۔ اور تو اور خود بادشاہ کے بیٹے اور اس کی ملکہ سے بھی گھوڑے لیے جاتے۔

صرف یہی نہیں کہ سڑک پر گھوڑے موجود ہوتے تھے بلکہ ہر مقام پر پیغام رساں بھی موجود ہوتے۔ تاکہ ہر صوبے سے خبریں جلد از جلد پہنچ جائیں۔ بادشاہ اس شخص سے بہت خوش ہوتا جو دن رات میں پچاس فرسخ طے کر لیتا، چاہے اس کے نیچے دو گھوڑے کیوں نہ مر جاتے، بہ نسبت اس شخص کے جو اس فاصلے کو تین دن میں طے کرتا۔ بادشاہ نے جب یہ دیکھا کہ سمرقند کی مملکت میں فرسخ کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ اس نے ایک فرسخ کے دو فرسخ بنا دیے۔ ہر فرسخ پر ایک پتھر گاڑ دیا گیا۔ اور تمام نگاہبتوں کو احکام جاری کر دیے کہ دن میں کم از کم دس بارہ فرسخ سفر کیا کریں یہاں کا ایک فرسخ کیسٹل کے دو فرسخ کے برابر ہے۔

جو فاصلہ یہ لوگ دن رات طے کرتے رہتے ہیں وہ باور نہیں کیا جاسکتا اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بعض دفعہ دن رات میں پندرہ بیس فرسنخ[1] چلے جاتے ہیں جب ان کے گھوڑے تھک کر چور ہو جاتے ہیں وہ انھیں مار ڈالتے ہیں یا بیچ دیتے ہیں۔ ہم نے راستے میں کئی گھوڑے دیکھے جو زیادہ سواری کی وجہ سے راستے ہی میں مر گئے تھے"۔

کالویخو یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض کارواں سرائیں ایسی بھی تھیں کہ وہاں فواروں کے نیچے برف محفوظ کی گئی تھی۔ پاس ہی پتیل کے جگ پڑے رہتے تھے اور جو چاہتا ٹھنڈا پانی نکال کر پی سکتا تھا۔

ان شاہراہوں پہ ہرکارے خبریں لیے ہر طرف مسلسل سفر کرتے رہتے تاکہ تیمور مملکت کے حالات سے مطلع رہے۔ سرحد کے سانڈنی سوار، حدود مملکت پر مامور سپہ سالار اور صوبوں کے دارالحکومتے متواتر خبریں روانہ کرتے رہتے۔ ہر صوبے میں اور صوبے کے ہر شہر بلکہ ہر کارواں سرائیں استخبارات کے افسر وقتاً فوقتاً اپنی خفیہ یادداشتیں تحریر کرتے رہتے اور تیمور تک پہنچاتے رہتے۔ تیمور کو یہ اطلاع بھی پہنچتی رہتی کہ کون کون سی شاہراہ پر کون سے کارواں کس طرف جارہے ہیں۔ اس کے افسروں کی اطلاعات بالکل صحیح ہوتیں۔ اگر کوئی شخص غلط اطلاع بھیجتا تو اسے فوراً قتل کر دیا جاتا۔

تیمور کی اطلاعات مکمل ہوتی تھیں اور یلغار کے شروع ہونے سے پہلے یقینی طور پر

---

[1] پچاس سے پچھتر میل تک۔ کالویخو کے ترگانی اس وقت کے چغتائی اور جاٹ ہیں۔ سڑکوں کی یہ تفصیل کالویخو کی اس کتاب سے لی گئی ہیں جو اس نے ۱۴۰۳ء اور ۱۴۰۶ء میں لکھی۔ NARATIVE OF THE EMBASSY DE GANSALES CLAVIJO TO THE COURT OF TAIMUR AT SAMARKAND

اسی تحریر سے بعض تاریخوں میں یہ غلط بیانی کی گئی ہے کہ تیمور نے اپنے سرداروں کو حکم دے رکھا تھا وہ دن میں ساٹھ میل سفر کیا کریں۔

اس کا طریقہ تیز ترین تھا۔

جاگداد اور زمین کی ملکیت کے معاملات میں بھی اس کے فیصلے قاطع اور عادلانہ ہوا کرتے تھے۔ اس کے سپاہی شاہی خزانے سے تنخواہ وصول کیا کرتے تھے اور انھیں مقامی باشندوں پر کسی قسم کا لگان لگانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کا کوئی بھی سپاہی کسی باشندے کے گھر میں بے وجہ داخل نہ ہو سکتا تھا۔

غیر آباد علاقے اور لاوارث زمینی جائدادوں کی ملکیت کا حق تاج و تخت کو تھا مگر کوئی دہقان یا زمیندار کسی غیر آباد زمین کو آبپاشی کے ذریعے سے آباد کرنا چاہتا یا اس پر عمارت اونچی تعمیر کرنا چاہتا تو اسے پہلے سال کے لیے مالیہ وغیرہ معاف ہوتا تھا۔ دوسرے سال مالیے کی رقم اس کے اپنے فیصلے پر چھوڑی جاتی تھی اور تیسرے سال اس کا باقاعدہ حساب لگایا جاتا تھا۔

مالیہ اس وقت لگایا جاتا جب فصلیں کٹ کر گھروں میں آجاتیں۔ عام طور پر ایک تہائی حکومت کا حصہ تصور کیا جاتا تھا جو دونوں طرح ادا ہو سکتا تھا۔ اصل شے یا اس کی قیمت جو چاندی کے سکوں میں ادا کی جاتی۔ مالیے کا نرخ بارانی زمین کے لیے کم اور آبی زمین کے لیے زیادہ تھا۔ اگر حکومت بند تعمیر کر کے پانی کا انتظام کرتی تو دہقان کو اس کا لگان بھی ادا کرنا پڑتا۔

بیرونی ملکوں کے تاجر جو باہر سے سامان تجارت لاتے انھیں راستے کے لگان کے علاوہ درآمدی لگان بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی رقم اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔ اُن دنوں یورپ جانے والے قافلے مصر کے رستے جانے سے گریز کرتے تھے کیونکہ وہاں مملوکوں کا دور دورہ تھا جن کے تعلقات عیسائی مملکتوں کے ساتھ اچھے نہ تھے۔

مغرب کی تجارت صحرائے گوبی سے گزر کر المعیک ہوتی ہوئی سمرقند پہنچتی تھی اور اس کے بعد سلطانیہ اور تبریز یا بحیرۂ اسود اور استنبول کو جاتی تھی۔ یہ تھی خراسان کی عظیم

شاہراہ۔ اس کی ایک شاخ شمال کی جانب ہو جاتی تھی۔ اُور گنج سے ہو کر بحیرہ خزر کے شمال سے گزرتی ہوئی روسی سرحد کے ساتھ ساتھ جا کر جینوا پہنچتی تھی۔ تیسرا راستہ ایران میں سے ہو کر ہندوستان کو جاتا تھا۔

سمندر کے راستے بہت کم تجارت ہوتی تھی۔ بعض موقعوں پر عرب ہندوستان کے جنوب سے ہو کر سنہری جزیرہ سونیر اور خطا کو جاتے تھے اور چینی جہاز بھی خلیج بنگال تک ساحل کے ساتھ ساتھ آتے تھے۔ مگر یہ دلیری جہازوں کے مالک اور امیر سیاح ہی کبھی کبھار کرتے تھے۔ اس کے برعکس دریاؤں میں جہاز رانی کافی مقدار میں ہوتی تھی۔ آمو دریا کے راستے اُور گنج تک۔ ہندوستان میں دریائے سندھ کے راستے سمندر تک اور اسی طرح دجلہ اور فرات میں بھی۔

اس عرصے میں تیمور نے ہندوستان جانے کے دو راستے صاف کر دیے تھے۔ ایک تو درۂ خیبر کا راستہ اور دوسرا قندھار سے ہوتا ہوا ویران علاقوں سے گزر کر دریائے سندھ تک جاتا تھا۔ ایک ہی مہم میں اس نے سجستان کے والی کو مطیع کر لیا تھا۔ اسی والیٔ سجستان کو عرصہ ہوا تیمور نے خیال کی بغاوت فرو کرنے میں مدد دی تھی اور اسی کی ملازمت میں وہ عمر بھر کے لیے لنگڑا ہوا تھا۔

دوسری مہم میں تیمور شیراز کے صحرا کو عبور کرتا ہوا خلیج فارس تک جا پہنچا تھا۔ خلیج فارس کی بندرگاہوں سے جہاز ایک طرف تو بغداد تک جاتے تھے اور دوسری طرف دریائے سندھ کی بندرگاہوں تک۔ مالِ تجارت لے کر جاتے تھے۔

مغرب کی سمت اس نے سیاہ بھیڑوں والے ترکمانوں کے حصار ختم کیے تھے اور سنگِ مرمر سے بنے ہوئے موصل کو بھی۔ دجلہ کے شمالی حصے میں سمرقند سے پندرہ سو میل دُور کے قلعے بھی اس کے ہاتھ میں تھے۔ یہاں سے وہ تبریز کی تاریخی اور تجارتی شاہراہ کو اپنی مملکت میں محفوظ رکھ سکتا تھا۔ تبریز میں سے ہو کر خراسان کی شاہراہ کی

شمالی جنوبی شاخ گزرتی۔ اس مرکزی شہر کی آبادی دس لاکھ سے زائد تھی۔ صرف تبریز سے تیمور کی سالانہ آمدنی شاہ فرانس کی آمدنی سے زیادہ تھی[1]۔

معلوم ہوتا کہ اتنے بڑے شہر میں اشخاص پر کوئی لگان نہ تھا۔ شہر کے زعماء کی مجلس تیمور کے داروغہ کو شہر کی طرف سے ایک لگان ادا کیا کرتی تھی۔ یہ خراج کی صورت میں تھا اور جب تک یہ خراج ادا ہوتا رہتا اس وقت تک شہر کی حفاظت کا ذمہ دار تیمور تھا۔

تاجروں کے لیے تیمور کی مملکت کا وجود ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ وہ پانچ مہینے تیمور کے سپاہیوں کی حفاظت میں سفر کرتے اور صرف ایک بار درآمدی لگان ادا کرتے۔

چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کے لیے تیمور کی حکومت اس سے کم فائدہ مند نہ تھی۔ وہ اب آزادی سے اپنے کام کاج میں مشغول رہتے اور انھیں جاگیرداروں کے مظالم کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ تیمور ملکی معاملات کو خوب سمجھتا تھا۔ جو آدمی مالی طور پر تباہ ہو جاتے وہ کسی مصرف کا نہیں رہتا اور جو ملک تباہ و برباد ہو جائے اس سے کسی بادشاہ کے خزانے کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ خزانے ہی کے سر پہ فوج کا انحصار تھا اور فوج ہی کے وجود سے مملکت قائم رہ سکتی تھی۔ اگر فوج قابو میں نہ ہوتی تو وہ جہاں سے چاہتی پانی چھین لیتی اور مزروعہ زمینوں میں سے گزر کر انھیں تباہ کر دیتی یا ان فصلوں کو اپنے تصرف میں لے آتی تو کاشتکاروں کے ساتھ ساتھ ملک بھی تباہ ہوتا اور خزانہ خالی ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا۔

---

[1] جس قدر ہمعصر تاریخی مواد مل سکا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چین کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے بڑا شہر اس وقت تبریز تھا۔ سمرقند، دمشق اور بغداد اس سے چھوٹے تھے۔ البتہ ان کی سرکاری اور شہری عمارات زیادہ بلند اور وسیع تھیں مگر یہاں کی عمارات بھی چودھویں صدی کی روم یا وینس کی عمارات سے کہیں زیادہ بہتر تھیں۔

تیمور کمزوری کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس نے مختلف شہروں کے بھکاریوں اور گداگروں کا خاتمہ کرنا چاہا۔ اس خیال سے اس نے گداگری کو ممنوع قرار دیا اور ان کا روزینہ مقرر کیا۔ مگر وہ روزینے کر بھی گلی گلی اور کوچہ کوچہ 'یا حق'، 'یا اللہ' اور 'یا رحیم' کا نعرہ لگاتے ہوئے اپنا کاسہ آگے بڑھا دیتے۔ ان میں درویش بھی تھے، اندھے، کوڑھی، بدمعاش اور چور بھی تھے۔ اور سبھی گداگر کے نام سے موسوم تھے۔ یہ اس عصر کے اسلامی ممالک کا خاصہ تھا اور تیمور کے سپاہی بیکاران کا قلع قمع کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے۔

چوروں اور ڈاکوؤں کے معاملے میں اسے نسبتاً زیادہ کامیابی ہوئی۔ راستوں کے محافظ دستوں کا افسر اور شہر کا ہر قاضی اپنے اپنے علاقے کا ذمہ دار تھا۔ اگر کوئی شے چوری ہو جاتی تو انھیں اس کا بدل دینا پڑتا۔

بایں ہمہ قانونِ تیموری کا انحصار تیمور کی خواہش پر مبنی تھا۔ اس کے اپنے ملک کے باہر اس کے احکام ابھی نئے تھے اور ان کا اجرا ابھی مکمل طور پر نہ ہو سکا تھا۔ کہیں کہیں بغاوت رونما ہو جاتی اور وہ امن قائم کرنے کی غرض سے ہمیشہ سفر میں رہتا۔ اس کی بے پناہ شخصیت کے زیرِ اثر اس کی فوج ایک نہایت منضبط مشین بن چکی تھی جو فتوحات کی عادی ہو چکی تھی اور جسے آزمودہ کار دلیر قائد میسر تھے۔

اس مشین پر اسے فخر تھا اور اسی مشین سے اب اس نے پورے ایشیا کو فتح کرنے کا تہیہ کیا۔

سواری میں

ان چند سال میں تیمور کو پرانی کہاوت کا عملی تجربہ ہو چکا تھا "جو رکاب میں پاؤں رکھتا ہے وہ گھوڑے کی سواری بھی کرتا ہے۔"

اب وہ شاذونادر ہی سمرقند میں نظر آتا یا شکار کا لطف اٹھاتا۔ پہلی ملکہ سرائے خانم کی از حد عزت تھی۔ کنیزیں ہر وقت اس کی خدمت میں حاضر رہتیں اور وہ شاہانہ و ناخوانہ لباس میں محل کی رونق بنی رہتی۔ اس کے قدموں کے لیے نت نئے فرش تعمیر ہوتے۔ نیلے رنگ کی کاشی کی اینٹوں سے مزین۔ تیمور نے ان عمارات کو ایرانی مہندسوں کی مدد سے شروع کیا تھا مگر وہ شاذونادر ہی ان عمارات کو دیکھنے یا ان میں رہنے کے لیے موجود ہوتا۔ ہاں جب کبھی وہ سمرقند لوٹ کر آتا تو معماروں اور مہندسوں کی رفتار کو تیز تر کر دیتا اور چین، ہند اور بغداد سے آئے ہوئے سفیروں کو شرف باریابی بخشتا۔ یہی موقعے تھے جب وہ اپنے پوتوں کے آداب قبول کرتا اور دوسرے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے چند روز کے لیے جشن مناکر سمرقند کی رعایا کو دنیا کی سب سے بڑی مملکت کی عظمت و حشمت دکھاتا۔

جب وہ سفر میں ہوتا تو شامیانوں اور خیموں کا دہرا انتظام ہوتا۔ شامیانوں کے ایک محل میں جب وہ آرام کر رہا ہوتا تو دوسرا اگلی منزل کو روانہ کر دیا جاتا تاکہ حریر و پرنیاں، ریشم اور سوت کا یہ شہر امیر کے پہنچنے سے پہلے تیار ہو جائے۔ اس طرح وہ ہر منزل پر اپنی قیام گاہ، اس کے پردے اور قالین تیار پاتا۔ اس کے اپنے خیمے کے گرد بارہ ہزار کلچیوں کے خیمے ہوتے۔ یہ تھیں اس کے شخصی محافظوں کے لشکر کی پلٹنیں۔ طویل قامت، چوڑا چکلا

سینہ، مضبوط اعضاء اور توانا جسم کے جوان، ایک سے دوسرا بڑھ کر۔ ایسی کوئی مشکل نہ تھی جو ان کے ذمے نہ ڈالی جاتی مگر وہ ہر بار کامیاب لوٹ کر بیش بہا تحائف سے مالا مال کر دیے جاتے۔

شاہی محافظوں کے افسر بہادروں سے چنے جاتے تھے۔ دلیر و توانا اور فنِ جنگ میں ماہر افراد جو نمایاں خدمات انجام دے چکے ہوتے۔

"وہ مدتوں سے خدمات انجام دینے والے سپاہی" تیمور نے ایک بار کہا "اور ان کی خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں عزت اور دولت دونوں سے نوازا جائے۔ جو لوگ دائمی راحت چھوڑ کر چند لمحوں کی فانی عزت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر کمربستہ رہتے ہیں وہ انعام کے حقدار ہوتے ہیں۔" اور وہ اس اصول پر سختی سے قائم رہتا۔ جس طرح اس نے ایک مرتبہ ساتھ دینے والے ایک ہزار سپاہیوں کی فہرست مرتب کی تھی اب اس نے حکم دیا کہ اس کی فوج کے ہر لشکر کے ہر سپاہی کا نام الگ الگ لشکری فہرست میں درج کیا جائے۔ محرر ہر افسر اور سپاہی کے نمایاں کارناموں کو درج کرتے رہتے تھے۔

جو سپاہی نمایاں کام کرتا اسے دس جوانوں کے سیکشن کا کمانڈر مقرر کیا جاتا۔ پھر سیکشن کمانڈر کمپنی افسر مقرر کیے جاتے۔ عہدوں کے مخصوص نشان ہوتے تھے۔ کمربند، زریں لبادہ۔ بعض اوقات تلوار اور گھوڑا بھی عطا ہوتا۔ رجمنٹ کے کمانڈروں کو علم اور نقارہ مرحمت ہوتا۔ امرا، لشکر کے کمانڈروں اور سپہ سالاروں کو لشکری علم یا شیری علم اور نقارہ بخشا جاتا۔ ایسے امیر اپنے ساتھ ایک سو گھوڑے لے جا سکتے تھے۔

فتح کے بعد ان امیروں کے انعام و اکرام زیادہ ہوتے تھے۔ کسی شہر کے جاگیردارانہ حقوق اور ان کا خراج یا بعض اوقات پورا صوبہ بھی مرحمت کر دیا جاتا۔ ترقی کا معیار صرف قابلیت پر مبنی تھا۔ پھر بھی بڑے امرا اکثر شاہی خاندانوں سے متعلق ہوتے تھے۔ بوڑھا جاکو برلاس ان گنتی کے امرا میں سے تھا جو اتنی سنگین جنگوں سے صحیح و سلامت لوٹے اور اسے امیر الامراء

کے خطاب کے علاوہ بلخ کی حکومت بخشی گئی۔

جو شخص ناکام رہتا ، پھر اس ناکامی کے بہانے بناتا اس سے تیمور کو ازحد نفرت پیدا ہو جاتی۔ اسی طرح مشکل مقامات پر جو شخص پیچھے ہٹ جاتا یا کترا جاتا اور پیش قدمی سے پہلے ہی پس نشینی کے راستے ڈھونڈتا رہتا ایسے آدمی کی تیمور چنداں پروا نہ کرتا۔ اسی طرح وہ بیوقوف سرداروں کو بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اکثر کہتا "عاقل دشمن بیوقوف دوست سے بدرجہا بہتر ہے"۔ ایک مؤرخ نے جو عرب کے نام سے مشہور تھا تیمور کی نہایت واضح تصویر کھینچی ہے:

"وہ فاتح بلند قامت تھا۔ بلند پیشانی اور بہت بڑا سر۔ اس کی جسمانی طاقت بھی اتنی ہی قوی تھی جتنی اس کی جرأت و دلیری نمایاں تھی۔ قدرت نے اسے گوناگوں صفات سے مزین کیا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا اور رنگت نکھری ہوئی۔ اس کے اعضاء بڑے بڑے تھے۔ چوڑے شانے اور آہنی گرفت کے ہاتھ اور انگلیاں۔ اس کی ریش دراز تھی اور ہاتھ خشک رہتے تھے۔ اس کی آواز بھاری بھر کم تھی۔ وہ داہنی ٹانگ سے لنگڑاتا تھا۔

ثمبانہ عمری میں بھی اس کا عزم صمیم اور بدن طاقتور تھا۔ اس کی دلیری جوانی کی طرح چٹانوں کی مانند سخت تھی۔ وہ جھوٹ اور مذاق کو ناپسند کرتا تھا۔ چاہے سچائی اس کی مرضی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ صداقت کو پسند کرتا تھا۔ ناکامی اس کے عزائم کو کم نہ کر سکتی تھی اور کامیابی اسے آپے سے باہر نہ کر سکتی تھی۔

اس کی مہر میں رہنمائی کی غرض سے فارسی کے دو لفظ کندہ تھے "راستی رستی" یعنی صداقت میں طاقت ہے۔ وہ گفتگو میں محتاط تھا۔ اس نے قتل و غارت یا عورتوں کی عصمت دری پر کبھی ایک لفظ بھی نہ کہا۔ وہ بہادر سپاہیوں کو پسند کرتا تھا۔"

تیمور کے بال جوانی ہی میں سفید ہو گئے۔ اور لوگ اس کا رنگ گندمی بتاتے ہیں ممکن ہے ایک عرب کی نگاہ میں گندمی رنگ سفید ہو۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ مندرجہ بالا

نقشہ ابن عرب شاہ نے کھینچا ہے جسے تیمور قیدی بنا کر لے گیا تھا اور جو تیمور کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

تیمور کی سپاہ کی فہرست میں بہت کم ایسے نام ہونگے جو اک لوگا کی طرح یک بیک عزت و احترام کے قابل بن گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس سپاہیوں یعنی سیکشن کا کماندار تھا۔ مگر مالک صرف ایک ہی گھوڑے کا تھا۔ اس کی ڈھال فولادی تھی اور اس کی کمان کوئی پانچ فٹ لانبی ہوگی۔ وہ پینے میں مشہور تھا اور کہا جاتا ہے کہ مینڈھے کے سینگ کو دودھ اور شراب سے بھر کر ایک ہی سانس میں پی جاتا تھا۔

اس کے متعلق وقائع نگار لکھتا ہے کہ ایران کی دوسری مہم میں اک لوگا ایک مقام پر سڑک کے کنارے کسی گاؤں کے قریب اکیلا ہی فروکش ہوا۔ سڑک کے کنارے فروکش ہونے سے زیادہ مناسب ہوگا اگر کہا جائے کہ وہ ایک شراب خانے میں اتر پڑا۔ چونکہ دشمن کا ملک تھا اس لیے اس نے گھوڑے پر زین رہنے دیا اور اسے دروازے کے ساتھ باندھ دیا۔ اس نے کمربند ڈھیلا کیا اور پینے میں مشغول ہوگیا۔ اتنے میں گاؤں کے نمبردار نے اسے بتایا کہ گاؤں کے باہر تالاب کے قریب پچاس ایرانی سوار گھوڑوں سے اتر رہے تھے۔

"اچھا" اک لوگا نے کہا "تو پھر جاؤ اور اپنے ہتھیار بند آدمی لے آؤ۔ ہم ان سے لڑینگے۔" نمبردار نے کہا کہ یہ ناممکن تھا۔ سوار تعداد میں زیادہ تھے۔ اور مشورہ دیا کہ اک لوگا اپنے فرار کی راہ تلاش کرے۔ مگر تاتاری سپاہی ابھی تک یہ خیال ذہن میں نہ لایا تھا۔

"اگر ہم ان پر حملہ نہیں کرتے" اس نے کماندارانہ لہجے میں کہا "تو ہم ان کے گھوڑے اور ان کا ساز و سامان کیسے چھین سکتے ہیں۔ واللہ تم بے عقل ہو۔ یہ ایرانی سپاہی بیکار ہیں۔ مجھ جیسے شیر کو دیکھتے ہی وہ بھاگ جائیں گے۔ میں انھیں بھاگتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ جاؤ اور اپنے آدمی لے کر یہاں آجاؤ۔"

گاؤں والوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ وہ سپاہیوں سے ڈرتے تھے مگر اس زرہ میں

لپٹے ہوئے دیوسے بھی خوفزدہ تھے۔ آخر کوئی دس کے قریب اپنے ٹٹوؤں پہ سوار ہو کر شراب خانے کے باہر آئے۔ اُک بوگا نے کمر بند کس لیا۔ سر پہ خود رکھا۔ ڈاڑھی کو چرمی تسمے سے باندھا اور بازو پر ڈھال چڑھا کر انھیں سمجھانے کی کوشش کی:

"جب میں نعرہ لگاؤں تو تم طوفان کی طرح اپنے گھوڑوں کو آگے بڑھا لینا مگر دیکھنا کہیں آنکھوں میں سے گرد نکالنے کے لیے راستے ہی میں کھڑے نہ ہو جانا۔"

گاؤں کے دس سواروں کو لے کر وہ گاؤں کے تالاب کی طرف روانہ ہوا۔ جونہی اس نے ایرانی سپاہیوں کو گھوڑوں کو پانی پلاتے دیکھا۔ اس نے گھوڑا بڑھایا اور نعرہ بلند کیا:

"دار اُو گر"

گاؤں کے آدمیوں کی ہمت نہ پڑی کہ ننگی تلواروں کا سامنا کرتے اور وہ مڑ کر جس راستے سے آئے تھے اسی راستے پہ ہو لیے۔ مگر تاتاری شہسوار اب واپسی کے انداز میں نہ تھا اس نے اکیلے ہی ہلہ بول دیا۔

ایرانی سپاہیوں نے یا تو یہ سمجھا کہ وہ بڑے دستے کا قادم نقطہ ہے یا پھر یہ نعرہ سن کر وہ اس قدر بد دل ہو گئے کہ جلدی میں گھوڑے پہ بیٹھ کر راہ فرار اختیار کی۔ اُک بوگا دُور تک ان کے تعاقب میں گیا مگر سوار دستہ منتشر ہو کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اُک بوگا نے کئی بار انھیں پلٹ کر دو دو ہاتھ کرنے کے لیے پکارا مگر ان کے گھوڑے تیز تھے اور وہ لڑائی کے خیال سے نہ آئے تھے۔ وہ فتحمند مگر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

"وہ گیدڑ تھے مگر تم خرگوش ہو" اس نے خفگی سے کہا۔

اس مہم میں تیمور تیزی سے جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مظفر شہزادے جنھیں وہ صوبہ دار بنا کر چھوڑ آیا تھا اس کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر خانہ جنگی میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس طوائف الملوکی میں سے شاہ منصور اصفہان اور شیراز کا مالک بن کر نمودار ہوا۔ یہ وہی تھا جس نے تیمور کی اطاعت سے انکار کیا تھا۔ اب اس نے اپنے چچیرے بھائیوں کو

اپنا مطیع کر لیا تھا۔ اس نے شہزادہ زین العابدین کو قید کر کے گرم سیخ سے اس کی آنکھیں بے نور کر دی تھیں۔

اس بغاوت کی آگ کو فرو کرنے کے لیے تیمور جا رہا تھا کہ راستے میں اسے عجیب و غریب غارتگر گروہ سے واسطہ پڑا۔ وہ پہاڑوں میں رہتے تھے اور حشیش کے نشے میں نہایت دلیرانہ کام کر جاتے تھے۔ مشرق قریب کے حکمران ان کے نام سے کانپتے تھے۔ اس نے اس گروہ کے پہاڑی نشیمن راستے ہی میں برباد کر دیے[1]۔ اس کے ساتھ اس مرتبہ صرف تین لشکر تھے۔ ایک کا کماندار شیخ نادی کا بڑا لڑکا تیمور کا پوتا شاہ رخ تھا۔

تیمور کی آمد پر شاہ منصور نے اپنی آدھی فوج اپنے ایک نائب کے نیچے قصر سفید میں متعین کی۔ یہ جگہ رستم کے زمانے سے ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ اندھا شہزادہ زین العابدین بھی اسی قلعے میں محبوس تھا اور اسی کی طرف تیمور نے اپنی فوج بڑھائی۔

قصر سفید اصل میں ایک پہاڑ کی چوٹی تھی جسے راوی نے تفصیل سے بیان کیا ہے:

"ایرانیوں نے اپنے دفاع کا پورا انحصار اس قلعے پر اس لیے رکھا کہ یہ ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور اس میں جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ پہاڑ کی چوٹی اوپر سے بہت وسیع میدان میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ ایک فرسخ کے قریب طویل اور اتنی ہی چوڑی۔ اس میدان میں چشمے اور ندی نہریں تھیں۔ زمین آباد تھی۔ باغات اور کھیت تھے اور ہر قسم کے چرند و پرند نظر آتے تھے۔

---

[1] اس فرقے کے لوگ اسمٰعیلی کہلاتے تھے۔ اور تو اور انھوں نے صلیبی لشکروں کو بھی کافی زحمت دی۔ جنھوں نے حشیشین سے ان کے لیے ASSASIN کا لفظ وضع کیا۔ مارکو پولو ان کے مضبوط قلعے کے پاس سے گزرا اور ان کے رہنما کو "پہاڑوں کا بوڑھا" کہا۔ یہ لفظ شیخ الجبل سے ماخوذ ہے۔ اس مرتبہ تیمور نوسے اور کھدی قبائل کو زیر کرنے میں بھی مصروف رہا۔

شہزادوں نے یہاں بہت سے محلات تعمیر کر رکھے تھے جہاں انھیں نہ آگ کا ڈر تھا، نہ طغیانی کا۔ منجنیقوں اور بارودی سرنگوں کا تو یہاں گزر ہی نہ ہو سکتا تھا۔ آج تک کسی بادشاہ نے اس کے محاصرے کا خیال تک نہ کیا تھا۔ یہاں تک ایسے آلات کا لانا ناممکن تھا۔ اس کی سخت چٹانوں میں سرنگیں نہ کھودی جا سکتی تھیں انھیں وجوہ کی بنا پر اسے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس کا تنگ اور دشوار گزار راستہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ تین آدمی ہزاروں کا مقابلہ کر سکیں۔

دفاع کے قدرتی وسائل کے علاوہ ایرانیوں نے جابجا چونے اور پتھر سے ہر موڑ پر مضبوط مورچے تعمیر کر رکھے تھے۔ زرعی پیداوار اور مرغ و ماہی کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ شہر کی آبادی کی ضروریات پوری ہوتی رہتی تھیں، اس لیے ان کا فاقوں سے مجبور ہو کر دروازے کھول دینے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ صرف موت ہی کو اس شہر کے لوگوں پر قدرت حاصل تھی۔"

تیمور نے قصر سفید پر اسی دن حملہ کر دیا جس دن اس کی فوج اس کے نیچے پہنچی۔ اس کا معسکر سامنے کی دوسری پہاڑی پر تھا۔ وہاں سے اس کے تاتاری قلعے کی بلندیوں کی طرف بڑھے اور جہاں سے عمودی چٹان شروع ہوتی تھی وہاں آ کر رک گئے۔ وہ یہاں گھوڑوں سے اتر پڑے اور چیونٹیوں کی طرح ہر طرف پھیل گئے۔ جلد ہی انھوں نے سڑک کے پہلے موڑ کے مورچے پر قابو پا لیا۔

تیمور اپنی بلندی سے بڑھتے ہوئے خود تیروں کی بارش کی طرف جاتے دیکھ رہا تھا۔ وادی سے بخارات کی طرح گرمی اوپر کو بلند ہو رہی تھی۔ اس کے قریب نقارے بے پناہ شور مچا رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کے نیچے چٹانوں سے چمٹے ہوئے اور بڑھتے ہوئے سپاہیوں کے نعرے بلند ہوتے۔

جب سورج غروب ہوا تو کوئی فائدہ نظر نہ آ رہا تھا۔ قلعے کی سمت جانا ہوا اور

کوئی راستہ نہ ملا تھا۔ جب مقتولین کی لاشیں برجوں کے نیچے سے ہٹا کر گئی گئیں تو افسروں کے چہروں پر سنجیدگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ تاتاری سپاہیوں نے رات ان چٹانوں کے نیچے اور کہیں کہیں چھپکلیوں کی طرح پتھروں سے چپکے ہوئے گزاری۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی ان کے افسروں نے حملہ از سر نو شروع کر دیا۔ گیتیوں سے چٹان پر ضربیں لگائی جاتی رہی تھیں۔ جب کوئی تیر سے گھایل ہوتا تو اس کے ساتھی اسے نیچے وادی میں پہنچا دیتے۔ تیمور کے نقاروں پر ایک اور ضرب پڑی اور وہ پھر اس کام میں منہمک ہو گئے۔

جو لوگ ایک برج کے بالمقابل پہنچ چکے تھے انہوں نے یکہ و تنہا تاتاری کا نعرہ سنا:

"امیر فتحمند ہے، ایرانی زیر ہو چکے ہیں۔"

ان سے قریب دو سو فٹ اوپر اور راستے سے تیر کی زد سے باہر اک بوگا پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ ایک تنگ عمودی شگاف سے وہ اوپر پہنچا تھا۔ اس جگہ کو ایرانی و تاتاری سپاہیوں نے ناقابلِ عبور سمجھ کر خالی چھوڑ دیا تھا۔ اک بوگا اپنی کمان اور ڈھال سنبھالے اس ظاہرا ناقابلِ عبور جگہ سے اوپر چڑھ گیا تھا اور ڈنکے کی چوٹ اپنا کارنامہ دنیا تک پہنچا رہا تھا۔

اس نے اپنی ڈھال کو سامنے کی چٹان پر رکھ کر اور اس کی آڑ سے اپنی کمان کا اس خوبی سے استعمال کیا کہ جو ایرانی اس کے قریب تھے وہ اس پر حملہ آور نہ ہو سکے۔ جونہی شاہ رخ نے جو اس حصے کا کماندار تھا اور راستے کے اوپر موجود تھا یہ دیکھا اس نے برج پر حملے کا حکم دے دیا تاکہ وہاں کا دشمن اپنی جگہ رکا رہے اور جو تاتاری اس شگاف کے قریب تھے انھیں اک بوگا کی مدد کو پہنچنے کا حکم دیا۔

جب وہ اوپر پہنچے تو چوٹی کے اوپر سے ایرانی بھاگ چکے تھے اور اک بوگا ان کے تعاقب میں شمشیر کھینچے دوڑا جا رہا تھا۔ جب وہ چوٹی پر نظر آئے تو شاہ رخ کے علم بلند ہوئے اور نقارے پر مزید چوٹ پڑی۔ اب خاتمہ قریب تھا۔

ایرانی برجوں سے نکل کر بلندی کی طرف بھاگے مگر تیمور کے آدمیوں نے ان پر عقب سے قابو پا لیا۔ وہ ایک ایک کر کے پہاڑ کی چوٹی سے دُور نیچے وادی میں پھینکے گئے۔ شاہ منصور کے افسروں کا بھی یہی حشر ہوا۔ نیچے چٹانوں میں وہ بے حس و حرکت کپڑوں کی گٹھڑیاں بن کر ابدی نیند سو گئے۔ قصرِ سفید تاریخ میں پہلی بار ختم ہو چکا تھا۔

جب لڑائی ختم ہوئی تو آک بوگا کو ڈھونڈ کر تیمور کے حضور پیش کیا گیا۔ اسے چاندی کے چمکتے ہوئے سکے، ریشم اور زربفت کے تھان، خیمے اور حسین و جمیل کنیزیں، گھوڑے، خچر اور اونٹ انعام میں عطا ہوئے۔ وہ حیران سا ہو گیا اور اس کارواں کو دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے وہاں سے لوٹا۔ جب اس کے ساتھیوں نے روک کر مبارک باد دی تو کہنے لگا:

"خدا شاہد ہے کہ کل میرے پاس صرف ایک گھوڑا تھا۔ میں کیسے باور کروں کہ آج یہ سب کچھ میرا ہے؟"

اسے محمد سلطان کے لشکر کے مؤخر الجیش کا کمانڈر مقرر کیا گیا اور باقی ماندہ زندگی اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر شان و شوکت سے گزاری۔ اس دن سے اس نے اس جگہ سے منہ نہ موڑا جہاں تیمور موجود ہوتا۔ وہ جب سوتا تو اپنے پاؤں امیر کے خیمے کی طرف کر کے سوتا اور اس کی وصیت تھی کہ جب وہ مر جائے تو ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں اس کے پاؤں امیر کے محل کی طرف ہوں۔

جب تیمور نے "مظفروں" کا تعاقب شروع کیا تو اسے اطلاع ملی کہ شاہ منصور بھاگ گیا ہے۔ اس نے داہنے اور بائیں لشکر کو اپنے دو پوتوں محمد سلطان اور پیر محمد کی کمان کے تحت علیحدہ کیا اور خود تیس ہزار پر مشتمل اعظم الجیش کو لے کر شیراز کی طرف بڑھا۔ شاہ رخ جو ہمیشہ اس کے حضور میں رہتا تھا اب بھی اس کے سٹاف میں موجود تھا۔ ایک دن ایک گاؤں کے باہر باغات میں تین چار ہزار کا صف بستہ لشکر دیکھ کر تاتاری حیران سے ہو گئے۔ ان رسالوں کے جوان زرہ پوش تھے۔ ان کی زرہ چمڑے کی تھی جس کے کنارے فولاد

سے جڑے تھے۔ گھوڑوں پر ریشمی جھالریں پڑی ہوئی تھیں۔

ہُوا یہ تھا کہ شاہ منصور شیراز کی طرف بھاگتے ہوئے اس گاؤں کے باہر رُکا تھا اور یہاں لوگوں سے پوچھا کہ شیراز والے کیا کر رہے تھے۔ اسے جواب ملا:

"واللہ۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ لوگ جو بھاری بھرکم ڈھالیں اٹھایا کرتے تھے اور جن کے تیر و زنی تھے اب اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر اس طرح بھاگ گئے ہیں جس طرح بھیڑیوں کے سامنے بکریاں بھاگ جاتی ہیں۔"

اس طعنے سے جل کر اس نے اپنے رسالوں کا منہ موڑ لیا تھا اور واپس راستے کے اوپر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اب تیمور پر حملہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس کی کچھ رجمنٹیں تو منتشر ہو گئیں مگر دو ہزار کے قریب سوار تاتاری صفوں کو چیر کر پیچھے بلندیوں تک پہنچ گئے۔ شاہ منصور اس کامیابی سے جیسے خوش نہ ہُوا تھا اس نے تیموری عَلَم پر ہلہ بول دیا۔

امیر اس اثنا جانا لڑائی کو دیکھنے کے لیے اپنے سٹاف کے کچھ آدمی لے کر ایک طرف کھڑا تھا۔ منصور ادھر متوجہ ہُوا۔ تاتاری افسر فوراً ہی ایرانی سواروں سے دستی جنگ میں اُلجھ گئے۔

تیمور نے عَلَم کے لیے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا اپنا ہاتھ پیچھے کیا مگر عَلَم والے پر پہلے ہی حملہ ہو چکا تھا اور وہ وہاں موجود نہ تھا۔ پیشتر اس کے کہ تیمور اپنی تلوار کھینچتا منصور اپنا گھوڑا بڑھا کر اس کے اوپر پہنچ چکا تھا۔

دو بار منصور نے تاتاری فاتح پر اپنی تلوار کا وار کیا۔ تیمور نے سر جھکا کر واروں کو خود پر لیا۔ تلوار فولادی خود سے ٹکرائی اور دونوں بار پھسل کر اس کی زرہ پر بے ضرر طور پر پڑی۔ تیمور بے حرکت بیٹھا رہا۔ اس کے محافظوں میں سے ایک نے ڈھال اس کے سر کے اوپر بڑھا دی اور دوسرا اپنا گھوڑا بڑھا کر منصور اور تیمور کے درمیان حائل ہو گیا۔

منصور نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر شاہ رُخ کے آدمیوں نے اس کا تعاقب

کیا اور تھوڑی دیر کے بعد شاہ رُخ نے منصور کا کٹا ہُوا سر تیمور کے گھوڑے کے پاؤں میں لا پھینکا۔

ایران کی مدافعت کا یہ اختتام تھا اور مظفروں کی بربادی پر مُہر ثبت ہو چکی تھی۔ تیمور نے اس خاندان کے تمام مردوں کو پابہ سلاسل کرنے کا حکم دیا۔ بعد میں سب کے سب تہ تیغ کر دیے گئے۔

صرف زین العابدین اور چلابی سے مشفقانہ سلوک کیا گیا۔ ان دونوں کو ان کے خاندان والوں نے اندھا کر دیا تھا۔ انھیں سمرقند بھیج دیا گیا جہاں انھیں جاگیریں اور محلات دیے گئے تاکہ وہ امن و امان سے زندگی بسر کر سکیں۔

شیراز اور اصفہان سے تجربہ کار فنکار، مصور اور شاعر و ادیب فوج کے ہمراہ تیمور کے بڑھتے ہوئے دربار کو سدھارے۔ پروانوں کا مقام شمع کے اردگرد ہے۔

سُلطان احمد

تیمور کے خلاف عہدنامے ناگزیر تھے۔ وہ کئی بار مشرقی صحرا سے نکل کر بادِ سموم کی طرح شہروں پر چھا گیا تھا اور انھیں فتح کر کے لوٹا تھا۔ بادِ سموم کی طرح اس کی آمد کا اندازہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔

مغرب کے بادشاہوں کے درمیان سفیر اور نامہ و پیام چل رہے تھے۔ ترکوں کا بادشاہ مصروفِ یورپ میں مصروف تھا اور اسے چنداں پروا نہ تھی۔ مگر مصر کے سلطان نے جو شام میں دمشق و بیت المقدس کا حکمران بھی تھا اور بغداد کے سلطان نے عہد کیا کہ وہ مل کر تیمور کا مقابلہ کریں گے۔ قارا یوسف جس کے ترکمانیوں کو تیمور نے مغرب کی جانب دھکیل دیا تھا وہ بھی شامل ہونے کے لیے رضامند تھا۔

بغداد تیمور کی پیش قدمی کی راہ میں تھا۔ بغداد اب اسلامی دنیا کا مرکز نہ رہا تھا۔ وہ دن جا چکے تھے جب ہارون الرشید برمکی وزیروں کے ساتھ بیٹھ کر لطف و کرم کی محفلیں جمایا کرتا تھا۔ گو اب بھی زائرین اور تاجر یہاں کا رُخ کرتے مگر حقیقت میں یہ شہر دجلہ کے دونوں کناروں پر وزنی لاش کی طرح بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ ابن جبیر کہتا ہے کہ اب اس میں صرف گزرے ہوئے زمانوں کی یادیں اور عہدِ رفتہ کی جلیل القدر ہستیوں کے سایے رہ گئے تھے، عین اسی طرح جس طرح کھوئی ہوئی جوانی والی حسین عورت کے ذہن میں عہدِ جوانی کے خواب منڈلایا کرتے ہیں۔ اور وہ بوڑھی عورت کی طرح دجلہ کے خاموش پانی کی سطح دونوں کناروں سے دیکھا کرتا تھا۔ اب دجلہ کی لہریں اسے آئینے کا کام دیتی تھیں۔

اس کا حکمران سلطان احمد جلائر اب بھی امیر المومنین کہلاتا تھا۔ اور بغداد کی مسجدوں میں قریش کے افراد اب بھی سیاہ لباس پہنے نظر آتے تھے۔ بغداد کا اصل محافظ اب مملوک تھا، مصر کا سلطان۔

احمد اپنی روح کو شک اور اپنے جذبات کو مظالم سے سیراب رکھتا۔ اسے اپنے خزانے کا ہمیشہ خوف رہتا۔ اور تو اور وہ خزانے کے محافظوں سے بھی خوفزدہ رہتا تھا۔ اس کا یہی خوف۔ اسے بار بار مشرق کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا کہ مبادا کہیں تیمور کے تاتاری آجائیں۔

اس نے بغداد کے مفتی اعظم کو تیمور کے پاس بھیجا اور بیش قیمت تحائف ساتھ روانہ کیے۔ مگر ایسے ہی تحائف اپنے دوست کاما یوسف کو بھی بھیجے۔ ایک روایت کے مطابق تیمور نے مفتی کو پرتکلف سا جواب دے کر واپس کر دیا۔ دوسری روایت کے مطابق تیمور نے مفتی کے ہاتھ شاہ منصور کا سر روانہ کیا۔ اس عصر میں دونوں طرح کے جواب ممکن تھے مگر تیمور دوسری روایت کا عادی نہ تھا۔ بہرکیف اسے احمد کے تحائف کی ضرورت نہ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بغداد مطیع ہو جائے۔ اس کا نام خطبے میں پڑھا جائے اور اس کے نام کا سکہ جاری ہو۔

احمد نے اس دوران میں اپنے بچ نکلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے اپنے ترکمانی حلیفوں اور دمشق سے تعلقات قائم رکھے۔ ساتھ ہی اپنی حفاظت کے لیے تیز رفتار شہسواروں کا رسالہ تیار رکھا جو اسے اس کے اہل و عیال اور خزانے کو وقت ضرورت نکال کر لے جاتے۔ یہ انتظامات شاید اس کی نگاہ میں کافی نہ تھے۔ اسی میل دور اپنی سرحد پر اس نے ناظر مقرر کیے جن کے پاس پیغام رساں کبوتر تھے تاکہ تیمور کی آمد کی اطلاع بروقت مل سکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تیمور کے جاسوسوں نے احمد کی تیاریوں کی اطلاع تیمور تک پہنچائی۔ وہ بغداد حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ پہلے تو اس نے سوارہ کا ایک لشکر

ترکمانوں کی طرف روانہ کیا تاکہ انھیں مشغول رکھا جائے۔ پھر وہ خود روانہ ہوا۔ اس کی حرکات سے ظاہر یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے لشکر کی مدد کو جا رہا ہے۔

وہاں جانے کے بجائے وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا اور پہاڑوں کے بیچ میں سے ہو کر سفر شروع کیا۔ دن رات کوچ جاری رہتا اور رات کے وقت اس کی فوج مشعلیں جلا کر آگے بڑھتی۔ وہ خود باقی فوج سے بھی آگے نکل آیا۔ اب اس کے ساتھ تھوڑے سے آزمودہ کار سپاہی تھے مگر وافر گھوڑے بڑی تعداد میں ساتھ لیے تاکہ رفتار میں کمی واقع نہ ہو۔ تیمور خود کجاوہ استعمال کر رہا تھا۔

پہاڑیوں کی طرف احمد نے جو ناظر مامور کیے تھے انھوں نے بڑھتی ہوئی فوج کے قدموں کا گرد و غبار دیکھ کر پیغام رساں کبوتروں کو چھوڑ دیا اور تیمور کی آمد کی اطلاع دے دی۔ گاؤں پہنچ کر تیمور نے گاؤں کے لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ آیا وہ اس کی آمد کی خبر ارسال کر چکے ہیں۔ وہ اس کے خوف سے انکار نہ کر سکے۔ تیمور نے انھیں حکم دیا کہ دوسرا پیغام بھیجیں:

"اپنے بادشاہ سے کہو کہ جو سوار تم نے دیکھے تھے وہ ترکمان تھے جو تاتاریوں سے بھاگ کر آ رہے تھے۔"

دوبارہ کبوتر چھوڑے گئے۔ تیمور نے چند سو سوار منتخب کیے اور انھیں بہترین گھوڑے دے کر اکیاسی میل بغیر رکے سفر کر کے بغداد کے مضافات میں داخل ہوا۔

جب پہلا پیغام پہنچا تو احمد نے روانگی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس نے اپنا مال اسباب دریا کے پار روانہ کر دیا اور اپنے محافظوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ وہ خود تھوڑی دیر شہر میں رکا تاکہ آمدِ تیمور کی خبر کی تصدیق ہو سکے۔ پھر وہ خود بھی دجلہ کے پار گیا اور کشتیوں کا پل توڑ دیا۔

تیمور کے سوار سیدھے ان محلوں کی طرف گئے جو خلیفۂ اسلام کے مسکن رہ چکے تھے۔

وہ بغداد کے سلطان کے پیچھے دجلہ کے کنارے پہنچے اور جب دیکھا کہ وہ پہلے ہی پار اتر چکا ہے انھوں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔
احمد اُن سے صرف چند ہی گھنٹے پہلے روانہ ہوا تھا۔ اب شام کے صحرا کی جانب دوڑ شروع ہوئی۔ "آفتاب" نامی کشتی جس میں گذشتہ رات احمد نے محفل رقص و سرود منعقد کی تھی وہ تاتاریوں نے دوسرے کنارے سے تیمور کی طرف روانہ کر دی اور خود آگے بڑھ گئے۔ ایک دن اور رات ۔ پھر دوسرا دن تاتاری اپنے گھوڑوں کو ایڑ دیتے رہے حتیٰ کہ وہ فرات کے کنارے کی دلدلوں میں جا پہنچے۔
یہاں انھیں کشتیوں کی ضرورت پڑی۔ کشتیاں ملنے پر انھوں نے فرات کو کشتیوں سے عبور کیا اور ساتھ گھوڑوں کو تیرا کر لے گئے۔ اب وہ بھاگتے ہوئے احمد تک پہنچ گئے تھے کیونکہ اس کا سامان اور خزانہ قریب ہی بکھرا پڑا تھا اور لدو گھوڑے چر رہے تھے۔ وہ بہت سے دیہات میں سے گزرے تھے مگر کہیں گھوڑے مہیا نہ ہو سکے تھے۔ صف کے سوار پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کے گھوڑے قدرے کمزور تھے۔ افسر جو سپاہیوں سے بہتر گھوڑوں پر تھے آگے نکل آئے تھے۔ اب تاتاری فوج صرف رجمنٹوں کے کماندار افسروں اور امراء پر مشتمل تھی اور تعداد بھی چالیس پچاس سے زیادہ نہ تھی۔ انھوں نے تیمور سے اقرار کیا تھا کہ وہ احمد کو لے کر پلٹیں گے۔ اس لیے وہ ویران صحرا میں بڑھتے ہی گئے۔
اس دوران میں سلطان نے ایک دستہ راستہ روکنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ تاتاریوں کے سامنے کوئی ڈیڑھ سو سوار ہونگے جنھوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ تاتاریوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے اس حملے کو روکا اور بغدادی فوج کے دستے کو منتشر کر دیا۔
کچھ دیر کے بعد ان پر دوسرا حملہ ہوا۔ اس مرتبہ وہ گھوڑوں سے اتر پڑے اور گھوڑوں کے پیچھے سے کمانوں کا استعمال کیا اور یوں دوسرا حملہ بھی روکیا۔ اس کے بعد احمد اور اس کے ساتھیوں کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ امراء کے گھوڑے جواب دے چکے تھے۔

وہ خود بھی پیاس سے ہلکان ہو رہے تھے۔ انھیں پانی کی تلاش میں راستے سے ہٹنا پڑا اور یوں تعاقب ختم ہوا۔

احمد دمشق زندہ پہنچ گیا۔ اس کا حرم اور بیٹے تاتاریوں کے ہاتھوں قید ہوئے جنھیں وہ تیمور کے پاس لے آئے۔ بغداد نے تیمور کو حکمران تسلیم کیا اور خراج پیش کیا۔ وہاں حاکم چھوڑ کر تیمور جس سرعت سے آیا تھا اسی سرعت سے واپس چلا گیا۔ واپس جانے سے پہلے تاتاریوں نے بغداد کی سب شراب دجلہ میں انڈیل دی اور بغداد کے منجموں اور معماروں کو تیمور سمرقند لے گیا۔

سلطان کو شاعری کا شوق تھا۔ اس نے اس واقعے کے متعلق ایک قطعہ کہا:

"لوگ کہتے ہیں کہ تم جنگ کے لیے لنگڑاتے تھے تم مانو گے کہ بھاگتے وقت میں ہرگز نہیں لنگڑایا۔"

طوفان آیا اور گزر گیا۔ سلطان احمد قریب قریب دولت و حشمت دونوں سے محروم ہو گیا تھا۔ وہ قاہرہ گیا۔ وہاں قاہرہ کے حکمران نے اس کی دل لگی کا نیا سامان مہیا کیا۔ اور اسے نئی عورتیں اور نئے غلام عطا ہوئے۔ مگر قاہرہ میں تاتاری سفیر بھی آ پہنچا تھا۔ سفیر نے اپنے امیر کا سلام پہنچایا اور کہا:

"چنگیز کے عہد میں آپ کے آباؤ اجداد اور ہمارے بزرگوں میں جنگ ہوئی تھی۔ پھر دونوں میں صلح ہو گئی۔ بعد میں ایران خانہ جنگی کا شکار بنا۔ اب ہمارے امیر نے ایران میں امن و سکون قائم کر لیا ہے۔ یہ ملک آپ کی سرحد سے ملتا ہے، اس لیے امیر نے ہمیں آپکی خدمت میں بھیجا ہے تاکہ تاجروں کی آمد و رفت قائم ہو اور فتنہ و فساد بپا نہ ہو۔ تمام حمد اسی کے لیے ہے جو مالک مختار اور شاہوں کا شاہ ہے۔"

مصر کے حکمران نے اسی میں خوشی محسوس کی کہ اس سفیر کو قتل کرا دے۔ تیمور کے سفیر کو قتل کر دیا گیا۔ بغداد حاصل کرنے سے تیمور مغربی حکومت کے بہت قریب ہو گیا تھا

اور مملوکوں کو یہ بُرا محسوس ہُوا۔ اس وقت انھیں اچانک ایک نیا حلیف بھی میسّر آ گیا۔

"تاتاری فوج کے ایک حصے نے ایشیائے کوچک کے معاملات میں ایک مرتبہ مداخلت کی تھی جس سے ترکوں کا بادشاہ بایزید غصے ہُوا تھا۔ ترکوں اور مملوکوں کے درمیان عہدنامہ قرار پایا اور یوں ظاہر ہو رہا تھا کہ تیمور کی مغربی جانب کی پیش قدمی ختم ہو چکی تھی۔ دونوں سلطانوں کے بازو شامی عربوں اور ترکمانوں کی وجہ سے محفوظ تھے۔ ان کی مشرق کی جانب پیش قدمی کو فرات اور نہ بحیرۂ خزر تک کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔[1]

مصر کے مملوک دجلہ کے کنارے کنارے بغداد کی طرف بڑھے۔ پناہ گزین احمد ان کے ساتھ تھا۔ بغداد پہنچ کر اسے اپنے پرانے محل کی زینت بنایا گیا مگر اس مرتبہ اس کی حیثیت مصر کے مملوکوں کے صوبہ دار کی تھی۔ جب مملوک بغداد سے اور ترک موصل سے واپس چلے گئے تو احمد نے پھر اپنا پرانا رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے سمرقند جاسوس روانہ کیے جو عجیب غریب داستانیں لے کر آئے۔

"ہم نے بہت کچھ دیکھا۔ شہر اب وہ پہلا سا شہر نہیں۔ اب وہاں نیلے گنبد اور مرمر کے صحن ہیں جہاں پہلے اونٹ باندھے جاتے تھے۔ یقین مانیے ہم نے تاتاریوں کے امیر کو ایک سرائے (محل) بناتے ہوئے دیکھا۔ اسے معماروں کا کام پسند نہ آیا تو اس نے حکم دیا کہ پوری عمارت منہدم کر دی جائے۔ اس کے بعد بیس دن تک وہ ہر روز گھوڑے

---

[1] یہ اس سال کی بات ہے جب میراں شاہ کی شراب خوری اور بے توفانہ حرکتوں سے بحیرۂ خزر کے جنوب کے تاتاری صوبے کا نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ تیمور اس وقت اور کہیں مصروفِ کار تھا۔ پہلے توقتمش کے آخری حملے کو شمال میں روکنے کے لیے، پھر ہندوستان کی مہم میں۔ اس کی مہمات کو تاریخی لحاظ سے پیش کرنے کے لیے تمام راستوں کی فہرست اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے نقشے کی ضرورت پیش آتی۔ اس لیے ہر حصے کو علیحدہ علیحدہ لیا گیا ہے۔

پر سوار ہو کر آتا۔ خدا شاہد ہے یہ بات اسی طرح ہوئی جس طرح ہم کہہ رہے ہیں۔ بیس دن میں محل دوبارہ تیار تھا۔ محرابیں اور گنبد بھی کچھ موجود تھے۔ محراب چوبیس نیزوں کی اونچائی کی ہے اور وہ اتنی چوڑی ہے کہ پچاس آدمی وہاں کھڑے ہو سکتے ہیں۔

سلطان نے بیتابی سے پوچھا:

"اور کیا"

"وہ سنی اور شیعہ علماء کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے —"

"وہ میرے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس کے الفاظ کیا ہیں؟"

"واللہ۔ خدا آپ کو ہم سے راضی رکھے، وہ ہند چلا گیا ہے۔"

احمد جانتا تھا کہ تیمور کم از کم ایک ہزار میل دور ہو گا، مگر اسے چین نہ آتا تھا۔ خشک صحراؤں سے ہو کر بھاگنا اور تاتاریوں کا اس کے تعاقب میں آنا اسے بھول گیا تھا۔ اس نے اپنے وزراء پر شک کرنا شروع کیا اور کئی ایک کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ اس نے اپنی سکونت حرم کے ایک کونے میں رکھ لی اور اپنے گرد کوہ قاف کے مملوک غلام اور حبشی سپاہی جمع کر لیے۔

محل کے جالی والے جھروکوں کے پیچھے بیٹھ کر وہ عورتوں کی طرح بغداد کے ہجوم کو کشتیوں کے پل پر سے گزرتے دیکھتا۔ اس نے اپنے راز دار اور قابلِ اعتماد سپاہیوں کی نگرانی میں آٹھ گھوڑے دجلہ کے دوسرے کنارے رکھ چھوڑے تھے۔ پھر اس نے اعلان کیا کہ اس کے سامنے آنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ غلام تک اس کے کمرے میں نہ آ سکتے تھے اور احمد اپنا وقت ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے میں گزار دیتا۔ اب محافظوں پر سے بھی اس کا اعتماد اُٹھ گیا تھا۔

آخرکار اس کے شکوک اس قدر شدت اختیار کر گئے کہ اس کا کھانا صرف ایک خوان میں آتا تھا اور سرائے کے دروازے پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جب ملازم کھانا رکھ کر چلا

جاتا تو احمد دروازہ کھول کر کھانا اٹھا لیتا۔

رات کے وقت وہ اپنے بچ نکلنے کی مشق کرتا رہتا۔ بھیس بدل کر وہ پل پر سے گزرتا اور جہاں گھوڑے تیار تھے وہاں تک جاتا۔ اس حالت میں اس کی طرف بہترین فارسی میں پیغام آیا۔ یہ پیغام حافظ سے اقتباس تھا۔ حافظ کو عرصہ ہوا اس نے بلا بھیجا تھا۔

احمد ابن اویس بادشاہ ابن بادشاہ
جام دنیا کے دلدادے
تجھے تقدیر خسرو کا تخت اور چنگیز کی شوکت عطا کرے۔

ایک سال خاموشی سے گزر گیا اور احمد کو سکون حاصل ہونے لگا کہ یکایک اس خاموشی کو نقارہ و طبل کی گونج نے توڑ ڈالا۔

محفوظ

دس سال سے سمرقند کو جنگ تو کجا جنگ کی ہوا تک نہ لگی تھی اور تیمور کے بے پناہ ارادوں کی رہنمائی میں بہت کچھ تکمیل کیا جا چکا تھا۔

جب تیمور نے سمرقند حاصل کیا تھا اس وقت یہ کچی اینٹوں اور لکڑی کا شہر تھا۔ دس سال میں اس نے اسے مشرق کا روما بنا دیا تھا۔ دوسرے ممالک میں اسے جو کچھ بھی پسند آیا وہ سمرقند کو مزین کرنے کے لیے لے آیا۔ سمرقند کی موجودہ آبادی ہر رنگ اور ہر نوع کی تھی۔ اس نے جنگ کے عجیب و غریب اسیر وہاں آباد کیے تھے۔ مہندس، سائنس دان، منجم، شاعر، صوفی اور فلسفی۔ ہر فتح کی یاد میں ایک نئی عالیشان عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ طلبہ کے لیے کالج اور لائبریریاں مہیا کی گئیں۔ اور فنکاروں کے لیے علیحدہ علیحدہ بازار تعمیر کیے گئے۔ اور علاوہ مختلف ممالک کے جانوروں اور پرندوں کے لیے چڑیا گھر بنایا گیا اور منجموں کے لیے رصدگاہ تعمیر کی گئی۔

یہ شہر تیمور کے خوابوں کا آئینہ تھا۔ وہ اپنی جنگوں میں کبھی اتنا منہمک نہ ہوا کہ وہاں کے فنون کے ایسے شاہکار واپس لانا بھول جاتا جو سمرقند کی زینت کو دوبالا کر سکتے۔ تبریز کا سنگ مرمر، ہرات کی آسمانی اینٹیں۔ بغداد کا چاندی کا کام اور ختن کا صاف یشب سبز یہ سب کچھ اب سمرقند میں تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اب کیا چیز آئے گی اس لیے کہ تیمور کے سمرقند بنانے کا منصوبہ کوئی نہ جانتا تھا۔ اس کی محبت ایسی

ہی تھی جس طرح ایک بوڑھا اپنی حسین رفیقہ سے پیار کرتا ہے۔ اب وہ ہندوستان کے ذخائر کو سمرقند لانے کے لیے اکٹھا کر رہا تھا۔ دس سال میں اس نے جو کچھ مکمل کیا وہ دیکھنے کے قابل تھا۔

۱۳۹۹ء کا سنہ تھا اور موسم بہار کے اوّلیں ایام۔ تیمور ہندوستان گیا ہوا تھا، مگر کابل اور درۂ خیبر کے راستے سمرقند سے آمد و رفت جاری تھی۔ جنوبی شاہراہ سے آتے ہوئے شہر سبز سے گزر کر قاصد ایک میدان سے گزرتا تھا جہاں درختوں کے جھنڈ خیموں اور چھپروں سے بھرے پڑے تھے۔ یہ تازہ واردان میں سے تھے جنھیں ابھی اور کہیں جگہ نہ ملی تھی۔ ان میں قیدی بھی تھے، اور مفت خورے بھی۔ ان میں ایسے بھی تھے جو اس نئی بہشت میں اپنی قسمت آزمانے آئے تھے۔ بھانت بھانت کی بولی اور مختلف طور طریقوں کی دعا و عبادت۔ ان میں نصرانی بھی تھے اور یہودی بھی۔ عرب و مملوک، شیعہ و سنی، ہر رنگ اور ہر قسم کے لوگ موجود تھے۔ کچھ تو تھکی ہاری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور بعض کی آنکھوں میں شراب کا سا خمار تھا۔

یہاں تاجروں کے گھوڑوں اور اونٹوں کی قطاریں بھی بندھی تھیں۔ محافظ پاس ہی تند و تیز ہوا کے جھونکوں میں بیٹھے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ سڑک کے ایک کنارے کنوئیں کے قریب پتھر کی عمارت تھی جس کا نہ تو کوئی خاص رنگ تھا اور نہ گنبد ہی۔ یہ تھا نسطوری عیسائیوں کا گرجا۔

عجیب و غریب نو واردوں کی اس چھاؤنی کے بعد امرا کی جاگیریں شروع ہوتی تھیں۔ درختوں کے سبز گھنے پتوں میں سے محل کی سفید دیواریں کہیں کہیں جھلکیاں دکھا رہی تھیں۔ قاصد ابھی شہر کی فصیل سے ایک میل دور ہوتا کہ مضافاتِ شہر میں داخل ہوتے ہی اسے جامعۃ العلوم کے بلند مینار پر جلی حروف میں لکھا نظر آتا:

محفوظ

"اللہ اکبر۔ لا الہ الا ہو"

سڑک سفیدے کے دو رویہ درختوں کے بیچ میں سے ہوکر گزرتی ہے۔ بائیں جانب نہریں اور نہروں پر پل ہیں، پھر باغات کا پیچیدہ اور لا متناہی سا سلسلہ۔ یہیں "دلکشا" نام کا باغ ہے جو محل کے باہر واقع ہے۔ سنگ تراش محل کے آخری مراحل میں مصروفِ کار ہیں۔ پنچوں سے لدے ہوئے پھل والے درختوں کے پیچھے پانچ سو قدم لمبی دیوار ہے جو مربع کا ایک پہلو ہے۔ چاروں دیواروں کے وسط میں محرابی دروازے ہیں جن کے پایوں میں شیروں کے مجسمے ہیں۔

باغ کے اندر ایرانی باغبان کیاریوں، گملوں اور پودوں کی پرداخت میں لگے ہوئے ہیں اور غلام اینٹ، گارے اور پتھر کا ملبا اٹھا اٹھا کر جگہ صاف کر رہے ہیں۔ سنگ مرمر کے ستونوں کی قطار کے پیچھے سے اصل محل بلند ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی تین چھتیں ہیں۔ اس کا نقشہ اور ساختمانی کا اہتمام قابل فنکاروں کی زیر نگرانی تھا۔

جونہی محل میں داخل ہوتے ہیں، سامنے بڑا سا دیوان ہے۔ اس میں چتر کار اور نقاش ابھی کام کر رہے ہیں۔ ہر نقاش کو دیوار کا مخصوص حصہ سپرد کیا گیا ہے۔ ڈاڑھی سے مزین چینی رنگوں کی آمیزش میں مصروف ہے۔ اس کے پاس ہی موٹے قلم سے نقاشی کرنے والا شیرازی دربار کا مشہور نقاش موجود ہے اور ظاہر ہے کہ اسے اپنی قابلیت پر ناز ہے۔ ان کے قریب ہی ایک ہندو کھڑا ہے جو نقش و نگار کا ماہر تو نہیں مگر چونے کے اوپر سونے اور چاندی کے ورق چڑھانے میں مشاق ہے۔ دیوان کی سقف پھولوں کا مرقع ہے۔ یہ نقش و نگار اقلیدسی شکلوں کا شاہکار ہیں۔ دیواریں چمک رہی ہیں۔ جیسے سفید چینی جو ابھی ابھی صاف کی گئی ہو۔

شہر کے شمال کی جانب۔ ایسا ہی ایک باغ ہندوستان کو تیمور کی روانگی سے پہلے مکمل کیا گیا تھا۔ وقائع نگار جو روزنامچہ لکھنے کا ذمہ دار تھا یوں رقمطراز ہے:

"ہمارے بادشاہ نے وہاں ایک رات کے لیے اپنے شامیانے میں قیام کیا۔ اس نے یہ جگہ جشن اور کھیل تماشے کے لیے چنی تھی۔ اس نے ماہرین ساختمانی کے لیے ایک نقشہ بھی تجویز کیا۔ چار امیر چاروں کونوں کی بارہ دریوں کی تعمیر کی دیکھ بھال پر مامور ہوئے۔ امیر تیمور اس عمارت کی جلد تکمیل کے اس قدر خواہاں تھے کہ وہ ڈیڑھ مہینے تک وہیں رکے رہے۔ تبریز کا سنگ مرمر چاروں کونوں پر سنگ بنیاد کے طور پر رکھا گیا۔

دیواروں کے نقش و نگار اصفہان اور بغداد کے فنکاروں کا شاہکار تھے انھوں نے اس پر اس قدر محنت اور توجہ دی کہ تیمور کے اعجوبوں میں جو چینی لنقاشی کے نمونے تھے وہ بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتے تھے۔ صحن پر سنگ مرمر بچھایا گیا تھا۔ دیواروں کا زیریں حصہ اندر اور باہر دونوں طرف اسی قسم کی چینی کا تھا۔ اس کا نام "شمالی باغ" ہے۔"

باغ محلوں کے اس دائرے کے وسط میں شہر ہے۔ دیواروں کا محیط پانچ میل ہے۔ باب فیروزہ کے اندر چھپر سواروں کی ایک تعداد جا رہی ہے۔ ادھر سے نمدپوش قاصد آ جاتا ہے۔ اس کا گھوڑا پسینے میں شرابور اور منہ سے جھاگ نکل رہا ہے۔ قاصد کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا مگر اس کی خونی آنکھیں گرد آلود پلکوں سے اس کی ہیئت کی تفسیر ہیں۔ سوار اسے دیکھتے ہی راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی فوج سے آیا ہوا قاصد ہے۔

باب فیروزہ کے ارد گرد پھرنے والے بیکار جوان بھی قاصد کو دیکھ لیتے ہیں۔ جوں جوں قاصد ہجوم میں سے راستہ بناتا جاتا ہے وہ اس کے پیچھے پیچھے بڑھتے چلے آتے ہیں۔ عارضی محلے سے گزر کر جہاں زرد رنگ کے اترے ہوئے چہروں والے پوستین پہنے ادھر ادھر کونوں میں کھڑے ہیں وہ زین سازوں کے بدبودار بازار سے گزرتا ہوا حاکم شہر

کے محل کی طرف بڑھتا ہے جہاں محرر بادشاہ کے احکام نقل کرنے کے لیے موجود ہیں۔ ہجوم دروازے کے باہر رک جاتا ہے کہ شاید کوئی خبر مل جائے۔ افواہیں دیواروں کے اندر نہیں گھڑی جاتیں۔ پیغام اہم نظر آتا ہے۔

بادشاہ کی طرف سے حکمنامہ، مگر حکم کی نوعیت معلوم نہ ہو سکی۔ حاکم شہر کے افسر گھوڑے دوڑا کر باہر چلے جاتے ہیں۔ اب زبانیں چل نکلی ہیں۔

حصار کی پہاڑی پر مضبوط تاتاری پہرہ ہے۔ یہاں شاہی حرم کی بیگمات رہتی ہیں۔ جہاں ان کے اپنے دربار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو باغات میں محل عطا ہو چکے ہیں۔ اور انھیں باغات میں سے ایک میں آج جشن منایا جا رہا ہے۔

یہ عمارت لالہ وگل کے کھیتوں سے گھری ہوئی ہے۔ وہاں پہنچ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس کی چھت چینی پگوڈہ قسم کی ہے۔ ایک کمرے سے دوسرے میں جانے کے لیے محرابی دروازوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ گلابی رنگ کے ریشمی پردے لٹک رہے ہیں دیواروں اور سقف پر چاندی کا کام ہے اور اس میں موتی جڑے ہوئے ہیں۔ ریشمی جھالریں جب ہوا سے ہلتی ہیں تو پردوں کا شک ہوتا ہے۔

نیزوں کے اوپر ریشمی کپڑے کی چھتنیں ہیں جنھیں دیوان کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ فرغانہ اور بخارا کے قیمتی قالین فرش پر بچھے ہوئے ہیں۔ ہر کمرے میں سونے کی تپائیاں ہیں جن کے اوپر عطر کی بوتلیں رکھی ہیں۔ ان پر لعل، زمرد اور فیروزے جڑے ہیں۔ شہد کے گھڑے بھی سونے کے ہیں۔ سادہ اور خوشبودار شراب کی صراحیاں بھی سونے کی ہیں جن کے اندر کی سطح موتیوں کی ہے۔ ایک صراحی کے قریب چھ جام بھی رکھے ہیں۔ شراب کے نیچے دو انگل کی چوڑائی کا لعل چمک رہا ہے۔

جشن بابر شامیانے میں منایا جا رہا ہے۔ یہاں بوڑھا معاوہ بھی بیٹھا ہے چند تاتار اور شاہی نسل کے کچھ ایرانی شہزادے بھی۔ ان کے علاوہ چند دنوں کے لیے آئے

ہوئے افغان اور عرب سردار بھی بیٹھے ہیں۔ جب وہ سب پہنچ چکتے ہیں تو سرائے ملک خانم تشریف لاتی ہیں۔

ملکہ کے آگے آگے حبشی کنیزیں ہیں اور ان کے ساتھ ان کی سہیلیاں نگاہیں نیچی کیے خراماں خراماں چل رہی ہیں۔ محل کی ملکہ کا سر بلند ہے۔ اس کے سر پر قرمزی رنگ کا تاج ہے جس کے کونے محل کے میناروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ماتھے کی پٹی سونے کی ہے۔ اوپر لعل و گہر جڑے ہیں کشیدہ کاری کا کام بھی عمدہ ہے مگر اس تاج کا بوجھ ملکہ کو محسوس نہیں ہو رہا۔ تاج کے منار نما کنگروں سے سفید کلغیاں اوپر اٹھی ہوئی ہیں۔ کچھ پر اس کے چہرے اور گالوں پر بھی پڑ رہے ہیں اور ان کے درمیان سونے کی مہین زنجیریں چمک رہی ہیں۔

اس کے کھلے لبادے کا رنگ بھی قرمزی ہے۔ اس کے کناروں پر طلا بانی کا کام ہے۔ پندرہ عورتیں اس لبادے کا دنبالہ سنبھالے پیچھے پیچھے آ رہی ہیں۔ سرائے خانم کے منہ پر سپیدے کا سفید غازہ ملا ہوا ہے۔ چہرے پر مہین ریشم کی نقاب پڑی ہے جس سے اس کی رنگت اور خوبصورتی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔

جب وہ بیٹھ چکتی ہے تو ایک اور شہزادی داخل ہوتی ہے۔ عمر میں کم اور رعب و دبدبہ بھی سرائے خانم سے کمتر مگر سنجیدہ اور سرائے خانم کی خدمت میں مؤدب۔ اس کے گہرے رنگ اور ترچھی آنکھوں سے ظاہر ہے کہ وہ مغل نسل سے ہے مغل خان کی بیٹی۔ تیمور کی آخری دلھن۔

جام بردار چاندی کی سینیوں میں جام رکھے بیگمات کی طرف بڑھتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں سفید دستانے ہیں تاکہ وہ ہاتھوں سے جام تک نہ چھوئیں۔ وہ دو زانو ہو کر جام پیش کرتے ہیں۔ جب بیگمات ایک گھونٹ پی لیتی ہیں تو وہ پچھلے پاؤں

ہٹ جاتے ہیں۔ دوسرے غلام شہزادوں کو جام پیش کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں شہزادے جام خالی کر کے سینی میں اٹھا کر رکھ دیتے ہیں تاکہ میزبان ملکہ کو یقین ہو جائے کہ اس کی مہمان نوازی کو عزت و احترام کی نگاہ سے قبول کیا گیا ہے۔

تیمور کی قیام گاہ دوسری جگہ ہے۔ حصار کے دوسرے سرے پر۔ یہاں تیمور کے سٹاف کے اُن افسروں کے شامیانے بھی ہیں جو اس کے ساتھ ہندوستان کی مہم پر نہیں گئے یہیں قاضی، خزانچی اور دوسرے سول افسر بھی رہتے ہیں۔ ان کے لیے گھاٹی کے اوپر علیحدہ قلعہ ہے۔ یہ اسلحہ خانہ اور تجربہ گاہ کا کام بھی دیتا ہے۔ اس میں مختلف انواع و اقسام کے بہترین اسلحہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں ہندوں کے کام کے نمونے بھی ہیں۔ بڑی بڑی سینروں پر منجنیقوں اور نار رومی پھینکنے کی مشینوں کے نئے نئے نمونے۔ یہاں ایسے کمرے بھی ہیں جہاں تیغ گر تلواروں کی دھار اور پھل کی مضبوطی کے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ مختلف ممالک سے لائے ہوئے ماہر حرف خود اور زرہ بنانے میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ اس وقت وہ ہلکے خود کے بنانے میں منہمک ہیں جس میں بینی پناہ بھی لگی ہوتی ہے۔ سوار اپنی مرضی کے مطابق اسے چہرے سے ہٹا سکے گا اور حسب ضرورت پھر اوپر ماتھے کی طرف اٹھا لیگا۔

خزانے میں جانے کی اجازت ہے مگر زیادہ دُور تک نہیں۔ آگے چل کر ایک قسم کا گوشۂ درویشی آجاتا ہے جہاں سفید مرمر کے مکان میں عجائب گھر بھی ہے اور چڑیا گھر بھی اور جہاں کبھی کبھی تیمور جا کر سوتا بھی ہے۔ یہاں صحن میں ایک درخت ہے جو دھوپ میں چمکتا ہے۔ اس کا تنہ سنہری ہے۔ شاخیں اور پتے چاندی کے۔ اور پھل۔ شاخوں سے مختلف قسم کے جواہرات، موتی، لعل، فیروزے اور ہیرے۔ بیر، زرد آلو، آلوچہ اور دیگر پھلوں کی شکل میں ٹنگ ٹنگ کر اس چمک کو وہ چند کر رہے ہیں۔ اس درخت پر پرندے بھی ہیں۔ سبز اور سفید۔ چاندی پر میناکاری کے کام کے شاہکار۔ پرندے

اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہیں اور چونچ پھلوں کے بالکل قریب جیسے کھانے میں مشغول ہوں۔ خزانے میں ایک چھوٹے سے قلعے کا نمونہ بھی ہے۔ چاندی، سونے اور زر و جواہرات کا بنا ہوا۔ کنگرے، مینار، فصیل اور دروازے ہر شے مکمل اور قیمتی۔ یہ کھلونا ہی سہی، ذہن کی اختراع مگر اس دولت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو دنیا سے کھنچ کر سمرقند میں آئی ہے۔

سفری مسجد اب کہیں نظر نہیں آتی۔ یہ نہایت ہلکی مگر مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی تھی نیلا اور قرمزی رنگ، اونچی سی سیڑھی اور روشنی رنگین شیشوں سے اندر داخل ہوتی تھی۔ اسے کھول کر گاڑی میں لادا جا سکتا تھا۔ اب بھی وہ گاڑی میں رکھی ہوئی ہے۔ اسے ہر روز تیمور کے لیے نماز کے اوقات پر تیار کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی مہم کے دوران میں وہ اسی میں نماز ادا کرتا ہے۔

اب دوپہر کا وقت ہو گیا ہے۔ بازار میں بھیڑ بھاڑ اور غل غپاڑے کے علاوہ قدرے گرمی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں تاتاری ہر شے خرید سکتے ہیں۔ من و سلویٰ سے لے کر حسین و جمیل کنیزوں تک۔ مگر اس وقت اکثر تاتاری بازاروں سے گزر کر باہر بی بی خانم کے مقبرے کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ ایک کارواں سے ہٹ کر چلنے کے لیے وادی کی طرف سے ہو کر جا رہے ہیں۔ کارواں ملک خطا سے آیا ہے اور اونٹوں پر پٹ سن کی بوریوں میں گرم مسالا لایا ہے۔ گرم مسالا ماسکو سے آگے ہنسے نام کے شہر کو جا رہا ہے۔ بوریوں پر چینی اور عربی حروف میں کچھ لکھا ہے۔ ان پر تاتاری کسٹم افسر کی مہر بھی نظر آ رہی ہے۔

بڑے محلوں کی طرح بی بی خانم کا مقبرہ بھی ایک پہاڑی پر ہے۔ اس کے چاروں طرف نازک سفیدے کے درخت ہیں۔ عمارتیں بہت وسیع ہیں اور صرف فاصلے سے ان کا صحیح رقبہ ذہن میں آسکتا ہے۔ ان میں ایک مسجد، ایک جامعۃ العلوم، استادوں

کے مکان اور شاگردوں کے قیام کا انتظام ہے گو تمام عمارتیں ابھی مکمل نہیں ہوئیں۔ مسجد کا حجم روما میں سینٹ پیٹر کے گرجے کے برابر ہوگا۔ اس میں وسطی گنبد شامل نہیں، صرف پہلوؤں کے مینار شامل ہیں جو دو دو سو فٹ اونچے ہونگے۔ ان تک پہنچنے کے لیے پتھروں کے فرش کے کشادہ صحن میں سے مرمریں گول حوض کے گرد ہو کر جانا پڑتا ہے۔ یہاں بارعب علماء بیٹھے ہیں جو سر پر وزنی پگڑی جیسے بخارا کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ یہاں فیلسوف بھی ہیں جو منطق و دلائل کے اصولوں سے واقف ہیں اور علماء سے سرگرم بحث ہیں جیسا کہ دستور ہے علماء عقلی دلائل کو اہمیت دینے سے انکار کر رہے ہیں۔

"ابو سینا کو کس نے حکمت سکھائی تھی؟" سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا ایک عرب پوچھتا ہے "کیا اس نے تجربات نہیں کیے۔ کیا اس نے مشاہدے سے فائدہ نہیں اٹھایا؟" پاس ہی حلب سے آیا ہوا فیلسوف کہتا ہے "اور اس نے اپنے مشاہدات کو کتابی صورت بھی دیدی ہے۔" ایک اور کہتا ہے "بالکل بجا۔ مگر اس نے ارسطو کے قانونِ قدرت کا بھی تو مطالعہ کیا تھا۔"

"بجا ہے" ایک مولوی صاحب کہنے لگے۔ انھیں اتنے نادانوں کے سامنے اپنی علمیت پر شک ہونے لگا تھا۔

"مگر آخر میں وہ کس نتیجے پر پہنچا؟"

"واللہ" عرب نے مسکرا کر کہا "میں اس کی کتابوں کے اختتام کی نسبت تو کچھ نہیں جانتا۔ البتہ اس کا اپنا خاتمہ عورتوں سے محبت کرنے کا نتیجہ تھا۔"

"تم کم فہم ہو" ایک بھاری بھرکم آواز آئی "اس کا صحیح خاتمہ کیا تھا؟ جب اس صاحب عزم حکیم کی موت کا وقت قریب ہوا تو اس نے کہا کہ الکتاب کو بآوازِ بلند پڑھنا چاہیے۔ یوں اس نے بخشش کا راستہ دکھایا۔"

اس پر حلب سے آیا ہوا فیلسوف سر اٹھاتا ہے۔

"سنو۔ تم سب افکار کی صاف و شفاف سطح کو بحث و تمحیص کے تھوک سے گندہ کر رہے ہو۔ میں تمھیں امیر تیمور کی ایک کہانی سناتا ہوں۔"

حاضرین مجلس اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ انھیں بتاتا ہے کہ دو سال قبل سمرقند کے عالم فاضل شیعیانِ علی سے تیمور کی موجودگی میں بحث کر رہے تھے۔

میں نے سنا کہ امیر تیمور نے ان سے ایک سوال کیا ہے۔ سوال یہ تھا۔ آیا اس جنگ میں اس کی فوج کے مقتول شہید مانے جائیں گے یا اس کے دشمنوں کی فوج کے مقتولین۔ کسی کو جواب کی ہمت نہ پڑی۔ آخر کار ایک قاضی نے جواب دیا کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس سوال کا جواب دے چکے ہیں۔ ان کا فرمان ہے "جو لوگ اپنی جانوں کی حفاظت کے لیے لڑتے ہیں یا جو محض جرأت و دلیری کی وجہ سے لڑتے ہیں قیامت کے دن ان کے دیدار سے مشرف نہ ہونگے۔ صرف وہی ان کا شرف حاصل کر سکیں گے جو الکتاب کے احکام کے تحت اپنی جانیں دیتے ہیں۔"

"امیر نے پھر کیا کہا" ایک عالم نے پوچھا۔

"اس نے قاضی سے پوچھا کہ اس کی عمر کتنی تھی؟ قاضی نے کہا۔ چالیس برس۔ پھر امیر نے کہا کہ اس کی اپنی عمر صرف ساٹھ اور دو سال تھی، پھر امیر نے ان سب کو تحائف دیے جنھوں نے بحث میں حصہ لیا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے سامعین نے الفاظ پر غور کیا تاکہ آئندہ دہرانے کے لیے کوئی لفظ ذہن سے اُتر نہ جائے۔

"میرا خیال ہے" عرب نے کہا "تم نے یہ حکایت شریف الدین کی تاریخ میں دیکھی ہے۔"

حلب سے آئے ہوئے مسافر نے کہا "جو کچھ میں نے سُنا وہ کہہ دیا۔ شریف الدین نے یہ حکایت مجھ سے سُنی ہوگی۔"

"یہ تو وہ بات ہوئی جیسے پشتو نے کہا تھا یہ لباس میرا ہے" عرب نے طنزاً کہا "اے احمد! کیا تیرے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا؟"

"اگر تم امیر تیمور کے اعتقاد کا یقین نہیں کرتے تو پھر سامنے دیکھو" احمد نے کہا۔ اور اس نے ڈھیلے عبا کی نہوں سے ہاتھ نکال کر بی بی خانم کے نیلے فیروزی رنگ کے گنبد کی طرف اشارہ کیا۔ صحرا کے درمیان چٹان کی طرح بلند مگر حسین مقبرہ سامنے تھا۔ عرب کچھ کم نہ تھا۔ اس نے جواب دیا "یہ تو میں دیکھتا ہوں۔ مگر یہ تو امیر کی ملکہ نے تعمیر کرایا تھا" جس نے یا جس کے لیے تیمور نے یہ عمارت تعمیر کرائی پاس ہی کے باغ میں ابدی نیند سو رہی ہے۔ قبر سنگ مرمر کی ہے۔ جہاں لوگ زیارت کے لیے ہجوم اندر ہجوم جاتے رہتے ہیں اور تاتاری شمشیر بردار پہرے پر ہوتے ہیں۔

مسافروں کو معلوم ہے کہ یہ قبر الجائی آغا کی ہے اور اس کی لاش شہر سبز سے یہاں لائی گئی تھی۔ مگر بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شہزادی چین سے آئی تھی[1]۔ بعض آدمی آپ کو یہ بھی بتائیں گے کہ ایک رات چور جواہرات چرانے کے لیے آئے مگر انھیں سانپ نے ڈس لیا۔ صبح جب پہرہ دار آئے تو انھوں نے چوروں کی لاشیں مقبرے میں پڑی دیکھیں۔

جب سایے بڑھ جاتے ہیں تو سمرقند کے علماء اور فیلسوف ان مباحث کو ختم کرتے ہیں۔ کچھ تو حماموں کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں تیل کی مالش، مٹھی چاپی، صابن سے صفائی اور سرد گرم پانی سے نہا کر پھر بدن کو خوب خشک کرتے ہیں۔ اتنے میں ان کے کپڑے بھی دھل کر آجاتے ہیں اور اب وہ کسی سردار کے ہاں کھانا کھانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یا پھر دریا

---

[1] بی بی خانم کے متعلق اتنی کہانیاں مشہور ہو گئی ہیں کہ اس خاتون کا صحیح نام معلوم نہیں ہو سکتا۔ گو بعض تواریخ کہتی ہیں مگر تیمور نے کسی چینی شہزادی سے شادی نہ کی البتہ مغل خان کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ مگر اس شادی کے وقت بی بی خانم کے مقبرے کی کچھ عمارات تیار ہو چکی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ملکہ سرائے خانم بھی نہیں ہو سکتی۔

کے کنارے کسی باغ میں جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ دریا کا کنارا تاتاریوں کے لیے عیش و طرب کا مرکز ہے۔ وہاں بھنے ہوئے گوشت کی دکانیں، انواع و اقسام کے خوشبودار کھانوں کے انبار اور پلاؤ، کباب کے خوان شام کے وقت موجود ہوتے ہیں۔ عام طور پر ایسی شاموں کا اختتام شراب خانوں میں ہوتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر وہ ہجوم کو گزرتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔

دریا کے ساتھ ہی سوتی قناتوں کی دیواروں کے اندر تمثیل نگاری ہو رہی ہے۔ مختلف تاریخی کھیل کھیلے جا رہے ہیں۔ البتہ اکثر و بیشتر لڑائیوں کے مناظر پیش ہیں۔ جادو کے چراغ سے تصویریں دکھائی جا رہی ہیں۔ جادوگر زمین پر اپنا قالین بچھائے کرتب دکھلا رہے ہیں اور تماشائیوں کے اوپر سے بازی گر رسوں کے اوپر چل رہے ہیں۔ بعض تاتاریوں کو باغ کے کنج تنہائی پسند ہیں جہاں انار کے درختوں کی ٹہنیوں میں نیلے چراغ ٹنگ رہے ہیں اور جام و مینا پاس رکھے ہیں۔ دن کی افواہوں کا تبادلہ ہوتا ہے اور خبروں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ پاس ہی ایک موسیقار جھنکارے پر راگ الاپتا ہے۔ جب موسیقی ختم ہوتی ہے تو ایک شاعر ادھر ادھر دیکھ کر ایک نامعلوم سے منجم شاعر کا کلام پیش کرتا ہے جو اپنے آپ کو خیمہ ساز کے نام سے یاد کرانا چاہتا تھا:

ہم شطرنج کے پیادے ہیں
شاطر کی خوشنودی کے لیے
تھوڑی دیر وہ ہمیں بساط پر چلاتا ہے
پھر ہم موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں

خانم - بڑی اور چھوٹی

سمرقند کو تیمور کے تخیل نے نیا جامہ پہنایا۔ اپنی قوم کے دوسرے فاتحوں کی طرح اس نے ایرانی فنون کی نقل نہ اتاری۔ اس نے بھی ایرانی عمارتیں دیکھیں۔ وہ جنوب سے معماروں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر سمرقند کا تخیل تاتاری تھا نہ کہ ایرانی۔ سمرقند اور تیمور کے دوسرے شہروں کے کھنڈروں میں اب بھی تاتاری فن کا نقشہ جلوہ گر ہے۔ تاتاری ذہنیت اور تخیل کا آئینہ دار۔ ان کھنڈروں میں بھی جاودواں حسن موجود ہے۔

بعض حالات میں تاتاری فن ساختمانی گھناؤنا بھی ہے۔ خصوصاً تفاصیل کے لحاظ سے بعض جگہ محض حجم اور وہ بھی بھڑکیلا سا حجم نظر آتا ہے اور اس کے پیچھے نامکمل سا اینٹ اور چونے کا کام مگر ہر نقشہ اپنی سادگی کے لیے نمایاں ہے۔ تیمور کو حجم، وسعت اور بلندی کا شوق تھا۔ کم از کم دو دفعہ اس نے مکمل عمارتوں کو گرانے کا حکم دیا اور ان کی جگہ ان سے بڑی عمارتیں بنوائیں۔ اسے رنگ اور خصوصاً شوخ رنگ بھی پسند تھا۔

تاتاری نسل کا سادہ مذاق اور بادیہ نشینی کی بے آوازہ حسن شاعری اس کی ذات میں موجود تھی۔ اسی لیے اس کی عمارتیں سادہ مگر حسین تھیں۔ صحرا نشینوں کی طرح وہ سبزہ و گل اور بہتے ہوئے پانی کا گرویدہ تھا۔

سمرقند میں مرکزی میدان بھی تھا جہاں عبادت ہوتی، باتیں ہوتیں۔ جہاں ملک ملک کی سیاست اور خبروں پہ تبصرہ ہوتا اور جہاں امراء ایک دوسرے سے ملتے اور تاجر لاکھوں کے سودے لمحوں میں کرتے۔ اسے ریگستان کہتے تھے۔

اس کی چاروں طرف وہ عمارتیں تھیں جو تیمور کے حکم سے تعمیر کی گئی تھیں۔ مسجدیں اور دارالعلوم۔ چھوٹی سی پہاڑی کی پوری بلندی پر یہ میدان پھیلا ہوا تھا۔ یہاں نہریں تھیں اور فوارے۔ جس روز سرائے خانم کا جشن منعقد ہوا تھا اس سے دوسرے دن صبح کے وقت میدان میں بہت بڑا ہجوم تھا۔ اس سے ایک دن قبل ایک قاصد کے آنے کی خبر پھیلی تھی۔

"ابھی تک کچھ معلوم نہیں" امراء اور روساء کہہ رہے تھے "اتنا ضرور معلوم ہے کہ پیغام امیر کی طرف سے آیا تھا۔ اور یہ خاموشی۔ کیا اس پردہ داری کے یہ معنی تو نہیں کہ کوئی آفت آنے والی ہے یا کوئی حادثہ پیش آچکا ہے؟"

انھیں یاد آیا کہ بڑے امراء ہندوستان جانے پر خوش نہ تھے۔ صرف تیمور کے اکسانے پر وہ رضامند ہوئے تھے۔ اور تو اور تیمور کے پوتے محمد سلطان نے کہا تھا "ہم اگر ہندوستان کو فتح کر بھی لیں پھر بھی ہندوستان کی بہت سی فصیلیں ہیں۔ اوّل تو دریا ہیں پھر بیابان اور جنگل۔ تیسرے زرہ پوش سپاہی اور آخر میں ہاتھی۔ انسانوں کو تباہ کرنے والے۔"

ایک تاتاری امیر جو وہاں جا چکا تھا کہنے لگا "ہند گرم ملک ہے۔ یہاں کی گرمی کی طرح نہیں بلکہ بیمار کرنے والی اور طاقت کو زائل کرنے والی گرمی۔ وہاں کا پانی بھی خراب ہے۔ ہندی جو زبان بولتے ہیں وہ ہماری زبان سے مختلف ہے۔ اگر فوج وہاں زیادہ عرصہ رہ جائے تو پھر کیا ہوگا؟"

اسے شاید 'ہرچہ در کانِ نمک رفت نمک شد' کا ڈر تھا۔

اس تاتاری مجلس میں عقلمند مشیر بھی تھے۔ اور ایسے آدمی بھی جو ممالک کے بست و کشاد کے ذمہ دار رہ چکے تھے اور اب تیمور کی فتوحات نے انھیں دوسری راہوں پر لگا دیا تھا۔

"ہندوستان کی دولت لا انتہا ہے" انھوں نے رائے پیش کی "اس دولت سے

ہم دنیا کو فتح کر سکیں گے ۔"

وہ جانتے تھے کہ پہاڑوں کے اُس پار جو وسیع مملکت تھی وہ ایشیا کا زریں خزانہ تھی اور تیمور چاہتا تھا کہ اس دولت کو اپنے تصرف میں لائے۔ انھیں یہ بھی شک تھا کہ تیمور ہند کے راستے چین کی نئی شاہراہ کھولنا چاہتا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ دو لشکر ختن سے آگے صحرائے گوبی کی دیکھ بھال کرنے گئے تھے۔ انھوں نے یہ اطلاع دی تھی کہ ختن سے کمبالو تک دو مہینے کا راستہ ہے۔ انھوں نے کشمیر میں بھی دیکھ بھال کی تھی جہاں کے پہاڑ چین کے درمیان سدِّ راہ تھے۔

مشیروں کو یہ بھی علم تھا کہ تیمور نے کچھ عرصہ پہلے مغل خان کی نوجوان شہزادی سے عقد کیا تھا۔ اور حال ہی میں چین کے شہنشاہ کی موت واقع ہوئی تھی۔

ایک نے کہا "دنیا میں چھ ایسے بادشاہ ہیں کہ ان کی وسیع مملکت کا کوئی نام نہیں۔ ابن بطوطہ نے یہ کہا تھا۔ اور اس نے ان سب کو دیکھا تھا"

"چھ کہاں ہیں" ایک اور نے ہنس کر کہا "ایک ہی ہے۔ اور اس کا نام امیر تیمور ہے"

ایک اور جو زیادہ تجربہ کار تھا اس نے کہا "نہیں۔ ابن بطوطہ صحیح تھا۔ اس نے ان کے نام بھی دیے ہیں۔ قسطنطنیہ کا تکفور، مصر کا سلطان۔ شاہِ بغداد۔ تاتاری امیر۔ ہند کا مہاراج، اور چین کا فغفور[1]۔ اب تک ہمارا امیر ان میں سے صرف شاہ بغداد کو شکست

---

[1] تکفور سے مراد امپرر شہنشاہ ہے۔ ابن بطوطہ کی فہرست سے شاید یورپی قاری حیران ہو جائے البتہ خیال یہ ہے کہ یونانی شہنشاہ اور سلطانِ بغداد کو اس نے گزشتہ عظمت کی وجہ سے اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ ان کے علاوہ اس کی فہرست صحیح معلوم ہوتی ہے۔ یورپ اس وقت چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور نوابیوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور یورپی فتوحات ابھی شروع نہ ہوئی تھیں۔ آخری صلیبی بھی واپس جا چکے تھے۔ ایشیا میں یہ عام خیال تھا کہ یورپ کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہی ہے۔

دے چکا ہے!"

تاتاری افسروں نے نہایت غور سے اپنی گزشتہ چالیس سال کی جنگوں پر نگاہ ڈالی۔ بوڑھا سیف الدین اور معاذہ بھی اس دن ریگستان میں موجود تھے۔ ان چالیس برسوں میں ان چھ میں سے صرف ایک حکمران امیر تیمور سے بھاگا تھا۔ اور اب وہ بھی واپس بغداد پہنچ چکا تھا۔

مغرب سے جو خبریں آئی تھیں وہ کچھ اچھی نہ تھیں۔ کوہ قاف میں بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی اور سلطان نے دوبارہ عراق پر قبضہ کر لیا تھا۔ اگر خدانخواستہ امیر کو ہند میں شکست ہو جائے! تیمور کے سپاہی فتوحات کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ وہ اور کسی نتیجے کا خیال بھی نہ لا سکتے تھے۔ تیس ہزار کی فوج درۂ خیبر سے اتر کر ہند میں داخل ہو چکی تھی اور دریائے سندھ پر پل باندھ کر اسے عبور کر چکی تھی۔ ملتان فتح ہو چکا تھا اور اب تیمور دہلی کے سلطان کے خلاف آگے بڑھ گیا تھا۔

تاتاری امراء جن کے ہاتھ میں وطن کی حکومت تھی ہاتھیوں کی جنگی صلاحیت کے متعلق سوچتے رہتے۔ انھوں نے یہ جانور کبھی نہ دیکھے تھے۔

اس صبح ریگستان میں خبر نہایت سرعت سے پھیلی۔ قاصد کا پیغام معلوم ہو چکا تھا۔ تمام رات حصار کے پہرہ دار اس کی وجہ سے جستجو کرتے رہے تھے۔

"امیر کا پیغام ایک حکم کی صورت میں ہے۔ شادی ملک کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم"

سمرقند سوچنے لگا کہ شادی ملک کون ہے۔ صرف چند لوگ اسے جانتے تھے۔ ان میں بوڑھا سپہ سالار سیف الدین بھی تھا۔

یہ بوڑھا امیر گزشتہ مہم کے اختتام پر ایران سے واپسی پر سیاہ زلفوں والی ایک حسینہ کو ساتھ لایا تھا۔ سفید مرمریں رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور جسم کی

پروردہ - جوان خلیل خان شادی کا سب سے چھوٹا لڑکا اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ اس
کی درخواست پر سیف الدین نے یہ لڑکی اسے دے دی - یہ تھی شادی ملک - دربار کے
آداب سے واقف - شاہی کنیزوں کے غمزوں سے شناسا، اب تیمور کے پوتے کا قرب
حاصل کر چکی تھی -

خلیل اس کی محبت میں اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ وہ گھنٹوں اپنی نئی داشتہ
کے قدموں میں بیٹھا رہتا - وہ اب اس سے شاہانہ شادی کی فکر میں تھا - جہاں دربار
کے تمام امراء اور سردار موجود ہوں اور شاہی خاندان کی شہزادیاں بھی -

تیمور نے یہ درخواست رد کر دی تھی اور حکم دیا تھا کہ شادی ملک کو اس کے
حضور میں پیش کیا جائے - ڈر کے مارے لڑکی کہیں بھاگ گئی تھی یا ممکن ہے خلیل نے
اسے کہیں چھپا دیا ہو - فوراً ہی بعد فوج ہندوستان کو روانہ ہو گئی تھی -

اب ہندوستان سے فاتح نے حکم بھیجا تھا کہ شادی ملک کو قتل کر دیا جائے -
خلیل اب اس کی مدد نہ کر سکتا تھا اور نہ وہ چھپ ہی سکتی تھی - اس کے لیے چپا چپا
چھانا جا رہا تھا - اس نے نقاب پہنا اور سیدھی شہزادی سرائے خانم - دربار کی ملکہ -
کے محل میں پہنچی - وہاں اس نے ملکہ کے پاؤں پکڑ لیے اور جان بچانے کے لیے آہ و زاری
شروع کی - اس میں تاتاریوں کی سی جرأت نہ تھی -

عورتوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی، یہ کسی کو معلوم نہیں - مگر اس نقشے کا تصور
باندھا جا سکتا ہے - حسین لڑکی، حنائی ہاتھ سنبل کی سی انگلیاں اور سرخ و سپید گالوں
پر سے آنسو بہتے ہوئے - آنکھوں کا کاجل بہہ بہہ کر رخساروں پر مدھم سی کالی لکیریں
چھوڑتا جا رہا ہوگا - دوسری طرف بے اثر، سنجیدہ اور شاہانہ تمکنت والی ملکہ جس کی
تربیت تاتاری خانموں کی روایات میں ہوئی تھی - شادی ملک عیش و عشرت کی تخلیق
مگر اب خوف سے ہراساں اور لرزہ براندام - ادھر سرائے خانم بیوہ بھی اور بوڑھی بھی -

با اختدار اور حاکم شہزادوں کی ماں اور دادی جس کے گرد پچاس سال کی فکر و تشویش اور جنگ و جدل سے پُر زندگی دائرے بناتی رہی تھی۔ وہ خاموش تھی۔

شادی ملک آخرکار پکار اٹھی کہ وہ خلیل سے حاملہ بھی تھی۔

"اگر یہ درست ہے" ملکہ کے ہونٹ ہلے "تو پھر امیر تیمور انھیں قتل نہ کرائے گا"

اس نے شادی ملک کو اپنے خواجہ سراؤں کے حوالے کیا اور اسے منع کیا کہ تیمور کی واپسی تک خلیل سے نہ ملے۔

بات تو معمولی تھی۔ ایک نوجوان لڑکے کا ایک کنیز سے عشق۔ مگر اس معمولی سی بات پر مملکت کے مستقبل کا انحصار تھا۔ سرائے خانم اور خان زادی میں سخت دشمنی تھی۔ اس لیے کہ خان زادی کا اثر و رسوخ بڑی ملکہ سے کچھ ہی کم تھا۔ اور خان زادی طاقت پسند تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سرائے خانم سے کہیں زیادہ ذہین اور عقلمند لوگ انھیں بڑی خانم اور چھوٹی خانم کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔

کتنا ہی اچھا ہوتا اگر بڑی خانم شادی ملک کو قتل ہونے دیتی۔ بعد میں تیمور نے اس کے فیصلے کی تائید کی اور شادی ملک زندہ رہی۔

سمرقند میں ایک پیغام رساں آیا جس نے اپنے پیغام کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش بھی نہ کی۔ جب وہ محل کے صدر دروازے پر محافظوں کے مکان کے سامنے پہنچا تو گھوڑے کو روک کر پکارا:

"فتح۔ فتح۔ امیر نے فتح حاصل کر لی ہے"

بعد میں دوسرے آئے جنھوں نے تفاصیل بتائیں۔ ان کے قول کے مطابق دہلی کے سلطان کے مقابلے سے پہلے تاتاریوں نے ایک لاکھ کے قریب قیدیوں کو قتل کر دیا تھا۔ ہندوستان کی فوج کو شکست ہو چکی تھی۔ دہلی تسخیر ہو چکی تھی[1] اور افواہ

[1] تیمور کی ہندوستانی فتح مختصر سی مہم تھی۔ وہ دہلی کا محاصرہ نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ

یہ تھی کہ ہاتھیوں کو نار رومی سے منتشر کیا گیا تھا۔

سمرقند میں جشن منعقد ہوا اور ہر رات ریگستان میں ہجوم ہوتا تھا علماء بارگاہ ایزدی میں شکر بجا لاتے۔شمالی ہندوستان قدموں میں تھا۔خزانے کا دروازہ کھل چکا تھا اور ہندو راجہ پہاڑیوں میں روپوش ہو چکے تھے۔اب علماء کی نگاہ کے سامنے ایک نئی خلافت تھی جس کی وسعت بغداد سے ہندوستان تک تھی۔تیمور کی موجودگی امن و امان کی ضامن تھی اور علماء کی طاقت بڑھنے کی قوی امید۔

دوسرے موسم بہار میں فوج شہر سبز اور سیاہ تخت کے راستے سے واپس آ گئی۔ شہر کے باب فیروزی میں قالین بچھا دیئے گئے۔اور حصار کو جو گلی جاتی تھی اس پر قرمزی کپڑا بچھا ہوا تھا۔چھتوں اور باغوں کی دیواروں سے ریشمی اور کشیدہ کاری کے کام کے کپڑے لٹک رہے تھے۔دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ہر طرف چہل پہل تھی اور لوگ اپنے بہترین لباس میں تھے۔

شہر کے باہر دور تک شہر کے رؤساء، امراء اور باہر سے آئے ہوئے شہزادے امیر کے استقبال کو پہنچے ہوئے تھے۔سرائے خانم بھی اپنا دربار لیے گھوڑے پر سوار اسی طرف کو روانہ ہوئی۔اس کی آنکھیں زرہ پوش سواروں میں سے اپنے بیٹے شاہ رخ کے چہرے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔خان زادی بھی یہیں منتظر تھی۔اس کے دو بیٹے بھی انہیں شہسواروں میں تھے۔شہزادہ محمد سلطان اور شہزادہ پیر محمد۔جب شہزادے پاس سے گزرے تو غلاموں نے سونے کا بورا، موتی اور ہیرے جواہرات تیمور کے گھوڑے

۲۔اپنی فوج کو میدانوں میں لے آیا اور وہاں اپنے گرد خندقیں کھدوا دیں جس سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ کمزور ہے اور ڈر رہا ہے سلطان دہلی اس دھوکے میں آ گیا اور کھلے میدان میں جنگ پر آمادہ ہو گیا تیمور بھی یہی چاہتا تھا۔ جونہی ہندی فوج کو شکست ہوئی تیمور نے نہایت اطمینان سے دہلی کا محاصرہ کیا۔بعد میں وہ اور شہروں کی طرف بڑھا۔

کے قدموں پر نچھاور کیے   پھر اس ہجوم پر حیرت طاری ہو گئی۔ گرد و خاک کے بادلوں کے اوپر سے مختلف رنگوں سے مزین اپنے سروں کو ملاتے ہوئے رنگین چلتے پھرتے پہاڑ نمودار ہوئے۔ کل ننانوے قطاریں تھیں۔ آج ان کی پیٹھیں اُن خزانوں سے لدی ہوئی تھیں جو کبھی اُن کے سابق مالکوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔

یوں تیمور آٹھویں بار فاتح بن کر سمرقند میں داخل ہوا۔ اس کے محاصل میں جمنا کی مسجد کا نقشہ بھی تھا اور ساتھ ہی دو سو معمار جنھیں اس نقشے کا بدل تیمور کے تخیل کے مطابق نئے قالب میں ڈھالنا تھا۔ وقائع نگار لکھتا ہے کہ پہلا کام جو تیمور نے سمرقند میں پہنچ کر کیا وہ تھا۔ حمام۔

تیمور ہندوستان کی فتح کی یادگار کسی ایسی چیز سے قائم کرنا چاہتا تھا جو نئی بھی ہو اور
عالیشان بھی۔ خیال ہے کہ وہ اپنے دل میں پہلے سے فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لیے کہ مئی
کے مہینے کی بیسویں تاریخ کو وہ سمرقند میں داخل ہوا اور اسی مہینے کی اٹھائیسویں تاریخ کو وہ
شاہی مسجد کی بنیادوں کی نگرانی کر رہا تھا۔

اس کا طول و عرض عیدگاہ کے پیمانے پر رکھا گیا تاکہ پورا دربار اس میں نماز ادا
کر سکے۔ اب مہندسوں، ساختمانی کے ماہروں اور معماروں کی محنت کے دن تھے۔ اب
تیمور سمرقند میں تھا اور تعمیر کا موسم۔ پانچ سو سنگ تراش پاس کی پہاڑیوں میں روانہ
کیے گئے۔ تراشے ہوئے وزنی پتھر جلد ہی سمرقند کو آنا شروع ہو گئے۔ نئی طاقت، ہاتھی
پوری طرح استعمال ہو رہے تھے۔ ان کے لیے بڑے بڑے پہیوں والی گاڑیاں فوراً تیار
کر لی گئی تھیں اور پہاڑوں سے سمرقند تک پتھروں کا حمل و نقل آسان ہو گیا تھا۔ تیمور
کے دماغ کو ایک اور ترکیب سوجھی۔ جسیم اور طاقتور ہاتھی موجود تھے۔ کیوں نہ انھیں
عمارت کے اوپر بھی استعمال کیا جائے۔ اس نے اپنے مہندسوں کے سامنے یہ مسئلہ
پیش کیا اور بہت جلد جر ثقیل تیار کیے گئے جنھیں ہاتھی کھینچتے اور وزنی پتھر دیواروں
کی بلندی پر بآسانی پہنچا دیے جاتے۔

جب دیواریں چن دی گئیں تو ہندوستانی فنکاروں کی پوری تعداد اندرونی کام
پر متعین ہو گئی۔ تیمور جس یکجہتی سے جنگ کیا کرتا تھا اب اسی یکسوئی سے تعمیرات کی

طرف متوجہ تھا۔ ہندوستان فتح ہو چکا تھا۔ اب ہندوستان کی یادگار شاہی مسجد کے سوا اس کے ذہن میں کوئی کام نہ تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ گزشتہ موسم سرما میں جن راہوں کو اس نے طے کیا تھا ان راہوں پر دو لاکھ آدمیوں نے جان دی تھی۔ یہ درست ہو گا مگر تیمور اس مہم اور اس کے راستوں کو بھول چکا تھا۔ اس کا ذہن ماضی کو فراموش کر چکا تھا۔ مگر حال حسبِ معمول اس کی توجہ کا مرکز تھا اور اس کی خواہش کے بغیر ایک پتھر بھی نہ رکھا جا سکتا تھا۔ وہی لشکر سالار اور سپہ سالار جنھوں نے خون کے دریا بہا کر فتوحات حاصل کی تھیں، اب میناروں، ستونوں اور گنبدوں کی تعمیر کی نگرانی کر رہے تھے۔

شاہی مسجد میں چار سو اسی ستون بلند ہوئے۔ دروازے پیتل کے تھے۔ سقف بہترین مرمر کی تھی۔ منبر فولاد اور چاندی کا تھا اور نقش و نگار کے لیے بہترین خطاط اور نقاش آیاتِ قرآنی لکھ رہے تھے۔

تین ماہ سے کم عرصے میں مؤذن ان نئے میناروں سے مومنوں کو بارگاہِ ایزدی میں جھک جانے کی دعوت دے رہا تھا اور خطیب امیر تیمور کے نام کا خطبہ پڑھ رہا تھا۔

تیمور نے آخر وقت تک شہنشاہ کا لقب اختیار نہ کیا۔ وہ اب بھی امیر تیمور گورگان تھا۔ امیر عالیشان۔ اس نے کبھی طرہ، یعنی حاکم نسل کا فرد ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اس کی دستاویزات نہایت سادگی سے شروع ہوا کرتی تھیں۔

"امیر تیمور نے یہ حکم دیا ہے..." یا اس سے زیادہ انکسار کے ساتھ "میں، امیر تیمور۔ بندۂ خدا، کہتا ہوں کہ..."

مگر اس کے بیٹے جو سب کے سب شاہی تاتاری خاندان کی بیگمات کے بطن سے تھے، 'مرزا' اور 'سلطان' کا لقب استعمال کیا کرتے تھے۔ تیمور نے انھیں جاگیر

کے طور پر ملک ودیعت کیے تھے محمد سلطان جاٹ ممالک کا حکمران تھا۔ پیر محمد ہندوستان کا۔ شریف النفس شاہ رُخ خراسان میں حکومت کرتا تھا اور اپنا محل ہرات میں تعمیر کر رہا تھا۔ معزول شدہ میراں شاہ کے لڑکے مغرب کے علاقے میں ڈیرا لگاتے تھے اور مغرب ہی اس وقت بدامنی کی حالت میں تھا۔

تیمور نے اب تک اپنے جانشین کے متعلق کوئی وصیت یا اشارہ نہ کیا تھا۔ ملکہ سرائے خانم بوڑھی ہوتی جا رہی تھی باوجودیکہ حالات سازگار نہ تھے، اسے امید تھی کہ شاہ رُخ کو جانشین بنا لیا جائے گا۔ اُدھر خان زادی اپنے چھوٹے لڑکے خلیل کے لیے سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ مگر دونوں میں سے کسی کو ہمت نہ تھی کہ کھلے طور پر تیمور کے سامنے یہ ذکر چھیڑے۔ جہاں تک پوتوں کا تعلق تھا وہ خود ان کے معاملات میں غیر جذباتی، منصف اور صلح کُن تھا۔

اسے ان عورتوں کی خواہشات کی چنداں پروا بھی نہ تھی۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہر صبح ہاتھیوں کا کام دیکھا کرتا۔ ایک روز اسے خیال ہوا کہ موجودہ بازار دارالسلطنت کی آمد و رفت کے لحاظ سے از حد تنگ ہے۔ اس نے حکم دیا کہ ریگستان سے دریا تک ایک نئے اور کھلے راستے کی بنا ڈالی جائے اور اس کی دونوں طرف دکانیں سجا دی جائیں۔ یہ کام بیس دن میں ختم ہونا تھا۔ دو امیروں کو یہ کام سپرد کیا گیا اور ان پر واضح کر دیا گیا کہ اگر متعین وقت میں کام ختم نہ ہوا تو ان کا کام تمام کر دیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ دونوں نگران تندہی سے اس کام میں لگ گئے ہونگے۔ جس سیدھ میں تیمور نے نیا بازار بنانے کا حکم دیا وہاں مزدوروں کی ایک پوری فوج موجودہ گھروں کو گرانے پر لگا دی گئی۔ شکایت بیکار تھی۔ جن لوگوں کے مکانات گرائے جا رہے تھے وہ جو سامان سنبھال سکے اسے اُٹھا کر وہاں سے

چلے گئے۔

پھر دن شہر سے بھی مزدور اور فنکار بلا لیے گئے۔ چونا اور ریت جمع کیے جانے لگے۔ ملبا اٹھنے لگا۔ زمین ہموار ہوئی اور سڑک کی سیدھ کے نشانات لگا کر پانی کے بہنے کے انتظامات مکمل کر دیے گئے۔ مزدوروں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا ایک دن کے وقت کام کے لیے اور دوسرے رات کے لیے جو مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ راوی کا بیان ہے کہ رات کے وقت بے پناہ شور میں وہ آگ کے شعلوں کے قریب ہزاروں کی تعداد میں جن معلوم ہوتے۔

یہ وسیع راستہ تیار ہو چکا تھا۔ اب اس کے اوپر محرابی چھت ڈالی گئی جس میں جابجا کھڑکیاں اور روشن دان رکھے گئے اور تاجروں کو بلایا گیا کہ جلد از جلد اپنا سامان لاکر ان دکانوں کو سجائیں۔ ابھی بیس دن کی مہلت ختم نہ ہوئی تھی کہ یہ بازار پُر رونق ہو چکا تھا۔ تیمور سوار ہو کر اس میں سے گزرا اور اطمینان کا اظہار کیا۔

اس عجلت نے نیا مسئلہ ضرور اٹھایا۔ جو لوگ مکانوں سے نکالے گئے تھے، انھوں نے معاوضہ طلب کیا اور قاضی کی عدالت میں مقدمات دائر کیے۔ ایک دن تیمور اپنے قضاۃ کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا کہ ان میں سے کسی نے معاوضے کا سوال اٹھایا۔ فاتح برہم ہو گیا۔

"کیا شہر میرا نہیں؟"

قاضی بھی اپنی جان کو عزیز سمجھتے تھے اور جلاد کی تلوار بھی قریب ہی تھی۔ انھوں نے مصلحت اسی میں سمجھی اور تیمور کو یقین دلایا کہ شہر اسی کی ملکیت ہے مگر تیمور نے تھوڑی ہی دیر بعد کہا:

"اگر لوگوں کو معاوضہ ملنا چاہیے اور تمھارا بھی یہی خیال ہے تو پھر میں ادا کر دوں گا۔"

تیمور کی جامع مسجد

ظاہرا طور پر اس دوران میں تیمور نے کوئی نئی لڑائی شروع کرنے کا خیال تک نہ کیا مگر دراصل وہ معلومات حاصل کر رہا تھا۔ جو مملکت اس کے تحت تھی وہ بجائے خود کافی تھی۔ شمال پہلے ہی سے اس کے پاس تھا اور اب وہ ہندوستان کو بھی نذر آتش کر چکا تھا۔ یہ درست کہ مغرب میں دجلہ کا علاقہ اس سے لے لیا گیا تھا مگر دنیا کی کوئی طاقت اس کی مملکت کے مرکز پہ حملہ آور ہونے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔

وہ اب چونسٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ اس کا بدن اب بھی حسب سابق طاقتور نظر آتا تھا۔ مگر وہ دو چار بار بیمار رہ چکا تھا۔ گو اس کا ذہن اب بھی حاضر تھا مگر اب وہ زیادہ دیر تک خاموش رہتا اور اس کی طبیعت میں سختی عود کر آئی تھی۔ شاہی مسجد خود اس نے بنا ڈالی تھی مگر علماء اب بھی اس پر اثر ڈالنے کے ناقابل تھے۔ تمام عمر وہ اندرونی کشمکش کا شکار رہا تھا۔ اس کے والد کا محکم یقین، اس کے استاد زین الدین کی نصیحتیں اور قانون اسلام، یہ تمام باتیں اس کے آبائی خانہ بدوشانہ اثرات کے منتضاد تھیں۔ صحرا کے خون کو جنگ کا شوق اور بستیوں کی تباہی فطرت کی ودیعت ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیمور اب خانہ بدوشوں کے قانون سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ مرد کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ کشمکش، فتح اور حصول اشیاء کا فاخرانہ احساس۔

مغرب کے بادشاہ اسلام کے ستون مانے جاتے تھے۔ قاہرہ میں خلیفہ اسلام، بغداد میں امیر المؤمنین اور ترکوں کا بادشاہ سیف الاسلام اور ان سب کی نظر میں تاتاری خارج بربریت اور الحاد کا نمائندہ تھا۔

ان کے خلاف لشکر کشی اسلامی دنیا کو دو محاذوں میں بانٹنے کے مترادف تھا۔ اور اس اقدام سے کم از کم دس لاکھ افراد کے صف بستہ ہونے کا امکان تھا۔ علماء صلح کے لیے از حد کوشاں تھے۔ وہ تیمور کو غازی کا خطاب دے چکے تھے۔ اور دین اسلام

کا فاتح ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے ہر منبر سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔

مگر اس تاتاری کے کردار کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ یہ وہی تیمور تھا جو اُوَرگنج کے دروازے پر تن تنہا مبارزت کے لیے بڑھا تھا۔ اگر اسے کوئی للکارتا تو وہ ہرگز خاموش نہ بیٹھتا۔ اب حالات یہ تھے کہ اس کی زیرِ حفاظت سرداروں کو ایشیائے کوچک کی سرحدوں سے باہر نکال دیا گیا۔ اس کے بیٹے کی مملکت پر حملہ کیا جا چکا تھا اور اس کے مامور کردہ حاکم سے بغداد لے لیا گیا تھا۔ یہ صریح الفاظ میں جنگ کی دعوت تھی[1]۔

مئی ۱۳۹۹ء میں وہ داخلِ سمرقند ہوا تھا۔ ستمبر میں وہ اپنی فوج لے کر وہاں سے ایک بار پھر نکلا اور تین سال تک سمرقند نے اسے نہ دیکھا۔

---

[1] اس کے علاوہ تیمور چین پر لشکر کشی کا خیال کر رہا تھا مگر وہ چین کے خلاف جنگ کے لیے اس وقت تک آزاد نہ تھا جب تک مغرب میں اس کے خلاف معاہدہ موجود تھا۔

ہم ان حالات کو اب صاف طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ وہ شطرنج کی بساط کی حرکات کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ پہلے مغل خانوں سے معاہدہ کرے، پھر چین پر حملہ آور ہو۔ اس مہم کے لیے سمرقند سے کئی سال تک غیر حاضر رہنا ضروری تھا۔ سب سے پہلے اس نے ہندوستان کے بادشاہ کو بساط سے ہٹایا جو اس کا قریب ترین دشمن تھا۔ ہندوستان سے جو دولت ہاتھ آئی تھی اس کی مدد سے وہ مغرب کے خلاف روانہ ہوا اور اس طرف اپنی سرحدیں محفوظ کیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ترکوں سے اس وقت تک مقابلہ کرنا نہ چاہتا تھا جب تک وہ یورپ کی طرف متوجہ تھے۔ جب وہ ایشیا میں نمودار ہوئے تو وہ ان کے مقابل بڑھا۔ جونہی مغربی طاقتیں تباہ کر دی گئیں وہ سیدھا سمرقند لوٹ آیا اور چین کی عظیم الشان مہم کی تیاریاں شروع کر دیں۔

تین سال کی جنگ

جو حالات تاتاری خان کے پیش نظر تھے وہ عجیب و غریب تھے۔ دشمن تک پہنچنے کے لیے اسے ایک ہزار میل کا سفر در پیش تھا اور حلفاء کی سرحدیں نیم دائرے کی شکل میں کوہ قاف سے بغداد تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بالکل اس طرح جیسے لچکیلی کمان پوری طاقت سے کھینچ کر محرابی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تاتاری فوج جب مشہور خراسانی شاہراہ پر روانہ ہوئی تو جس طرح تیر چلّے سے چل کر محراب کے مرکز کی طرف بڑھتا ہے وہ بھی ہلال خضیب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تیمور کی یہ مغربی حرکت نیپولین کی مشرقی حرکت کی تنشابہ تھی جب وہ ۱۸۱۲ء کی گرمیوں میں حلفاء کے نیم دائرے کے خلاف بڑھا تھا اور جس کا نتیجہ لیپ زگ کی جنگ تھی۔ جس میں شکست کے بعد وہ پیرس لوٹا اور جو اس کی پہلی مملکت کے خاتمے کا پیش خیمہ بنی۔

نیپولین کی طرح تیمور کو بھی آزمودہ کار فوج کی واحد قیادت کا فائدہ تھا، خصوصاً جب مخالف مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے مگر جن علاقوں میں سے انھیں فوجوں کو نکال کر لے جانا تھا وہ یکساں نہ تھے۔ یورپ کے میدانی آباد علاقوں کی جگہ تیمور کے سامنے پورے مغربی ایشیا کے دریا، پہاڑی سلسلے، دلدلیں اور صحرا تھے۔

جن راستوں پر وہ سفر کر سکتا تھا وہ نہایت کم تھے۔ اور یہ راستے تھے بھی ایسے کہ اگر ان میں سے ایک راستہ چن لیا جاتا تو پھر دوسرے راستے پر جانا ناممکن تھا۔

کاروانوں کی ان شاہراہوں پر متعدد قلعے اور شہر تھے اور ہر ایک کے دفاع کے لیے محافظ فوج موجود تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے موسموں کے خیال سے پیش قدمی کرنا تھی۔ فصلوں کے تیار ہونے کے موسم اور گھوڑوں کے لیے چراگاہوں کی ضرورت۔ بعض علاقے جاڑوں میں ناقابلِ عبور تھے اور دوسرے علاقے گرمیوں میں قریب قریب ناقابلِ سفر نپولین کو بھی انھیں میں سے ایک شہر ایکرہ سے واپس چلا جانا پڑا تھا۔ وہ شام کے گرم صحرا میں محاصرے کی تاب نہ لا سکا تھا۔

سرحدوں کے اس نیم دائرے کے بیرونی حصوں پر تیمور کے انتظار میں بارہ کے قریب مختلف فوجیں ہتھیار بند تھیں۔ اول تو جنگجو جیارجی قبائل کوہ قاف کے دشوار گزار راستوں کو روکنے کے لیے میدان میں اتر آئے تھے۔ ان کے بعد فرات کی بلندیوں پر ترکوں کی ایک فوج اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ حسب معمول قرا یوسف بھی اپنے ترکمانیوں کو لے کر اس کے پہلوؤں پر منڈلا رہا تھا۔ شام میں طاقتور مصری فوج موجود تھی اور جنوب میں بغداد تھا۔ اگر وہ بغداد کے خلاف پیش قدمی کرتا تو ترک اس پر عقب سے حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اگر وہ شمال میں ترکوں کی سرحد کے اندر ایشیائے کوچک میں داخل ہوتا تو مصری فوج اس پر عقب سے جھپٹ سکتی تھی۔

یہ وجہ تھی کہ وہ نہ تو ترکوں کے مضبوط مقامات پر یورپ میں حملہ آور ہو سکتا تھا اور نہ مصر کے مملوکوں ہی کی طرف پیش قدمی کر سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ ان دو طاقتور سلطانوں میں سے ایک کو حملہ کرنے پر مجبور کرتا۔ اس کے برعکس وہ جب چاہتے ایشیا میں داخل ہو سکتے تھے۔[1]

---

[1] اس علاقے کی مشکلات کا اندازہ پہلی جنگ عظیم سے ہو سکتا ہے جب مغربی اتحادی وہاں جنگ کر رہے تھے۔ شمال سے روسی ارض روم سے آگے نہ بڑھ سکے اور جنوب میں بغداد کے قریب برطانوی فوج کی ایک

سب سے زیادہ مشکل پانی کی فراہمی تھی۔ فوج اپنے ساتھ اونٹوں کی باربرداری حسب معمول لے آئی تھی۔ تیمور اس مرتبہ اپنے ساتھ ہاتھی بھی لے آیا تھا مگر اس فوج کی بنیاد رسالے پر تھی اور ہر شخص کے ساتھ ایک وافر گھوڑا تھا۔ پچاس ہزار سے سات لاکھ تک گھوڑوں کو کسی راہ پر لے جانے سے پہلے اس ملک کی تفصیلات سے واقفیت اشد ضروری تھی۔ کوچ کے دوران میں تیمور ہر روز جغرافیے کے ماہرین اور تاجروں سے معلومات حاصل کرتا رہتا۔ فوج سے آگے آگے اس کے سکاؤٹ جاتے اور ان سے آگے ناظر جو دشمن کے مقامات چراگاہ اور پانی کے متعلق معلومات مسلسل پیچھے بھیجتے رہتے۔ ناظروں سے آگے تیمور کے جاسوس تھے جو مختلف سرحدوں کو عبور کرتے جا رہے تھے۔

شروع میں تو تیمور آرام آرام سے بڑھا اور نہایت پرتکلف انداز میں۔ سرائے خانم دو اور شہزادیاں اور چند پوتے اس کے ساتھ تھے اور ریوں خراسان کی شاہراہ نے تیموری دربار کی شان و شوکت دیکھی۔

اس اثنا میں تیمور کے افسر تبریز کو مغربی مہم کے لیے مستقر بنانے میں مصروف تھے۔ کاراباغ کے میدان کو گھوڑوں کے رکھنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ تیمور خود خط و کتابت میں مصروف تھا۔ ایک خط اس نے تاتار خاں کو لکھا جو اس وقت روسی سطح مرتفع کا حاکم تھا۔

۴۔ سپاہ ہار ماننے پر مجبور ہو گئی۔ شام میں برطانوی افواج اور لارنس کو دمشق تک پہنچنے میں دو سال صرف ہوئے۔

ان مہمات میں حلفاء سمندر پر خالص تھے اور ان کے ہتھیار بھی ترکوں سے بہتر تھے۔ اور ترک ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک اس علاقے کا دفاع تنہا کر رہے تھے۔ تیمور کے عہد میں ترک نسبتاً زیادہ طاقتور تھے اور ان کے حلیفوں میں ملوک کوہ قاف، جیارجی اور ترکمان شامل تھے۔ سبھی جنگجو اور بہادر۔ شام کے عرب ان کے علاوہ تھے۔

جس کا نام عیدیکو بتایا جاتا ہے۔ تیمور کو نہایت منہ پھٹ سا جواب ملا۔

عیدیکو نے لکھا "امیر تیمور! تم نے دوستی کا ذکر کیا ہے۔ میں بیس سال تمھارے دربار میں رہ چکا ہوں۔ میں تمھیں اور تمھاری چالاکیوں کو خوب جانتا ہوں۔ اگر ہم دونوں کو دوست بن کر رہنا ہے تو وہ صرف ہاتھ میں تلوار لے کر رہنے سے ہو سکتا ہے۔" بایں ہمہ سطح مرتفع کے تاتاری اس مہم میں تیمور سے نہ اُلجھے اور آخر تک غیر جانبدارانہ رویّہ رکھا۔

اس نے بایزید یلدرم کو بھی خط لکھا۔ پُر تکلف سا خط۔ اور اس سے درخواست کی کہ کارا یوسف اور سلطان احمد کو امداد نہ دے۔ ان دونوں نے اپنے آپ کو ترکوں کی حفاظت میں دے رکھا تھا اور بایزید کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کر چکے تھے۔ بایزید سے ابھی تک تیمور کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ اسے ترکوں کی جنگی طاقت کا احساس تھا اور ممکن ہے وہ اس خطے سے نبرد آزما نہ ہونا چاہتا ہو، خصوصاً اس وقت تک جب تک ترک یورپ سے اُلجھے ہوئے تھے۔

بایزید کا جواب نہایت غیر دوستانہ تھا۔ اس کا مطلب کچھ اس طرح کا تھا:

"اے تیمور نامی کتّے! سمجھ لے کہ ترک اپنے دوستوں کو پناہ دینے سے انکار کرنے کے عادی نہیں اور نہ وہ دشمنوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے ہی سے گریز کرتے ہیں۔ وہ جھوٹ اور دھوکے کے عادی بھی نہیں۔"

تیمور نے بھی جواب دیا۔ اور عثمانی ترکوں کی ترکمانی خانہ بدوشی اصل نسل کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے مزید لکھا "میں تمھاری اصل سے واقف ہوں" اور کہا کہ بایزید کو ایسے ہاتھیوں کے خلاف بڑھنے سے پہلے دوبارہ غور کر لینا چاہیے جو شاید اسے کچل دیں۔ پھر کہا کہ ترکمان عام طور پر غور کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔

"اگر تم ہمارے مشورے پر عمل نہ کرو گے تو پچھتاؤ گے۔ اس لیے سوچ لو اور جو مناسب سمجھو اسی پر عمل کرو۔"

تین سال کی جنگ

بایزید نے اس کا جواب دیا اور اپنی فتوحات کی طولانی فہرست درج کی کہ وہ کس طرح یورپ کے جو کافروں کا گڑھ تھا ختم کر رہا تھا۔ اس نے اپنے شہید باپ کا ذکر بھی کیا اور اپنے آپ کو اسلام کا محافظ کہا "ہم نے مدت سے تمہارے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اب ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ دن قریب آگیا ہے۔ اگر تم ہماری جستجو میں نہ آؤ گے تو ہم خود سلطانیہ تک تمہارا تعاقب کریں گے۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ کون فاتح بنتا ہے اور کسے شکست ہوتی ہے۔"

اس وقت تو تاتاری فاتح نے کوئی جواب نہ دیا مگر بعد میں صرف مختصر سا خط لکھا کہ بایزید اگر کارا یوسف اور سلطان احمد کا ساتھ چھوڑ دے تو وہ جنگ کی زحمت سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔

یلدرم نے فوراً نہایت درشت جواب دیا۔ اتنا درشت کہ تیمور کے وقائع نگاروں نے ان الفاظ کو دہرانا مناسب نہ سمجھا۔ بایزید نے پہلے تو اپنا نام جلی سنہری حروف میں خط کے سرنامے پر لکھا اور اس کے نیچے کالے باریک حروف میں تیمور لنگ لکھا۔ اور باتوں کے علاوہ اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ تیمور کی چہیتی بیوی کی عصمت دری کریگا۔ ظاہر ہے کہ ایسے خط سے تیمور کے غصے کی انتہا نہ رہی ہوگی۔

جس دوران میں یہ معاندانہ خط و کتابت جاری تھی تیمور نے بہت سا کام کر لیا تھا۔

سب سے پہلے تو اس نے حرم کی بیگمات کو ان کے درباروں کے ساتھ خطرے سے باہر سلطانیہ روانہ کیا۔ اعظم الجیش کو تو کاراباغ میں تیاری کرنے کے لیے رہنے دیا مگر کچھ لشکر علیحدہ علیحدہ جیارجیوں کے خلاف اور کوہ قاف میں روانہ کیے۔ داہنے پہلو کو محفوظ کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ ان لشکروں نے گھنے جنگلوں میں سے درخت کاٹ کر راستے بنائے اور عیسائی فوجوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ تمام علاقہ لوٹ مارا اور آگ

کے سپرد کیا گیا تاکہ دوبارہ یہ تیمور کی مہم میں مخل نہ ہو سکیں۔ گرجے گرا دیے گئے اور انگور کے کھیت تباہ و برباد کیے گئے۔ اب اس کا رویہ پیشتر سے مختلف تھا۔ اب نہ تو شرائط پیش کی گئیں اور نہ کسی کو امان ہی دی گئی۔ میدان جنگ میں صف بستہ افواج کے خلاف تیمور کے دل میں رحم کی رمق بھی نہ ہوتی تھی۔

ان حالات میں پندرھویں صدی کا آغاز ہوا۔ جونہی برف پگھلنا شروع ہوئی۔ تیمور پھر کوچ میں تھا اور ارض روم کے راستے رُخ ایشیائے کوچک کا تھا۔ ۱۴۰۰ء کا موسم گرما شباب پر تھا کہ اس نے سیواس تک تمام شہر لے لیے تھے۔ سیواس ایشیائے کوچک کا کلیدی شہر تھا۔ ترکوں کی سرحدی فوج نے عجلت میں پس نشینی اختیار کی تاتاریوں نے شہر کی دیواروں کے نیچے سرنگیں بچھائیں اور اس کی بنیادیں کھوکھلی کر کے دیواروں پر چڑھ گئے۔ شہر کی مسلمان آبادی تو بخش دی گئی مگر چار ہزار آرمنی سوار فوج جنھوں نے تاتاریوں کے پہلوؤں پر مزاحمت کی تھی انھیں خندق میں زندہ دفن کر دیا گیا۔

اس کے بعد تیمور نے فصیل کی مرمت کا حکم دیا۔ ترکمانی دستے جو کہیں کہیں نمودار ہوتے تھے انھیں منتشر کیا اور تیز رفتاری سے مالتیا پر پیش قدمی کی۔ مالتیا کی حیثیت جنوبی دروازے کی تھی۔ تیمور اسی دن مالتیا میں داخل ہوا جس روز ترک حاکم اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلا۔

وہاں سے ایشیائے کوچک میں پیش قدمی جاری رکھنے کے بجائے تیمور نے جنوب کی طرف شام کا رُخ کیا۔ اس کے امیر اکٹھے ہو کر اس اقدام کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ انھوں نے عرض کی کہ ہندوستان کی مہم ختم ہوئے ابھی ایک سال ہوا ہے۔ اس دوران میں ان کے جوان دو ہزار میل چل کر دو مہمیں لڑ چکے ہیں۔ شام میں دشمن کی تعداد بے اندازہ ہے۔ اور شہر مدفوع۔ اُدھر تاتاری فوج کے جوانوں اور گھوڑوں کو آرام کی ضرورت ہے۔

"تعداد بے معنی ہوتی ہے" تیمور نے سخت لہجے میں کہا۔ اور اس کی قوتِ ارادی کی شہ پر فوج جنوب کی طرف روانہ ہوئی۔

عینتاب پر ہلہ بولا گیا اور جب حلب پہنچے تو مصری سلطان کی فوج ان کی منتظر تھی۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے رفتار کم کردی۔ ہر روز تھوڑا سا فاصلہ آگے بڑھ جاتے۔ اور ہر روز اپنے معسکر کے گرد خندقیں اور رکاوٹیں تیار کر لیتے۔ مملوکوں اور شامیوں نے اسے کمزوری کی دلیل سمجھا اور فصیل سے باہر نکل کر لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ تاتاری فوراً رکاوٹوں کے پیچھے سے نکلے اور حملہ کر دیا۔ ہاتھی درمیان میں تھے۔ تیرانداز اور ناررومی پھینکنے والے بھی ہاتھیوں کے ساتھ تھے۔

ابھی حملہ پورے زوروں پر بھی نہ پہنچا تھا کہ حلفاء بھاگ کھڑے ہوئے۔ تاتاری ان کی صفوں کو چیر کر حلب کی فصیلوں کو عبور کرتے شہر کے اندر داخل ہوئے اور بغیر رُکے دمشق کی طرف بڑھ گئے۔ اب سنہ ۱۴۰۰ء تھا اور جنوری کا مہینا۔

دمشق نے شرائط کے لیے حیل و حجت شروع کی۔ مقصد یہ تھا کہ دوسری فوج تیار کرنے کے لیے مہلت مل جائے۔ جب تیمور دمشق سے ہٹ کر آگے بڑھنے لگا تو حلیفوں کی نئی فوج نے اس پر عقب سے حملہ کر دیا۔ پہلے تو تھوڑی دیر افراتفری سی پیدا ہو گئی مگر تیمور نے لشکروں پر قابو پا کر انھیں حملے کا حکم دے دیا اور جلد ہی میدان اس کے ہاتھ میں تھا۔

اب وہ دوبارہ دمشق پر بڑھا۔ اس مرتبہ یہ عظیم الشان شہر لوٹ مار کا شکار بنایا گیا۔ آگ بھی جل اٹھی اور کئی روز تک پھیلتی رہی۔ مردوں کی لاشیں کھنڈروں کے نیچے ہی دب کر رہ گئیں۔

مصری فوج کے بقیۃ السیف فلسطین سے ہو کر مصر کو بھاگے۔ سلطانِ مصر کے حکم سے تیمور کو روکنے کی ایک اور کوشش کی گئی یعنی شین کے ایک نمائندے کو حشیش

کے زیر اثر خنجر دیکر تیمور کو قتل کرنے پر مامور کیا گیا مگر وہ پکڑا گیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔

جب دمشق جل رہا تھا تو تیمور کو ایک گنبد از حد پسند آیا۔ شعلوں کے پس منظر میں سفید گنبد، بہر کیف اس نے اس گنبد کا نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ یہ گنبد ایک ہزار پر تھا اور دو میدانوں سے نظر آتا تھا۔ یہ تاتاری طرز کے چپٹے گنبدوں سے مختلف تھا۔ آغاز میں وہ باہر کو اُبھرا ہوا تھا، پھر نہایت مناسبت سے اندر کو ہوتا ہوا نوکدار چوٹی کی شکل میں ختم ہوتا تھا۔ شکل و صورت میں وہ انار سے بالکل مشابہ تھا۔ خیال ہے کہ جتنی عمارتیں تیمور نے اب تک دیکھی تھیں یہ ان سے مختلف تھا۔ اور شاید اسی لیے تاتاری فاتح کو یہ پسند بھی آیا۔

یہ پھولا ہوا سا دمشق کا گنبد جو شاید آگ سے برباد بھی ہو گیا بعد میں تیموری ساختمانی کا نمونہ بنا۔ تیمور کے عہد ہی میں نہیں بلکہ تیموری نسل نے بھی اسے اپنایا۔ بعد کی صدی میں یہ خیال ہندوستان پہنچا - وہاں وہ تاج محل کا تاج بنا اور مغل بادشاہوں کے محلات کی زینت کا درجہ پایا۔ روس میں اس نے ہر گرجے کے اوپر اپنا مقام بنایا۔

بشپ جان کا سفرِ یورپ

دمشق پہنچکر تیمور اُلٹے چلکر روانہ ہوا۔ جس طرح اس نے ترکوں کی مملکت میں زیادہ دُور جانا مناسب نہ سمجھا تھا اب وہ شام کے صحرا سے واپس چلا آیا۔ ایک لشکر اس نے ارضِ مقدس کو بھیجا تاکہ اکرہ تک مصری فوج کا تعاقب کرے۔ وہی اکرہ جو بعد میں نپولین کے لیے سدِ راہ ثابت ہوا۔ چند اور لشکر سیدھے مشرقی رُخ روانہ کیے گئے تاکہ بغداد کا محاصرہ کریں۔

تیمور خود اسی راستے پر ہو لیا جس سے آیا تھا اور حلب تک گیا۔ یہ مئی ۱۴۰۲ء کا زمانہ تھا۔ اب اس نے رفتار کم کر دی۔ آخر تاتاریوں کی قوتِ برداشت کی بھی کوئی حد تھی۔ وہ فرات کے رُخ جاکر دریا کے کنارے اپنی فوجوں کے ساتھ شکار میں مشغول ہو گیا۔ وقائع نگار لکھتا ہے کہ غزال کے گوشت نے شراب کو ایک نیا ہی ذائقہ بخش دیا۔

یہاں پہنچکر اس نے اپنے مستقر کے ساتھ مواصلات کو مکمل کیا۔ جو امیر وہاں قائم مقام چھوڑ آیا تھا ان سے اطلاعات منگا بھیجیں۔ سمرقند سے حالات معلوم کیے۔ اور سیواس سے ہفتہ وار خبروں کے آنے کا انتظام کیا۔ سیواس کی خبروں کی طرف اس نے خاصی توجہ دی۔ سیواس کے راستے ہی یلدرم کو آنا تھا اور تیمور نے جلد از جلد وہاں سے دو سو میل سے بھی کم فاصلے پر اپنی طاقت کا بیشتر حصہ مجتمع کر لیا تھا۔

جو امیر بغداد گئے تھے ان کے ایک پیغام پر اسے جنوب کے راستے جانا پڑا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بغداد کے کماندار نے شہر کے دفاع کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سلطان احمد خود تو بھاگ گیا تھا اور جا کر بایزید سے مل گیا تھا۔ البتہ کماندار کو یہ حکم دے گیا تھا کہ اگر تیمور خود بغداد کے باہر آئے تو شہر اس کے حوالے کر دے۔ لیکن اگر تیمور خود نہ آئے تو پھر شہر مقابلہ کرے تاکہ دوسری طرف سے ترک آ کر تاتاریوں پر حملہ آور ہوں۔

فاتح کے جنوب جانے کی وجہ یہ تھی۔ وہ نہایت تیز رفتار سے کجاوے میں بیٹھ کر گیا۔ جونہی وہ بغداد کے باہر پہنچا سلطان احمد کے افسروں کو اس کی خبر کی گئی۔ ان میں سے ایک تیمور کو پہچانتا تھا۔ اسے تاتاری معسکر میں بھیجا گیا۔ فرآج جو شہر کا کماندار تھا، اس نے تیمور کی موجودگی کے باوجود سلطان کے احکام سے انحراف کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے ایک مرتبہ انکار کے بعد اب وہ دروازے کھولنے سے ڈرتا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دجلہ کی وادی کی گرمی جو تنور کی آگ سے کم نہ تھی اس فیصلے کی وجہ بنی ہو اور اسے یہ امید ہو کہ تاتاری اس گرمی کی تاب نہ لا کر محاصرہ اٹھا لیں گے۔ اسے کم از کم یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ چالیس سال کی مسلسل جنگوں میں ایک بار بھی تاتاریوں نے محاصرہ نہ اٹھایا تھا۔

بغدادیوں کو یہ بھی یقین تھا کہ پتھر کی مضبوط دیواریں تیمور کا مقابلہ کر سکیں گی۔ اُدھر اگر کسی بات سے تیمور کتراتا چاہتا تھا تو وہ بغداد کا دیر پا محاصرہ اور اس پر حملہ تھا۔ دو سال سے اس کی فوج بغیر آرام کیے میدان جنگ میں الجھی رہی تھی۔ اس کی طاقت کا بیشتر حصہ اس کے مستقر تبریز میں مجتمع تھا تاکہ ترکوں کا مقابلہ کر سکے اور اپنے منصوبے کے مطابق اس وقت اسے وہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے دور دراز سفر پہلی بار موسم کے خلاف ثابت ہوئے تھے۔ گرمی کا زمانہ تھا اور خوراک کے علاوہ گھوڑوں کے لیے چارہ بھی بمشکل ہاتھ آتا تھا۔

دوسری طرف بغداد دجلہ کی وادی کا کلیدی مقام تھا جہاں مصر سے آنے والی

فوجیں جمع ہو سکتی تھیں اور مشرق قریب میں اس کے دشمنوں کا آخری محفوظ قلعہ بھی یہی رہ گیا تھا۔ ایک لمحے میں اس کا منصوبہ بدل چکا تھا۔ اس نے قاصد بلایا اور شاہ رُخ کو پیغام بھیجا کہ دس آزمودہ کار لشکر اور محاصرے کے ہتھیار لے کر فوراً بغداد پہنچ جائے۔ ناظروں کی ایک بڑی تعداد ایشیائے کوچک میں متعین کی گئی تاکہ وہ ترکوں کی حرکات اور آمد کی اطلاع بروقت دے سکیں۔ شہزادہ پیر محمد کو سمرقند میں حکم ارسال کیا گیا کہ فوراً باقی ماندہ فوج لے کر مغرب روانہ ہو جائے[1]

جب شاہ رُخ پہنچا تو تیمور نے بغداد کی دیواروں کے سائے میں سب سے پہلے پوری فوج کا رسمی معاینہ کیا۔ علم بلند کیے اور نقارہ و طبل اور شہنائی بجا کر ایک لاکھ فوج نے تیمور کو سلامی دی۔ مگر اہل شہر پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور تیمور شہر کی تباہی کی تیاریوں میں منہمک ہو گیا۔

شہر سے کچھ نیچے کشتیوں کا پل تعمیر کیا گیا تاکہ محاصر افواج ایک کنارے سے دوسرے کنارے آسانی سے آجا سکیں اور فرار کی راہیں بند کر سکیں۔

شہر کے مضافات پر حملہ کیا۔ انھیں حاصل کر کے زمین کے ساتھ ہموار کیا۔ پھر بارہ میل کے محیط میں فوجوں کو پھیلا دیا۔ دور دراز جنگلوں سے درخت لائے گئے۔

---

[1] ۱۳۹۹ء کے موسم خزاں سے ۱۴۰۱ء کے موسم خزاں تک تیمور کی ہر حرکت کے پیش نظر بایزید کا حملہ تھا۔ اس وقت جب تیمور بغداد کے محاصرے کی تیاریاں کر رہا تھا بایزید نہایت آرام سے یورپ سے لوٹ کر ایشیا آرہا تھا۔ اگر ترکوں کا شہنشاہ اس موقع پر ذرا سی بھی تندہی سے کام لیتا اور موقع پر نمودار ہو جاتا تو یقینی ہے کہ اسے تاتاریوں کا مستقر تبریز غیر مدفوعہ حالت میں ملتا۔ تیمور کی ناظر جماعت تیمور کو اس کی آمد کی اطلاع ضرور دے دیتی مگر سمرقند سے آنے والی کمک اور جنوبی افواج کو مجتمع کرنے کے لیے تیمور کو چند ہفتوں کی مہلت کی ضرورت ہوتی۔

ان سے شہر کے باہر کی بلندیوں پر چوبی اہرام سے تیار کیے گئے جن پر منجنیق نصب کیے گئے "تاکہ وزنی پتھر شہر کے اندر پھینکے جا سکیں۔

اس اثناء میں مہندس شہر پناہ میں سرنگیں کھودنے لگے اور چند ہی دنوں میں فصیل کے بہت سے حصے زمین کے ساتھ مل گئے۔ مگر ان شگافوں کے پیچھے بغدادیوں نے نئی دیواریں چن رکھی تھیں جن میں پتھر اور چونے کا استعمال عام ہوا تھا اور جن کی حفاظت وہ نار رومی سے کر رہے تھے۔

تیمور کے لشکر سالاروں اور سپہ سالاروں نے درخواست کی کہ عام حملے کی اجازت دے دی جائے۔ گرمی ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ راوی کا بیان ہے، ہوا اس حد تک رک گئی تھی کہ اڑتے ہوئے پرندے زمین پر مردہ حالت میں گر رہے تھے۔ اس شدت کی گرمی میں کام کرنے سے زرہ پوش سپاہیوں کے بدن ابل کر آبلہ سا بن گئے تھے۔

مگر بوڑھا تاتاری فاتح حملے کے لیے نقارہ بجانے پر رضامند نہ تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا اور منجنیق اپنا کام کرتے رہے۔ دوپہر اور سہ پہر کے وقت سپاہی ذرا سی دیر کے لیے سستا لیتے۔

مگر جب تیمور نے آخری وار کیا اور نقارے پر چوٹ کا حکم دیا تو عین دوپہر کی جھلسا دینے والی دھوپ کا وقت تھا۔ اس وقت مدافعین نے صرف چند ناظر فصیل پر چھوڑ رکھے تھے اور باقیماندہ آرام کر رہے تھے۔ چیدہ چیدہ تاتاری رجمنٹیں کمندیں اور سیڑھیاں لے کر آگے بڑھیں اور آن کی آن میں فصیل ان کے ہاتھ میں تھی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ نورالدین جس نے تیمور کی جان توکتمیش کے خلاف بچائی تھی وہ سب سے پہلے فصیل پر تھا اور اوپر پہنچ کر اس نے تیموری علم نصب کیا۔ سنہری ہلال اور گھوڑے کی دم کے بال۔

پھر تمام طبل اور نقارے بجائے گئے اور اس طرف جتنے لشکر تھے انھیں حملے میں

ڈال دیا گیا۔ نورالدین نیچے گلیوں میں اُتر گیا اور اس کے پیچھے پیچھے زرہ پوش تاتاری گود گود کر اترے۔ سہ پہر تک تاتاری شہر کے ایک حصّے پر قابض ہو چکے تھے اور بغدادیوں کو باقی ماندہ شہر کی طرف دھکیلا جا رہا تھا جو دریا کی سمت تھا۔ دریا کے پار کا شہراب کھلا پڑا تھا۔ خون کی ندیاں جس سرعت و شدت سے بہائی گئیں ان پر پھر خاموشی لگانا ہی بہتر ہوگا۔ تاتاری سپاہی جو تکالیف اور اتلاف کی وجہ سے غصّے سے بھرے ہوئے تھے اس روز بربادی اور خون ریزی میں خاص لطف حاصل کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

تاتاری وقائع نگار لکھتا ہے کہ بغداد کا نام اس دن دارالسلام کے بجائے دارِ جہنم ہونا زیبا تھا۔ فرج ایک کشتی میں بیٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا مگر کناروں سے اسے تیروں کا نشانہ بنایا گیا اور اس کی لاش کھینچ کر باہر نکالی گئی۔ ایک سو بیس کلہ مینار بنائے گئے اور قیاس ہے کہ کم از کم نوّے ہزار جانیں تلف ہوئیں۔

تیمور نے حکم دیا کہ پوری فصیل کو برباد کیا جائے اور سوائے مسجدوں اور گرجاؤں کے کوئی مکان نہ رہنے دیا جائے۔

اس دن بغداد تاریخ کے صفحات سے مٹ گیا۔ اس کے کھنڈروں کو پھر آباد ضرور کیا گیا۔ البتہ اس دن کے بعد بغداد تاریخ عالم میں اپنی پرانی اہمیت حاصل نہ کر سکا۔ بغداد کی تباہی کی اطلاع کے خطوط تیمور کی مملکت کے ہر شہر کو ارسال کیے گئے اور بایزید یلدرم کو بھی مناسب الفاظ میں مطلع کیا گیا۔

سلطان احمد حاکم بغداد جو غیر حاضر تھا اس طوفان کے گزر جانے کے بعد پھر لوٹ آیا۔ تیمور نے دو تین رسالے روانہ کیے کہ اسے پکڑ لائیں مگر وہ صرف قمیص پہنے پھر بھاگ گیا اور اس کے بعد آرام کی زندگی گزارنے کے خیال سے بایزید کے دربار کا رُخ کیا۔ محاصرے کے ہتھیاروں اور فوج کے بیشتر حصّے کو اپنی رفتار سے آنے کا حکم دے کے

تیمور چند سپہ سالاروں اور شاہ رُخ کو سے کر تیزی سے تبریز روانہ ہُوا۔ بغداد جون کے مہینے میں تباہ ہُوا۔ جولائی ۱۴۰۱ء میں تیمور پھر اپنے مستقر تبریز میں تھا۔ اس کا پوتا شہزادہ پیر محمد جونہی نیشاپور پہنچا اس نے اطلاع بھیجی۔ اِدھر شاہ رُخ باقی ماندہ فوج لیے مستقر سے کچھ دُور نہ تھا اور یوں اس مہم کا خاتمہ ہُوا۔

تیمور اپنے دشمنوں کی سرحدوں سے بنی ہوئی قوس قزح کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جا چکا تھا۔ چودہ مہینوں میں اس نے دو بڑی لڑائیاں لڑی اور جیتی تھیں۔ ان کے علاوہ چھوٹی لڑائیاں لاتعداد تھیں اور متعدد مدفوعہ شہروں کو ڈھا دے سے سر کیا تھا۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ کارنامہ قابلِ داد تھا خصوصاً جب یہ خیال کیا جائے کہ طوفانی بلیدرم کے تمام حلیف یکے بعد دیگرے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو چکے تھے اور وہ خود ابھی منظر پر نہ آیا تھا۔

موسم کے لحاظ سے اب ترکوں کے خلاف پیش قدمی قرینِ مصلحت نہ تھی اور یوں بھی تاتاری یومِ مکافات کو اگلے سال پر ملتوی کرنے پہ رضامند تھے۔ اس سال کے کارنامے کچھ کم قابلِ ستائش نہ تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد پیر محمد کے نقاروں کی آواز مستقر میں پہنچی اور تیمور کے آزمودہ کار سپاہی حیرت و استعجاب سے پُر اس نئی کمک کو دیکھنے اور اس کا استقبال کرنے معسکر کے باہر پہنچے۔

سمرقند سے آتے ہوئے لشکر ایک نئی آب و تاب اور چمک دمک کے حامل تھے۔ ہر لشکر کے عَلَم کا رنگ مختلف تھا۔ سبز، سرخ، نیلا اور دوسرے رنگ۔ ہر لشکر کے سوار مختلف رنگوں کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کی کمانیں، ڈھالیں اور دوسرے ہتھیاروں پہ بھی ان کے لشکر کا مخصوص رنگ چڑھا ہُوا تھا۔ تیمور کے وہ آزمودہ کار سپاہی جو ہندوستان سے لوٹ کر سیدھے بحیرۂ خزر، پھر فلسطین و بغداد کی مہم سر کر کے آئے تھے۔ شان و شوکت کی اس نمود کا مذاق اڑانے لگے مگر دل ہی دل میں شاید

وہ ایک حد تک حسد بھی محسوس کر رہے تھے۔

تیمور نے وہاں ایک نہر کی کھدائی شروع کرائی۔ یہ نہر زمانہ قدیم میں یونانیوں نے دریائے ارکیس سے نکالی تھی مگر اب صدیوں کی بے توجہی سے مٹ چکی تھی۔ اس نے افریقہ اور یورپ کی تجارتی شاہراہوں کا مطالعہ بھی کیا۔ جان نامی سلطانیہ کے بشپ کے ہاتھ ایک مراسلہ فرانس کے بادشاہ چارلس ششم کی طرف بھیجا اور دوستی کا اظہار کیا۔[1]

تیمور کے پاس دور دراز جنیوا کے ایلچی بھی آئے تاکہ وینس والوں کے مقابلے میں بہ عظیم المرتبت تاتاری کی عنایات کے حقدار سمجھے جائیں۔ وہ تیمور کے پاس قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کی خفیہ درخواست بھی لائے جو اس وقت بایزید کے رحم و کرم پر تھا۔

---

[1] عام طور پر مشہور ہے کہ تیمور نے چارلس ششم سے دنیا کو بانٹنے کا عہد کیا تھا۔ مگر تیمور کے دونوں خطوں میں ایسا کوئی اشارہ نہیں۔ تاہم ضرور تھا کہ بشپ جان نے تیمور کو یقین دلایا، جس طرح ایشیا میں وہ سب سے طاقتور بادشاہ ہے اسی طرح یورپ میں چارلس کا کوئی ثانی نہیں۔ تیمور نے لکھا کہ وہ بایزید کے خلاف پیش قدمی کرنے والا تھا اور چونکہ وہ چارلس کا دشمن تھا اس لیے امید ظاہر کی کہ چارلس اور تیمور کی مملکت کے درمیان تجارت کی راہیں کھل جائیں گی اور تاجروں کی آمد و رفت شروع ہو جائیگی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کے خیالات سے بشپ جان بادشاہ فرانس کو مطلع کریگا۔ سوائے مذہبی معاملات کے۔

آخری صلیبی جنگ

آئندہ واقعات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یورپ کے حالات کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ دو پشتوں سے قسطنطنیہ کے یونانی شہنشاہ اپنا اقتدار کھو چکے تھے اور ان کی طاقت اب ترکوں کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ یونانی شہنشاہ اب قدیم رومی شہنشاہوں کا مدھم سا سایہ بھی نہ رہے تھے۔

ترک اب ایشیائے کوچک سے نمودار ہو کر بلقان کے ممالک اور بحیرۂ اسود کے گرد پھیل رہے تھے۔

کسووا کے مقام پر عثمانی ترک سرویا کو شکست دے کر ہنگری میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کی جنگی خصوصیات نہایت بلند تھیں۔ جنگجو، منضبط اور وفادار ان کا رسالہ خصوصاً "سپاہی" نہایت اعلیٰ تھا۔ علاوہ ازیں ان کی پیادہ فوج جسے جنیسری کے گرد تنظیم دی جاتی تھی اس عہد میں لاثانی تھی۔

انھوں نے مشرقی بحیرۂ ابیض کے ساحلی ممالک میں شادیاں کر لی تھیں اور یونانی اور عیسائی بیویوں اور کنیزوں کے بطن سے ایک نئی قوم وجود میں آ رہی تھی۔ بایزید اپنی قوم کے حسن و قبح کا مرقع تھا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس کا پہلا کام بھائیوں کا گلا گھونٹنا تھا۔ اسے اپنی فتوحات پر ناز تھا اور فخر سے کہا کرتا تھا کہ آسٹریا کو شکست دینے کے بعد وہ فرانس پر پیش قدمی کرے گا اور اپنے گھوڑے کو سینٹ پیٹر کے گرجے کے منبر پہ رکھ کر دانہ کھلائے گا۔

آخری صلیبی جنگ

سوا نام کے وہ قسطنطنیہ کا حکمران تھا۔ اس کی سرحد اس شہر کی فصیل تک تھی۔ شہر کی بہت سی کچہریوں میں اس کے نامزد قاضی مقرر تھے اور کم از کم دو میناروں سے اذان کی صدا ہر روز پانچ وقت بلند ہوا کرتی تھی۔ قسطنطنیہ کا موجودہ شہنشاہ مینوئل اس کا باجگزار تھا۔ وینس اور جینوا کے تعلقات بایزید سے ایسے تھے گویا وہ قسطنطنیہ کا حکمران بننے والا ہے۔ ترک قسطنطنیہ کے باغوں بھرے مرمریں شہر کو اپنی امیدوں کا شہر سمجھتے تھے۔ استنبول۔

اسلام جب مکہ سے نکل کر پھیلا تو وہ اس شہر کے باہر سے ہو کر آگے نکل گیا۔ قسطنطنیہ کی محکم و بلند فصیل اب تک اسے بچائے ہوئے تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے یورپی اقوام کے جنگی جہاز بھی موجود تھے۔ اس کے باوجود بایزید اسے لینے پر تلا ہوا تھا۔ دراصل وہ محاصرے کی تیاریاں بھی مکمل کر چکا تھا۔ عین اسی وقت یورپ میں صلیبی جنگ کی صدا بلند ہوئی۔ یہ صلیبی جنگ، ترکوں کے خلاف ہونی تھی۔ اس صدا کا داعی ہنگری کا بادشاہ سگسمانڈ تھا جو ہر وقت یلدرم کی پیش قدمی سے سہما رہتا تھا اور اپنی مخصوص وجوہ کی بنا پر برگنڈی کے فلپ نے اس صدا کی تائید کی تھی۔

کچھ عرصے سے یورپی ممالک میں سکون رہ چکا تھا۔ اس عہد کے جھگڑے مثلاً فرقہ وار اختلافات، صد سالہ جنگ، حقِ وراثت کے لیے عوام کی جد وجہد اور کالی وبا کی تباہیاں، یہ سب ہنگامے خاموش ہو چکے تھے۔ جب جاگیرداروں نے یہ صدا سنی تو گرجے کے ہمنوا بننے میں انھوں نے دیر نہ کی۔

فرانس کا بادشاہ جو اکثر پاگل سا رہتا تھا اس معاملے میں ہنگری کے بادشاہ کو ہر ممکن مدد دینے پر تیار تھا۔ انگلستان اور نیدرلینڈ کے ملکوں سے بھی امداد پہنچی۔ اس صلیبی جنگ کی فہرست میں پورے یورپ کے خاندان شامل تھے یہ جوانے

کا شہزادہ، پرشین نائٹوں کا سردار، ہوہنزولورن کا فریڈرک، روڈز کا گرانڈ ماسٹر اور سینٹ جان کے نائٹ، سبھی شامل تھے۔ سب سے زیادہ فوج فرانس سے آئی تھی۔ ان میں بار اینڈ آرٹوئی۔ برگنڈی اور سینٹ پول کے خاندانوں کے نمائندے، فرانس کا سپہ بُد اور کنسٹبل شامل تھے۔ یہ سب نیورز کے کاؤنٹ جان دیلیلے[1] کی قیادت میں تھے۔

دو ہزار سردار اور ان کے سپاہی مغرب کی جانب سوار ہوکر روانہ ہوئے اور سگسمانڈ کی فوجوں سے الحاق کیا جو بجائے خود ایک لاکھ کے قریب تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معسکروں میں شراب اور عورتیں کافی مقدار و تعداد میں حاصل ہوسکتی تھیں۔ ان شہسواروں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ فخر سے کہا کرتے: اگر آسمان گر پڑا تو وہ اسے اپنے نیزوں پہ سنبھال لیں گے۔

فرانسیسی۔ انگلستانی اور المانی شہسوار سردار اس جنگ کی نوعیت سے چنداں واقف نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ترک سلطان جس کے نام سے وہ ناواقف تھے پورے اہلِ اسلام کو اپنے علم کے نیچے اکٹھا کر رہا تھا اور مصر عراق اور ایران ان کے خلاف رزم آرا ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ترک بادشاہ قسطنطنیہ سے اس طرف کہیں پہاڑوں میں چھپا بیٹھا تھا اس لیے انھیں سب سے بڑا غم یہ تھا کہ کہیں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ فرار نہ ہوجائے۔ وہ یہ بھی ٹھانے ہوئے تھے کہ جب وہ بھاگ جائے گا تو یہ سب ارضِ مقدس کی طرف بڑھ جائیں گے اور یوں ثوابِ دارین حاصل کریں گے۔

---

[1] یہ برگنڈی کے فلیپ کا بیٹا اور شاہ فرانس کا پوتا تھا۔ مہم کی قیادت اسے اپنے خاندانی وقار ہی کی وجہ سے ملی تھی ورنہ وہ ناتجربہ کار نوجوان تھا اور رہنمائی و قیادت کی خصوصیات سے بالکل عاری تھا۔

ہنگری کے سگسمانڈ نے ان سب کو یقین دلایا کہ "جنگ کے بغیر واپسی کا کوئی خدشہ نہیں" اور حقیقتاً جنگ کے بغیر کوئی راہ فرار بھی نہیں۔

ڈینیوب کے کنارے وہ نہایت آرام سے رواں تھے۔ دریا کے دہانے سے وینس والوں کے جو جہاز اوپر آئے تھے وہ بھی اس کار ثواب میں شامل ہو گئے۔ حالات نہایت پُر اطمینان تھے۔ ترکی قلعے جو سرحدوں پر واقع تھے انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور صلیبی شہسواروں نے شہری باشندوں کی خاصی تعداد کو تہ تیغ کیا۔ انھیں یہ پروا بھی نہ تھی کہ یہ سرویا کے باشندے تھے اور مذہباً عیسائی، انھوں نے نہایت پُر فضا میدان میں معسکر قائم کیے اور نکوپولس کے محاصرے کی تیاریاں شروع کیں۔ یہیں انھیں اطلاع ملی کہ بایزید بہت بڑی فوج لے کر ان کی جانب تیز رفتاری سے پیش قدمی کر رہا ہے۔

پہلے تو انھوں نے یہ باور ہی نہ کیا۔ مگر سگسمانڈ نے انھیں یقین دلایا کہ یہ خبر سچی ہے فوجیں صف بستہ کی گئیں۔ سگسمانڈ ترکوں کی طاقت سے واقف تھا۔ اس نے ان شہسوار سرداروں کو مشورہ دیا کہ اس کی اپنی پیادہ فوج جس میں ہنگری اور ولاچیا کے باشندے اور کروٹ شامل تھے مسلمانوں کے حملے کو روکنے کے لیے آگے رکھی جائے اور سوارہ کو پیچھے رکھا جائے۔

اس پر یہ سردار بگڑ بیٹھے اور جھگڑا طول پکڑ گیا۔ ادھر بایزید کے ہلکے دستے نمودار ہوئے۔ فرانسیسی اور المانی سرداروں کا خیال تھا کہ سگسمانڈ انھیں دھوکا دے کر بیکار رکھنا چاہتا تھا اور فتح کی تمام شان و شوکت خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آخر فرانس کا ہائی کانسٹبل فلپ آف آرٹوئے پکار اٹھا:

"ہنگری کا بادشاہ چاہتا ہے کہ آج کی عزت اسی کو نصیب ہو۔ اور کوئی اگر مانتا ہے تو مان جائے میں تو ہرگز نہ مانوں گا۔ ہمیں مقدمۃ الجیش ہیں اور پہلی مڈبھیڑ ہمارا ہی حق ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا علم بلند کرنے کا حکم دیا اور چلا کر کہا،

"آگے بڑھو۔ اللہ کا نام اور سینٹ جیارج کا نام لے کر"

تمام سردار اس کے ساتھ ہو لیے۔ ان کے زرہ پوش دستے ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ جانے سے پہلے انھوں نے تمام ترک اور سروی جنگی قیدیوں کو تہ تیغ کیا اور یوں فارغ البال ہو کر آگے بڑھے۔ یورپ کے اخلاق کے نمائندے شہسوار سردار، اصطلاح عام میں نائٹ، گھوڑے سرپٹ دوڑائے، نیزوں کی انیوں سے پھریرے اڑاتے اور گھوڑوں کے بھاری سموں سے میدان میں گونج پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ شہزادے، نائٹ اور زرہ پوش سپاہی، انھوں نے بایزید کے ہلکے بیرونی دستوں کو بآسانی منتشر کر دیا۔ سامنے ایک بلندی تھی اس کے اوپر چڑھ گئے اور وہاں جتنے پیدل تیرانداز نظر آئے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد سپاہیوں کی پلٹنیں تھیں۔ یورپی شہسواروں نے ان پر بڑھنے سے پہلے اپنی صفیں درست کیں۔

وہ سپاہیوں میں سے بھی نکل گئے پھر ترکی ہلکے سوارہ کو منتشر کیا اور آگے بڑھ گئے۔ یہ نہایت دلیرانہ حملہ تھا مگر اس حملے نے انھیں شکست دلوائی۔

اب تک کی یہ تین صفیں بایزید کے مقدمۃ الجیش کے سوا کچھ بھی نہ تھیں۔ جب یہ شہسوار تھکے ہارے دوسری پہاڑی پر پہنچے تو جا کر انھیں بایزید کا معظم الجیش نظر آیا۔ ساٹھ ہزار کی جمعیت، درمیان میں جینسری اپنے سفید عمامے باندھے کھڑے تھے اور ان کے دونوں طرف نیم دائرے میں بایزید کا سوارہ تھا۔ جوابی حملے کے بے وجہ اتلاف کے بجائے ترکوں نے یورپ کے سواروں کو تیروں کا نشانہ بنایا، انھیں گھوڑوں سے اترنا پڑا۔ بوجھل زرہ میں اب لڑائی جاری رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ بہتوں نے رکنے کی کوشش کی مگر بے سود تھا۔ وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اُدھر ترک فوج نیم دائرے کو بند کر رہی تھی اور ان کے ساتھی دُور تھے۔ اکثر شہسواروں نے ہتھیار ڈال دیے۔

آخری صلیبی جنگ

اِس دوران میں سگسمانڈ نے اپنی فوج کو بچائے رکھا تھا۔ وہ ان کے پیچھے تھوڑی دُور آیا تھا مگر انھیں مدد دینے کے قابل نہ تھا۔ گو یورپ میں اس پر برسوں بحث ہوتی رہی لیکن یہ اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جان بوجھ کر ان سے پیچھے رہ گیا تھا یا ان شہسواروں کی تیز رفتار کا ساتھ دینا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

یہ صحیح ہے کہ شہسواروں کے اس فرار نے جنگ کا سنبھالنا مشکل کر دیا تھا جونہی سوار ہ بھاگتا ہوا نظر آیا اور ان کے تعاقب میں ترک سوار نظر آئے پیادہ فوج نے دل توڑ دیا۔ پہلوؤں پر ولاچیا والے بھی علٰحدہ ہو گئے۔ سگسمانڈ کے ہنگیرین اور الیکٹر کے لوگ اچھی طرح لڑے مگر سگسمانڈ خود اپنے سرداروں کے ساتھ دریا کی طرف بھاگ کھڑا ہوا اور وہاں جا کر وینس والوں کے جہازوں میں پناہ لی۔

جہاں تک بایزید کا تعلق تھا وہ ان قیدی شہسواروں کو بخشنے والا نہ تھا۔ انھوں نے اس کے ترک قیدیوں کو جنگ سے پہلے بے دردی سے قتل کیا تھا اور جنگ میں بھی خاصے آملاف کے ذمہ دار تھے۔ ان کا وقائع نگار فرائے سارٹ لکھتا ہے:

"پھر وہ سب اس کے سامنے صرف قمیصوں میں لائے گئے۔ اس نے انھیں تھوڑی دیر تک دیکھا، پھر دوسری طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ وہ سب قتل کر دیے جائیں۔ وہ جلادوں کے سامنے لائے گئے جو ننگی تلواریں لیے کھڑے تھے اور نہایت بے رحمی سے قتل کر دیے گئے۔"

اس طرح دس ہزار کا خاتمہ کیا گیا۔ سرداروں نے بایزید کو چوبیس شہزادوں کو بطور یرغمال رکھنے پر رضامند کر لیا۔ ان میں نیورز کا کاؤنٹ اور فرانس کا بوسیکیکاٹ بھی شامل تھے۔ ترکوں نے فرانس کے بادشاہ کے پوتے اور اس کے ساتھیوں کی رہائی کے لیے دو لاکھ اشرفیاں مانگیں۔ گو ترکوں کی نگاہ میں یہ معمولی رقم تھی مگر یورپ کے خزانے اس سے خالی ہو گئے۔ جب یہ رقم ادا کی گئی تو قیدی رہا کر دیے گئے۔ فرائے سارٹ

لکھتا ہے کہ رہائی سے پہلے اس نے ان سب کو مخاطب کیا اور انھیں کہا کہ وہ نئی فوجیں جمع کر کے دوبارہ اس کے مقابلے پر آئیں:

"اس لیے کہ میں جنگ کو تیار ہوں اور عیسائی مملکت میں پیش قدمی کرنے کا خیال کر رہا ہوں" یہ فاخرانہ الفاظ نیورز کا کاؤنٹ خوب سمجھتا تھا۔ اس کے ساتھیوں کا بھی یہی حال تھا۔ اور وہ ان الفاظ کو عمر بھر نہ بھولے۔

صرف بہادر بوڑے کیکاٹ۔ جو اب فرانس کا مارشل بن چکا تھا ترکوں کے ساتھ تلوار آزمانے کے لیے دوبارہ سامنے آیا۔ یوں آخری صلیبی جنگ نے شکست کا انجام دیکھا۔ یورپ کے درباروں کے ماتم اور رنج والم کا مقابلہ صرف قسطنطنیہ کے شاہی حلقوں کی حسرت و یاس کر سکتی تھی جو امداد غیبی کو اس قدر قریب دیکھ کر کسی حد تک پُر امید ہو چکے تھے۔ اب انھیں کوئی چارہ نظر نہ آرہا تھا۔

خیال رہے کہ نکوپولس کی لڑائی ۱۳۹۶ء میں ہوئی تھی اور اب بایزید اپنی فوجیں قسطنطنیہ کے خلاف لے آیا تھا، ساتھ ہی یونان کے رہے سہے حصوں سے اپنی مملکت میں اضافہ کر رہا تھا۔ بوڑھے کیکاٹ کے پانچ سو نائٹ اور چند جہازوں کے پہنچنے سے قسطنطنیہ کے عیسائیوں کے حوصلے کچھ دیر کے لیے بڑھ گئے۔

قابل غور ہے کہ ترکوں کی مملکت یعنی ایشیا اور یورپ کے مقبوضات سمندر کی وجہ سے بٹے ہوئے تھے۔ اس موقع پر اگر وینس اور جینوا کے بحری بیڑے چاہتے تو رودبار پر قبضہ کر کے ترکوں کو زک پہنچا سکتے تھے اور شاید اس طرح قسطنطنیہ کو بچا لیتے۔ مگر انھوں نے اس طرف توجہ نہ دی۔

وینس اور جینوا ایشیا کی تجارت کے لیے ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی کوشش میں تھے۔ بایزید بھی سیاست دان تھا۔ وہ دونوں سے راہ و رسم رکھتا تھا اور دونوں کو ایشیا کی تجارت کا لالچ دیتا رہتا تھا۔ یہ دونوں طاقتیں سلطان کو بہترین سے بہترین

تحائف پیش کرتیں۔ پوپ کی طرف سے قسطنطنیہ کو بچانے کی ایک تازہ درخواست بھی بے توجہی کا شکار ہو گئی۔ یورپ کے باقیماندہ حکمران دوبارہ خانہ جنگی میں مصروف ہو گئے تھے۔

اب ہمارے سامنے تاریخ کا عجیب ترین منظر ہے۔ سینز بادشاہوں کا پایۂ تخت جو ایک زمانے میں دنیا کا حسین ترین اور طاقتور ترین مرکز تھا اور جس کی حفاظت کے لیے سینکڑوں یونانی سردار جان کی بازی لگانے کے لیے تیار رہتے تھے، اب اپنی بلند اور عظیم الشان عمارتوں کے باوجود اتنا بے بس اور ناتوان و نادار تھا کہ وہ اپنے محسنوں کی مہمان نوازی کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ بوسئے کیکاٹ کے ساتھیوں کو اپنی خوراک کے لیے ترک جہازوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا اور ان کی خدمات کا انھیں کوئی صلہ نہ دیا جا سکتا تھا۔ یہاں کا شہنشاہ یورپ روانہ ہوا تاکہ وہاں کے درباروں سے سپاہی اور روپیہ مانگ کر لائے۔ اس کے درباری جو اس کے ہمراہ تھے، اتنے برے لباس میں ملبوس تھے کہ ایک اطالوی شہزادے نے ترس کھا کر انھیں ان کے رتبے کے مطابق کپڑے بنوا دیے۔

بیزنطینوں کا یہ عالی مقام خلف یکے بعد دیگرے مختلف درباروں میں حاضر ہوا۔ ہر جگہ وہ پوری شاہی رسوم سے قبول کیا جاتا اور اس کی دلجوئی کی جاتی مگر اسے امداد کوئی نہ دی گئی۔ صلیبی روح شہسواروں کے اس آخری حملے کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ اور یورپ کے بادشاہ تجارت اور سیاسی الجھنوں کی طرف زیادہ مائل تھے۔ گرجے کے وارث کہیں کہیں اپنے اعلان شائع کر دیتے اور اکا دکا بادشاہ بھی بنفس نفیس مدد کی سفارش کرتا مگر بے سود۔

جب مینوئل یورپ کے درباروں میں بددل ہوا جا رہا تھا، قسطنطنیہ کے باشندے شہر کی فصیل سے نیچے اتر کر ترکوں سے خوراک مانگ رہے تھے اور بوسئے کیکاٹ

دل برداشتہ ہوکر شہر چھوڑ چکا تھا اس وقت شہنشاہ کا بھتیجا قسطنطنیہ میں شہر کو بایزید کے حوالے کرنے کی شرائط مرتب کر رہا تھا۔ مگر اچانک دوسری مرتبہ اس محصور شہر کو غیب سے تھوڑے عرصے کے لیے نجات حاصل ہوگئی۔

غیر متوقع طور پر مشرق سے تاتاری نمودار ہوئے اور سیواس کو فتح کرنے کے بعد آگے بڑھ گئے۔ بایزید نے محاصرہ اٹھالیا اور ایشیا کا رُخ کیا۔

یورپ میں جتنی ترک فوجیں موجود تھیں انھیں بلاکر سمندر کے پار کیا گیا۔ قسطنطنیہ کے حکمران نے بایزید سے عہد کیا کہ اگر وہ تیمور کو شکست دینے میں کامیاب رہا تو شہر اس کے حوالے کر دیا جائیگا۔

تیمور اور یلدرم کا مقابلہ

سنہ ۱۴۰۲ء کے موسم گرما کے شروع میں مشرقی یورپ کے فاتح نے اپنی پوری طاقت مجتمع کی تاکہ ایشیا کے فاتح کا مقابلہ کرے۔ بحیرۂ مرمر کے قریب عثمانی ترکوں کے پایۂ تخت بروسا میں کاسوو اور نکوپولس کی آزمودہ کار رجمنٹوں کو جنگ کے لیے تیار کیا گیا۔ وہیں اناطولیہ کی فوج کا ان سے الحاق ہوا۔ ساتھ ہی سرویا کے بادشاہ پیٹر لزارس کے بیس ہزار آدمی بھی تھے۔ راوی ان کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ فولاد میں اس طرح چھپے ہوئے تھے کہ صرف ان کی آنکھیں نظر آتی تھیں یہیں یونانی اور ولاچیائی اپنے نئے حاکموں کی ملازمت میں حاضر ہوئے۔ اس فوج کی پوری تعداد ایک لاکھ بیس ہزار اور اڑھائی لاکھ کے درمیان ہوگی۔

یہ فوج عمر بھر کی فتوحات کی عادی تھی۔ سپاہی اور جنیسری، ہمیشہ ہتھیار بند رہتے تھے۔ اس کا انضباط نہایت سخت تھا اور انھیں بایزید کی ذات سے غلامانہ قسم کی وفاداری تھی۔ بایزید کو فتح کا یقین تھا اور تیمور کے انتظار کے دن اس نے جشن میں گزارے۔

تیمور پیش قدمی کر رہا تھا اور ترک اس بات سے خوش تھے۔ ان کی طاقت کا انحصار پیادہ فوج پر تھا اور ترک پیادہ فوج کے جوہر دفاع میں خاص طور پر ظاہر ہو سکتے تھے۔ ایشیائے کوچک کا زیادہ حصہ غیر ہموار اور جنگل کے نیچے تھا جو پیادہ فوج کے لیے خاص طور پر موزون ہوتا ہے۔ سیواس سے مغرب کی طرف صرف ایک شاہراہ

جاتی تھی اور وہ تیمور کو اسی شاہراہ پر ملنے کے امیدوار تھے۔

بایزید نے نہایت اہتمام سے اپنی فوج کو مشرق کی جانب حرکت دی اور انقرہ پر بڑھا۔ یہاں اس نے اپنا مستقر قائم کیا اور خود آگے بڑھ گیا۔ اس نے دریائے ہیلس کو عبور کیا اور دوسری طرف پہاڑی علاقے میں داخل ہوا۔ اس کی بیرونی چوکیوں نے اطلاع دی کہ تیمور سیواس میں ہے جو اس سے ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔

بایزید نے پیش قدمی روک لی۔ اپنی رجمنٹوں کو مناسب مقامات پر متعین کیا اور تیمور کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار بڑھتا گیا۔ تین دن، پانچ دن، پورا ایک ہفتہ۔ اس کے سکاوٹ سیواس سے آئے ہوئے لوگوں کو پکڑ کر لے آئے اور انھوں نے تشویشناک خبر سنائی۔ سیواس میں اب معمولی دفاعی دستے تھے اور تیمور اپنی فوج کے ساتھ کئی دنوں سے ترکوں کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

مگر تیمور سیواس اور ترک فوج کے درمیانی علاقے میں نہ تھا۔ سکاوٹ گھوڑے دوڑا کر پورے علاقے میں پھرے مگر ان تمام پہاڑیوں میں تاتاریوں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھیوں کے ساتھ کہیں غائب ہو گئے تھے۔

ترک کمانڈر کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ اب جنگی ترتیب میں دریائے ہیلس کے ٹوٹے پھوٹے پہاڑی علاقے میں معسکر ڈالے پڑا تھا۔ یہ دریا سیواس کی اس طرف شروع ہو کر جنوب کو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ انقرہ کے سامنے آتا ہے اور آخر بحیرۂ اسود میں جا کر گرتا ہے۔ بایزید جہاں تھا اس نے وہیں انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے جب تک تاتاریوں کی محکم خبر نہ ملتی تھی وہ کسی طرف حرکت کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

آٹھویں دن کی صبح کو تاتاریوں کی طرف سے خبر پہنچی: سکاوٹوں کی ایک

تیمور اور یلدرم کا مقابلہ

رجمنٹ جس کی کمان تیمور نے اپنے ایک خاص امیر کو سونپ رکھی تھی ۔ بایزید کے داہنے بازو پر ٹوٹ پڑی اور بیرونی چوکیوں سے قیدی لے کر واپس ہو گئی۔ اب ترک کمانڈر کو یقین ہو گیا کہ تاتاری ان سے جنوب کی طرف تھے ۔ وہ اب اس طرف کو بڑھا ۔ دو دن کے بعد وہ دریا پر پہنچے مگر وہاں کوئی تاتاری نہ تھا۔ بایزید نے سوار کالم دریا کے پار روانہ کیے اور ان کی کمان اپنے لڑکے سلیمان کو دی جو قابل کمانڈر تھا۔

جلد ہی سلیمان خبر لے کر آیا۔ تیمور ترکوں سے پہلو کترا کر نکل گیا تھا اور اب تیزی سے انقرہ کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ ان سے بہت پیچھے ۔

اس خبر نے بایزید کو جیسے خواب سے بیدار کر دیا ہو ۔ وہ اب اپنے دشمن کے پیچھے پیچھے اپنے مستقر کو روانہ ہوا۔

تیمور کا اقدام نہایت سادہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ پہاڑی علاقہ اس کے سوارہ کے لیے موزون نہ تھا اس نے دریائے ہیلس کی وادی کے ساتھ ساتھ بڑھنا شروع کیا۔ وہ دریا کے بیرونی کنارے کنارے جا رہا تھا۔ اور بایزید دریا کے موڑ کے درمیان اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں فوجوں کے درمیان دریا تھا اور بایزید نے اس دریا کو عبور کرنے کی بجائے زحمت اٹھائی تھی۔

موسم بھی تیمور کے لحاظ سے اچھا تھا۔ فصلیں پکی ہوئی تھیں اور گھوڑوں کے لیے چراگاہیں بھی عام تھیں ۔ اس نے سوارہ کا ایک کالم علیحدہ کر کے انھیں ترکوں کی خبر رکھنے پر مامور کیا اور وہ خود اب سلیمان کے دستوں سے معمولی سی جھڑپ کے بعد کوچ حصار کے گاؤں میں قیام کر رہا تھا۔ وہاں وہ اپنے پوتوں اور افسروں کو تزویرات پر ہدایات دے رہا تھا ۔ اس نے ان سے کہا:

" اب ہمارے لیے دو راستے کھلے ہیں ۔ اوّل تو ہم یہاں انتظار کر سکتے ہیں

اس دوران میں ہمارے جوان آرام کر لیں گے۔ گھوڑے تازہ دم ہو جائیں گے اور ہم ترکوں کا مقابلہ اچھی طرح کر سکیں گے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم آگے بڑھتے جائیں اور ان کے ملک کو برباد کرتے جائیں تاکہ وہ ہمارے پیچھے پیچھے آنے پر مجبور ہو جائیں۔ ان کی فوج کا بڑا حصہ پیادہ ہے اور پیدل چلنا انسان کو تھکا دیتا ہے۔

تھوڑی دیر رک کر اس نے خود ہی کہا:

"اور ہم یہی کریں گے۔"

اس گاؤں کے بعد تیمور کے کوچ کا طریقہ بدل گیا۔ اس نے گاؤں میں مضبوط موخر الجیش چھوڑا اور دو امیروں کے تحت سواروں کا ایک لشکر آگے روانہ کیا۔ ان کے ساتھ کچھ پیادہ سپاہی بھی بھیجے جن کا کام یہ تھا کہ جو معسکر فوج کے لیے چنے جائیں ان کے گرد خندقیں پہلے سے تیار رکھیں اور مقدمۃ الجیش کے سوار ارد گرد سے فوج کے لیے غلہ جمع کر کے لے آئیں۔

یہاں تاتاریوں نے دیکھا کہ علاقہ زیادہ کھلا ہے۔ پانی بھی خاصا تھا۔ اب وہ دریا سے تند سے ہٹ گئے تھے۔ علاوہ ازیں انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ترکوں کا مستقر انقرہ میں تھا۔ انقرہ ان کے راستے میں پڑتا تھا اور اس سے بہتر خبر شاید ہی کوئی ہو سکتی تھی۔ تیمور نے اپنی رفتار تیز کر دی اور انقرہ کا ایک سو میل کا فاصلہ تین دن میں طے کیا۔

بڑھاپے میں اس نے زرہ پہننی چھوڑ دی تھی مگر اس روز وہ اپنی زرہ پہن کر نکلا اور شہر کے گرد گھوڑے پر سوار ہو کر پھرا، تاکہ حالات کو خود دیکھ لے۔

شہر کے اندر جو ترک تھے وہ اس کے دفاع پر تلے ہوئے تھے۔ تیمور نے حملے

کا حکم دیا اور خود بایزید کے معسکر کو دیکھنے چلا گیا جو خالی نظر آتا تھا۔ لشکر کے ملازمت پیشہ جنھیں بایزید وہاں چھوڑ گیا تھا وہ بھی شاید وہاں سے چلے گئے تھے۔

انقرہ ایک وسیع میدان کے بیچ میں تھا۔ تیمور نے میدان کا ملاحظہ کیا اور اس فیصلے پر پہنچا کہ بایزید کا چنا ہوا مقام چنداں برا نہ تھا۔ اس کے تاتاریوں نے بایزید کے خیموں میں ڈیرے ڈال دیے۔ امیر تیمور کے حکم سے انھوں نے پاس کے دریا پر بند باندھ دیا جو انقرہ میں ہو کر گزرتا ہے اور اس کا بہاؤ اپنے معسکر کے عقب کی طرف کر دیا۔

ترک جو بڑھ رہے تھے اب صرف ایک چشمے کا پانی استعمال کر سکتے تھے۔ تیمور نے اسے بھی برباد کرا دیا اور اس میں گندگی پھنکوا دی۔ ابھی اس کے آدمیوں کی کوششیں شہر کی فصیلوں کے خلاف کارگر ثابت نہ ہوئی تھیں کہ سکاؤٹوں نے تیمور کو بایزید کے بڑھنے کی اطلاع دی۔ وہ بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔

تیمور نے شہر لینے کی کوشش ترک کر دی۔ اس کے کچھ آدمی ایک پشتے پر پہنچ چکے تھے انھیں بھی واپس بلا لیا۔ اس رات اس نے معسکر کے گرد خندقیں کھودیں اور تمام رات جگہ جگہ الاؤ روشن رکھے۔ اس کا سوارہ معسکر کے گرد گشت لگاتا رہا مگر ترک دوسری صبح سے پہلے نہ پہنچے۔

وہ ایک ہفتے سے سفر میں تھے اور رفتار بھی تیز رکھنی پڑی تھی۔ اس دوران میں پانی کی قلت رہی تھی اور خوراک تو بہت ہی کم مقدار میں مہیا ہو سکی تھی۔ اس راستے پر تاتاری ان سے پہلے گزر چکے تھے اور جہاں جہاں سے وہ گزرے تھے بربادی پھیلاتے گئے تھے۔ تھکان اور گرمی پر مزید پانی کی قلت۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ تاتاری ان کے معسکر پر مسلط تھے اور پانی تک پہنچنے کے لیے تاتاریوں کے

معسکر سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ تیمور پر حملہ۔

بایزید مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا سوارہ وسطی ایشیا کے سواروں کے مقابلے میں کمزور ہے مگر سوا حملے کے اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اس کمزوری کے علاوہ اس کے سپاہی پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ جنگی چال میں وہ ہار چکا تھا اور اسے کچے تاگے سے باندھ کر واپس انقرہ لایا گیا تھا۔ حقیقت میں تلوار کے ٹکرانے سے پہلے ہی وہ میدان ہاتھ سے دے چکا تھا۔

ترکوں کی شجاعت و دلیری بارہا آزمائی جا چکی تھیں۔ وہ اپنی روایتی جرأت سے آگے بڑھے۔ وہی عزم جو متعدد میدانوں میں ناقابل شکست ثابت ہو چکا تھا۔ صبح کے دس بجے کا وقت ہو گا جب دونوں رزم آزمودہ فوجوں کا تصادم ہوا۔ محاذ پندرہ میل سے زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ تاتاریوں کا ایک بازو دریا کے کنارے جما ہوا تھا اور دوسرا بازو دور نظروں سے اوجھل ایک چھوٹی سی پہاڑی کی بلندی پر محکم تھا۔ وقائع نگار لکھتا ہے کہ ترکوں نے نقارہ و طبل اور شہنائی بجا کر پیش قدمی کی اور تاتاری انتہائی خاموشی کی حالت میں ان کے منتظر رہے۔

تیمور آخری لمحے تک اپنے گھوڑے پر سوار نہ ہوا۔ سر دست لڑائی اس کے سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی۔ وہ خود سوارہ کے اجتماع کے عقب میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر پیادہ کے درمیان تھا۔ اس کے اپنے پاس بمشکل چالیس شہسوار ہونگے۔ قلب کا کماندار اس کا پوتا شہزادہ محمد تھا اور اس کی زیر کمان سمرقند کی فوج کے علاوہ ایشیا کے مشہور لشکر سالاروں کے نیچے اسی رجمنٹیں تھیں۔ یہیں ہاتھی بھی تھے۔ ان کے بدن پر رنگین چرمی زرہیں پڑی تھیں۔ ان کا مصرف زیادہ تر نفسیاتی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے تدبیراتی استعمال کا کوئی امکان نہ تھا۔

بایزید کے لڑکے سلیمان نے ایشیائے کوچک کے شہسواروں کی سرکردگی میں تاتاری

میمنہ پر حملہ کیا۔ تیروں کی بوچھاڑ اور نار رومی کے شعلوں نے ان کا استقبال کیا۔ جب دھوئیں اور غبار کے بادل اٹھے تو گھوڑوں اور جوانوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔

ترکوں کی اس بے ترتیبی کو دیکھ کر تاتاری میمنہ کی پہلی صف نے ہلّہ بول دیا۔ اور فوراً بعد تاتاریوں کے قابل ترین سردار نورالدین نے پورے میمنہ سے حملہ کر دیا۔ پہلے ہی گھنٹے میں ترکوں کی پیش قدمی رک چکی تھی۔ اب تاتاریوں نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ نورالدین نے سلیمان کے میسرہ کو اس خوبی سے منتشر کر دیا کہ ترکوں کے چند لشکر میدان سے بالکل نکل گئے۔ ایشیائے کوچک کے بہت سے تاتاری بایزید کی ملازمت میں تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ ان کے سردار تیمور کے ساتھ تھے تو اس بدنظمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے ترکوں سے غداری کی اور تیمور کے لشکر میں جا ملے۔

جب دلہنے بازو پر نورالدین حالات پر قابو پا چکا تو تاتاری بایاں بازو تین لہروں میں آگے بڑھا۔ جلو کی ہلکی فوجوں کو چیرتے ہوئے وہ اس بازو کے ترک سواروں پر جا گرے جو مقابلتاً نہایت کم مسلح تھا۔ وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ تیمور کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب شہزادہ محمد گھوڑا سرپٹ دوڑا کر اپنے دادا کے پاس آیا۔ گھوڑے سے اترا اور زانو ٹیک کر بایزید کے پیادہ کے اجتماع کے خلاف تاتاری قلب پر حملے کی اجازت طلب کی۔ تیمور نے اجازت دینے سے انکار کیا۔

اس کے بجائے شہزادہ محمد کو سمرقند کی سپاہ اور بہادروں کا لشکر دیا جس میں تاتاریوں کے چُنے ہوئے شہسوار تھے اور حکم دیا کہ بائیں بازو کی مدد کی جائے جس کے لشکر اپنی استطاعت سے زیادہ آگے بڑھ گئے تھے۔

تیمور کے چہیتے پوتے نے اپنا سرخ علم بلند کیا اور اس کے پیچھے تاتاری فوج کے شگفتہ پھول اپنے گھوڑوں پر آگے بڑھ گئے۔ سرپٹ بڑھ کر وہ اس دن کی سنگین ترین لڑائی

میں شامل ہؤا۔ یہاں سروِیا کے زرہ پوش ایک ہجوم میں ڈٹے کھڑے تھے اور مضبوط یورپی جوان ایک ایک پہاڑی کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہیں اس دن سروِیا کے بادشاہ پیٹر نے جان دی اور اسی مقام پر شہزادہ محمد اتنا سخت مجروح ہؤا کہ اسے گھوڑے سے اترنا پڑا مگر اس خونی لڑائی میں بایزید کا داہنا بازو بیکار ہو چکا تھا۔

اب بایزید کے پاس صرف پیادہ کا ہجوم رہ گیا تھا جس کے گرد کوئی خندق اور رکاوٹ بھی نہ تھی۔ تاتاری سوار میمن و میسارہ دونوں طرف سے ترک پیادہ کو گھیرے میں لا رہا تھا۔ اب تیمور نے کمان سنبھالی اور تاتاری قلب کو لے کر خود آگے بڑھا۔

بے پناہ عثمانی پیادہ جو ترک فوج کی شان تھی اور جس میں جنیسری شامل تھے اس نے اب تک ایک بھی وار نہ کیا تھا۔ اس کی قسمت کا فیصلہ تو لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ان کا شہنشاہ ایشیا کے شاطر کی جنگی چالوں کے سامنے ناچار و مجبور ہو چکا تھا۔ عقب کی رجمنٹیں جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئیں باقی ماندہ نے جہاں کہیں بلند مقامات نظر آئے ان پر چڑھ کر سوارہ کے پے بہ پے حملوں کا مقابلہ کیا۔ زرہ پوش ہاتھی ان کے بیچ میں سے کبھی ادھر اور کبھی اُدھر جا رہے تھے اور ان کی پیٹھ کے اوپر سے مائع آگ برسائی جا رہی تھی۔ ناقابلِ برداشت شور و غوغا اور گرد و غبار کے طوفان میں اس گرد آلود میدان پر تھکے ماندہ ترکوں نے جان دی۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو بھاگ کھڑے ہوئے مگر تھکان اور بھوک پیاس کی تاب نہ لا سکے اور دم توڑ دیا۔

ایک ہزار جنیسری سپاہیوں کے ساتھ بایزید ایک پہاڑی سے ترکوں کو ہٹا کر ساری شام اس پر بے جگری سے لڑتا رہا۔ وہ کلہاڑی پکڑے اپنے جوانوں کے ساتھ جم کر کھڑا رہا۔ اسی صورت نپولین کے معروف زمانہ گارڈ کی ایک رجمنٹ بھی اس کے ساتھ جم کر واٹرلو کے میدان پر لڑی تھی جب اس کی باقیماندہ فوج بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

تیمور اور یلدرم کا مقابلہ

سلطان کے یہ سپاہی اسی طرح ہتھیار سنبھالے میدان کارزار میں کام آئے۔

شام کے قریب بایزید نے گھوڑا منگایا اور چند سواروں کے ساتھ تاتاری صفوں سے نکل جانے کی کوشش کی۔ اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس کے ساتھی ایک ایک کر کے گرے اور اس کے گھوڑے کو بھی تیروں سے گرایا گیا۔ اسے باندھ کر تیمور کے شامیانے میں غروب آفتاب کے وقت باحفاظت لایا گیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب بایزید پہنچا اس وقت تیمور شاہ رخ کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ جب اس نے بارِیش ترک کو دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا۔ بایزید نے اس مصیبت میں بھی شاہانہ جلال نہ کھویا تھا۔ تیمور اس کے استقبال کو شامیانے کے کنارے تک گیا اور مسکرایا۔

بایزید نے کہا:

"خدا نے جس پر مصیبت ڈالی ہو اسے طعنہ دینا بری بات ہے۔"

تیمور نے نہایت آہستگی سے کہا "میں اس لیے مسکرایا تھا کہ خدا نے اس دنیا کی حکومت مجھ لنگڑے اور تجھ اندھے کو بخشی ہے۔" پھر نہایت سنجیدگی سے کہا:

"یہ تو دنیا جانتی ہے کہ اگر تم فتحمند ہوتے تو میرا اور میرے آدمیوں کا حشر کیا ہوتا۔"

بایزید نے کوئی جواب نہ دیا۔ تیمور نے اس کے بند کھولنے کا حکم دیا اور اسے اپنے پاس بٹھایا۔ بوڑھا فاتح خوش تھا۔ یورپ کا فاتح سلطان اس کا قیدی بن چکا تھا مگر وہ اس کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آیا۔[1] قیدی بایزید نے درخواست کی کہ اس کے

---

[1] زبان زد عام کہانی جس میں بتایا جاتا ہے کہ تیمور نے بایزید کو پنجرے میں ڈال دیا اور اسے جانور کی طرح جگہ جگہ پھرایا۔ مارلو کی کتاب "تیمور اعظم" پر مبنی ہے۔ اس کا ہمعصر راوی

بیٹوں کی جستجو کی جائے اور تیمور نے اس کی تعمیل کا حکم دیا۔ موسیٰ کو قیدی بنا کر لایا گیا مگر تیمور نے اسے خلعت بخشا اور اپنے باپ کے پاس بٹھایا۔ ایک لڑکا لڑائی میں مارا گیا تھا۔ وہ نہ ڈھونڈا جا سکا۔ باقی ماندہ بچ کر نکل گئے تھے۔

تیمور کے لشکر چاروں طرف روانہ کیے گئے تاکہ جو ترک سپاہی بچ نکلے تھے ان کا سمندر تک تعاقب کریں۔ نورالدین نے بروسا پر قبضہ کیا جو عثمانی دارالسلطنت تھا وہاں سے اس نے سلطان کا خزانہ اور کنیزوں کی بہت بڑی تعداد تیمور کی طرف روانہ کی۔ راوی کہتا ہے کہ وہ گانے اور رقص میں مشاق تھیں اور امیران سے خوش ہوا۔ تاتاری سپاہی جب تیموری مستقر میں لوٹے تو ان کے پاس قسم قسم کا مال غنیمت تھا۔ حسب معمول جشن منایا گیا۔ اس مرتبہ اس جشن میں یورپ کی شراب اور یورپی حسن کے نمونے شامل تھے۔

جشن میں بایزید کو بھی مدعو کیا گیا اور اسے مجبوراً شامل ہونا پڑا۔ اسے تیمور کے پاس ہی بٹھایا گیا۔ بوڑھے تاتاری نے حکم دیا کہ بروسا سے جو مال آیا تھا وہ حاضر کیا جائے۔ اس میں سلطان کا شاہانہ لباس بھی شامل تھا۔ یہ سلطان کو پیش کیا گیا۔ حالات سے مجبور دلیر ترک نے جڑاؤ عمامہ سر پر رکھا اور سنہری گرز ہاتھ میں لیا۔ اپنی شہنشاہی کے امتیازی نشان۔ یوں اپنی گزشتہ سطوت و جبروت کے لباس زیب تن کیے۔ سلطان کو وہی مشروبات پیش کیے گئے جن کا وہ ہمیشہ سے عادی تھا مگر اس نے کوئی بھی شے

۵۔ صرف ابن عرب شاہ ہے جو ایک شعر میں کہتا ہے کہ "عثمان کا بیٹا شکاری کے جال میں پھنس گیا پھر اسے پرندے کی طرح پنجرے میں رکھا گیا۔" ہربرٹ ایڈمز گبن اس کے متعلق کہتا ہے، امکان یہ ہے کہ وہ جالی دار کجاوہ تھا جس میں اس نے سفر کیا۔ قید ہونے کے بعد بایزید بیمار پڑ گیا تھا۔ تیمور نے اپنے بہترین طبیب اس کے علاج کے لیے بھیجے اور اس سے حسن اخلاق کے ساتھ پیش آتا رہا۔ اتنا ضرور ہوا کہ بایزید کو فتح کے جشن میں حاضر رہنا پڑا۔

نہ چکھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے حسین و جمیل کنیزیں تھیں جو پیرہن سے آزاد ناتاری فاتحوں کے سامنے جام و مینا کی گردش سے چرخ کہن کی گردش کو مات کر رہی تھیں۔
اس کی چہیتی ڈسپینا بھی ان میں شامل تھی۔ ڈسپینا سرویا کے بادشاہ پیٹر کی بہن تھی اور وہ اسے تاریخ پسند تھی کہ اس نے اسے مسلمان ہونے پر مجبور نہ کیا تھا۔
وہ خاموش بیٹھا تھا اور وہی عورتیں جن پر اس کی نظر کرم بارہا پڑ چکی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے لوبان کے دھوئیں کے بادلوں میں یوں تھرکتی ہوئی پھر رہی تھیں جیسے یہ سب کچھ پریوں کے اڑنے کے متعلق ایک بے بنیاد سا خواب ہو یا الف لیلیٰ کی کوئی کہانی۔ یہ سب میدان ہاری ہوئی قوموں کی لڑکیاں تھیں اور اس کی نظر انتخاب انھیں اس کے دربار تک لے آئی تھی۔ آج وہ اسی اصول کے مطابق سیڑھی کے ایک اونچے پر قدم رکھ چکی تھیں۔ ان میں سیاہ زلفوں والی ارمنی بھی تھیں اور سنہری گیسوؤں والی کوہ قاف کی پریاں بھی۔ وہاں موٹے خط و خال کی روسی نازنینیں بھی تھیں اور روشن نگاہوں والی یونانی بھی۔ ان لڑکیوں نے آج تک حرم کے باہر قدم نہ رکھا تھا۔
ایشیا کے حکمران شہزادے بایزید کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ پرسش کناں، طعنہ زن اور ناقابل برداشت۔ بایزید کا ذہن ان خطوط کی طرف منتقل ہونے پر مجبور کیا جا رہا تھا جو اس نے گزشتہ سال تیمور کو لکھے تھے۔ اس کی خودداری اسے غصے کو چھپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ غصہ پی جانا چاہتا تھا، مگر یہ بے پناہ غصہ اسے کھائے جا رہا تھا۔ وہ اس رات کچھ نہ کھا سکا۔
تیمور یہ سب کچھ کیوں کر رہا تھا؟ کیا یہ سب کچھ بے پروائی کا نتیجہ تھا یا صرف بایزید کو اس کے درباری لباس میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یا یہ جشن اس کا مذاق اڑانے کے لیے منایا جا رہا تھا؟ اس کا جواب کون دے سکتا تھا؟ مگر سلطان کو اس کی پروا بھی نہ تھی۔ اس کے کانوں میں تاتاری طبل اور نقارے گونج رہے تھے۔ اور سطح مرتفع کے گویوں کے گانے ناقابل برداشت

ہو رہے تھے۔

اس کے باوجود طبیعت پر جبر کر کے بایزید نے اپنے گرز کو پکڑے رکھا۔ مگر جب تاتاریوں نے اس کی مغنیات کو ترکی زبان کے محبت بھرے گیت گانے کا حکم دیا تو بایزید برداشت نہ کر سکا، وہ اٹھا اور شامیانے کے دروازے کی طرف حرکت کی۔

انھوں نے اسے جانے دیا۔ دو تاتاری افسر کھڑے ہو گئے اور اس کے بازو تھام کر اسے تاتاری جشن منانے والوں کی قطاروں سے نکال کر باہر لے گئے۔ اس کا سر سینے پر جھک چکا تھا۔ اب شاہی عمامہ بھی اپنی آب و تاب کھو چکا تھا۔

تیمور نے بعد میں ڈسپینا کو بایزید کے پاس یہ پیغام دے کر روانہ کر دیا کہ وہ اس کی چہیتی بیوی کو لوٹا رہا تھا۔

یوں "طوفان" یلدرم کی عظیم الشان طوفانی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ عیاشی نے پہلے ہی اس کی صحت کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ جنگ کے مصائب اور خودداری کی موت کا وہ زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکا اور چند مہینوں کے بعد اس کے ذہن و بدن کو موت کی آغوش نے اس کشمکش سے چھٹکارا دلایا۔

یورپ کے دروازے پر

ترکوں کی شکست اتنی مکمل تھی کہ وہ دوسری بار مقابلے پر آنے کے خایل نہ رہے تھے۔انقرہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ بروسا اور نکایا پر نہایت سرعت سے قبضہ کر لیا گیا۔ہارے ہوئے شہزادے، پاشا اور فوجی افسر ایشیائے کوچک کے سرحدی سمندر تک بھاگتے ہوئے چلے گئے۔جو بھی کشتیاں انھیں مل سکیں انھیں لے کر وہ جزیرے میں پہنچے۔یونانیوں اور جنیوا والوں کے جنگی جہازوں نے بھی ترکوں کو یورپ میں پناہ لینے کے لیے مدد دی۔

عیسائیوں نے اپنے سابق حکمرانوں کی مدد کیوں کی؟ اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ ممکن ہے دولت کی وجہ سے یا یہ بھی ممکن ہے کہ یونانی ہر حکمران کو خوش رکھنا اپنا دستور بنا چکے تھے۔ان کے نمائندے تیمور سے اقرار کر چکے تھے کہ اگر اس نے سلطان کے خلاف لشکر کشی کی تو وہ جہازوں اور زر و مال سے مدد کریں گے۔اب ان کا دورخہ رویہ تیمور کو برا محسوس ہوا خصوصاً جب انھوں نے اس کے لشکروں کو یورپ لے جانے سے انکار کیا۔

ایک مہینے کے بعد ایشیا میں ایک بھی ہتھیار بند ترک موجود نہ تھا۔اس کے برعکس یورپ میں ایک بھی تاتاری نہ تھا۔سمرقند کے شہسوار سمندر کے کنارے تک پہنچے اور وہاں سے انھوں نے قسطنطنیہ کے چمکتے ہوئے سنہری گنبدوں کو دیکھا۔جہاں ہیلیں ایک بار اپنا دربار منعقد کر چکی تھی۔اس ٹرائے کے کھنڈروں کے اوپر اب تاتاری گھوڑے سرپٹ دوڑا رہے تھے۔بعد میں انھوں نے سینٹ جان کے نائٹوں کا حصار سمرنا میں دیکھا۔اب جاڑے

کا موسم تھا اور بارش کا زور تھا۔ مگر تیمور نے سنا کہ سمرنا نے چھ سال تک بایزید کے محاصرے کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ اس وجہ سے اسے دیکھنے کے لیے گیا۔

قلعے کے عیسائی نائٹ مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ قلعہ بلندی پر تھا اور انھیں محاصرے کی ناکامی کا یقین تھا۔ دوسری طرف خلیج تھی۔ تیمور نے محاصرے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے پانی کی طرف چوبی مینار تعمیر کرنے کا حکم دیا اور خلیج میں بند بندھوانا شروع کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے مہندس قلعے کی دیواروں میں سرنگیں لگانے پر مامور ہو گئے۔ سرنگ لگانے والوں کے خلاف حملوں کو روکنے کے لیے تیر اندازوں کی بڑی تعداد مناسب مقامات پر متعین کی گئی اور قلعے کے اندر نارومی کے بم پھینکنے شروع کیے۔ یورپ کے سپاہیوں کے لیے دو ہفتے کافی تھے۔ ابھی خلیج کے آر پار بند مکمل نہ ہوا تھا اور بچ نکلنے کا راستہ مسدود نہ ہوا تھا۔ تین ہزار کے قریب جہازوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کے ساتھ جو شہری باشندے آنا چاہتے تھے ان کو انھوں نے اپنی تلواروں کے زور سے پیچھے چھوڑا اور خود جان بچا کر نکل گئے۔ دوسرے دن روڈز کے جزیرے سے کچھ جہاز سمرنا کی مدد کو آئے۔

جب عیسائی جہاز ساحل کے قریب ہوئے تو تاتاریوں نے جو اب حصار پر قابض ہو چکے تھے ان کا خیر مقدم نہایت ڈراؤنے طریقے سے کیا۔ ایک صلیبی کا سر گوپیے میں رکھ کر ان کی طرف پھینکا گیا جو قریب ترین جہاز میں جا کر پڑا۔ یہ حال انھیں پسند نہ آیا اور ان جہازوں نے لوٹ جانا بہتر سمجھا۔ ان کے بعد جلد ہی تاتاریوں نے بھی سمرنا خالی کر دیا۔ مگر اپنی یادگار کے طور پر وہ کلہ مینار چھوڑتے گئے۔

ایشیائے کوچک کے انخلا کے وقت وہ شہزادے جن کی بہت تلاش کی گئی، مختلف راستوں سے جان بچا کر بھاگ گئے میں کامیاب ہو گئے۔ بغداد کا حکمران سلطان احمد مصر جا پہنچا اور وہاں مملوک دربار میں پناہ لی۔ ترکمان کارا یوسف نے صحرائے عرب کا

راستہ چُنا۔ پناہ کے لحاظ سے اس مرتبہ صحرا مصری دربار سے بہتر ثابت ہوا۔ مملوکوں نے اطاعت قبول کرنے میں دیر نہ کی۔ انھوں نے خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا اور تیمور کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ بدبخت سلطان احمد کو پابہ سلاسل بندی خانے میں ڈال دیا گیا۔

شاہانِ یورپ نے اس عظیم واقعے کو ملے جلے احساسات سے قبول کیا۔ حیرت و استعجاب اور فرحت و انبساط کے جذبات تو نمایاں ہی تھے البتہ خوف و ہراس بھی عنقا نہ تھا۔ ان کی دہلیز پر آنی کا یا پلٹ چکی تھی کہ وہ اسے صحیح پس منظر میں دیکھنے کے قابل نہ تھے۔ ترک ایک صدی تک جس جگہ حکمران رہ چکے تھے اسی جگہ ایک غیر معروف سا تاتاری فاتح مشرق کی نامعلوم گہرائیوں سے نمودار ہوا اور اس کے سامنے بایزید کا زور ختم ہو چکا تھا۔ اس کی فوجیں منتشر ہو چکی تھیں اور مستقبل کی کوئی نہ جانتا تھا۔ انگلستان کے بادشاہ ہنری ششم نے تیمور کو مبارک باد کا خط لکھا۔ فرانس کے عظیم المرتبت شہنشاہ چارلس ششم کو بھی وہ پیغام یاد آگیا جو سلطانیہ کا بشپ جان ساتھ لایا تھا۔ اس نے بشپ کو بلا بھیجا اور اس کے ہاتھ تحائف اور خطوط تیمور کی خدمت میں روانہ کیے۔

کو بچہ گرد مینوئل شہنشاہ قسطنطنیہ اپنے شہر خوش خوش لوٹ آیا۔ وہاں سے اس نے تیمور کی خدمت میں اطاعت نامہ روانہ کیا اور خراج ادا کرنے کا اقرار کیا۔ جنیوہ کے ناداخلف کو یورپی بادشاہوں سے بڑا دلی اور مربی میسر آگیا تھا۔ تنگنائے سنہری قرن کے اس پار پیرا کے برجوں سے جنیوا والوں نے تیموری عَلم بلند کیا۔

مگر سب سے پہلے تاتاری فاتح کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا سہرا ہسپانیوں کے سر رہا۔ اس واقعے سے کچھ عرصہ پہلے کسٹیلیہ کے بادشاہ ہنری سوم نے فوجی مبصر مشرق کی جانب روانہ کیے تھے تاکہ ترکوں کی فوجی طاقت اور منصوبوں کا پتا لگائیں۔ یہ دونوں نائٹ جن کے نام پلایو ڈی ساتومیئر اور فرنندو ڈی پیلا زوا یلاس تھے

ایشیائے کوچک میں پھرتے رہے اور آخر انقرہ کی لڑائی کے وقت تیمور کے لشکر میں پہنچ گئے۔ تیمور نے باریابی کی اجازت دی اور بایزید کی کنیزوں میں سے دو عیسائی لڑکیاں تحفے کے طور پر دیں۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک تو انجیلا تھی جو اپنے حسن کے لیے مشہور تھی اور جان کاؤنٹ آف ہنگری کی بیٹی تھی - دوسری ماریہ نامی یونانی لڑکی تھی جب دونوں ہسپانوی واپس گئے تو امیر نے اپنا سفیر بھی ساتھ کیا۔

ان عنایات کے جواب میں ڈان ہنری نے تین سفیر روانہ کیے تاکہ اس "تاتاری نائٹ" کے ہمرکاب اس "لاثانی بادشاہ" امیر تیمور کے دربار تک جائیں۔ ان تین سفیروں کا سردار رانی ڈی گان زیلینر کا لویخو تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اپنے ساتھیوں اور تیمور کے افسر کے ہمراہ کالویخو سینٹ میری کی بندرگاہ سے مئی ۱۴۰۳ء میں روانہ ہوا۔ جب وہ قسطنطنیہ پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ تاتاری فاتح واپس جا چکا تھا۔ حکم کی تعمیل کی غرض سے وہ اس کے پیچھے ہو لیا اور اس کی جستجو اسے ملک ملک ہوتے ہوئے سمرقند لے گئی۔

تیمور نے یورپ میں داخل ہونے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ یہ درست ہے کہ سمندر اسکی راہ میں حائل تھا مگر وہ بحیرۂ اسود کے شمال سے بھی جا سکتا تھا اور ابھی چند سال کی بات تھی کہ وہ کریمیا جا چکا تھا۔ مگر یورپ جانے کا مقصد مفقود تھا اور اس کے سپاہی سمرقند جانے کے لیے بیتاب تھے۔ علاوہ بریں بایزید کے شہروں سے خاصی دولت بھی ہاتھ آچکی تھی جس میں بروسا کے چاندی کے دروازے بھی تھے جن پر نصرانی بزرگوں پیٹر اور پال کے مجسمے کندہ تھے۔ بازنطین کا کتب خانہ جو سلطان کے ہاتھ لگا تھا وہ بھی تیمور اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

کچھ عرصے کے لیے وہ سیاسیات میں منہمک رہا۔ ادائے خراج کے طریقوں کا فیصلہ کرنا تھا۔ ترک صوبوں کے حاکم مقرر کرنا تھے اور مختلف سفارتوں کو شرف باریابی بخشنا تھا۔

اس دوران میں بایزید بھی مرگیا اور تیمور کے ذہن میں ایک نئی فتح کا نقشہ تشکیل پا رہا تھا۔

اسی عرصے میں اسے جانکاہ صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اسے اطلاع ملی کہ شہزادہ محمد کو جو زخم انقرہ کی لڑائی میں آئے تھے وہ ان کی وجہ سے قریب مرگ تھا۔ تیمور اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ بہترین عرب طبیبوں کو علاج پر مامور کیا مگر جب وہ محمد کے معسکر میں پہنچا تو شہزادے کی طاقت گویائی سلب ہو چکی تھی اور وہ آخری لمحات گن رہا تھا

تیمور نے فوراً ہی کوچ کا نقارہ بجانے کا حکم دیا اور واپس سمرقند روانہ ہو گیا۔ اس کی اولاد باری باری سے اس سے جدا ہو رہی تھی۔ پہلے جہانگیر، اس کا بڑا بیٹا، پھر عمر شیخ۔ اُدھر میراں شاہ نا خلف ثابت ہو چکا تھا اور باوجودیکہ شاہ رخ جوانی سے گزر چکا تھا اس کی توجہ جنگ کی طرف مائل نہ تھی۔ ان گزشتہ چند سال میں شہزادہ محمد اس کا منظور نظر رہا تھا جو نہایت دلیر اور بہادر تھا اور جس پر فوج جان دیتی تھی۔

نوجوان شہزادے کی نعش کو تطہیر کے بعد اس نے ساتھ لیا اور جو لشکر وہ سمرقند سے لے کر آیا تھا انہیں لشکریوں کی سپردگی میں اس کی نعش واپس ہوئی۔ ان کے خوشنما علم اب کالے رنگ میں تبدیل ہو چکے تھے۔ خان زادی کی آہ و بکا نے تیمور پر کچھ اثر نہ کیا مگر جب تبریز میں شہزادہ محمد کے چھوٹے بچے نعش کے استقبال کو سامنے آئے تو تیمور اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور کئی دن اپنے شامیانے سے باہر نہ نکلا۔

بڑھاپے میں گزشتہ ایام کی یادیں بھی ستاتی ہیں۔ جب تیمور ماضی پر نظر ڈالتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس سے بھی قوی تر طاقت اس سے ان سب کو چھین رہی ہے جو اس کے لیے زیادہ کارآمد تھے اور جن سے اسے محبت تھی۔ وہ اولوالعزم امیر جو اس کی اولیں فتوحات میں اس کے ساتھی تھے اب زیر زمیں آرام کناں تھے۔ نیک سیرت سیف الدین، وفادار جاکو برلاس اور اب اس کے بڑے بیٹے کا جری جواں سال بیٹا جاں سپار اک لوگا جسے اس نے ہرات کا والی مقرر کیا تھا اور جس نے فوج کے لیے جواں مرد بیٹے دیے تھے وہ

بھی نذر خاک جا چکا تھا۔

ان کی جگہ اب اس کے پاس نورالدین اور شاہ ملک تھے۔ جنگ میں لاثانی کمانڈر مگر نظم و نسق مملکت کے ناقابل۔ جب بھی وہ ایسے جانبازوں کی نعش واپس سمرقند لے کر جاتا تو علماء دین اس کا دل بہلانے کے لیے دعاؤں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتے اور آئندہ کی خوشخبریاں دیتے۔ مگر اس کی نیندیں اب عجیب و غریب خوابوں سے پریشان رہتیں۔ ان خوابوں کے خواب جو غول کے غول لے کر حولگے اس پار ختطا تک گئے تھے مگر اب مدت ہوئی خاک ہو چکے تھے۔

اس نے بغداد اور دوسرے شہروں کو از سر نو تعمیر کرنے کے احکام جاری کیے مگر یہ خواب اور مناظر اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتے تھے۔ جب اس نے شاہرخ کو خراسان اور محمد کے بھائی کو ہند کی حکومتیں ودیعت کیں تو بھی اس کے ذہن میں صحرائے گوبی موجود رہا اور وہ ان کہانیوں کو نہ بھلا سکا جو شہر سبز میں اس نے اپنی جوانی کے ایام میں سنی تھیں۔

انہیں پریشان خوابوں سے اس نے ایک نیا منصوبہ تیار کیا۔ وہ اپنی فوج کو صحرائے گوبی میں سے گزار کر لے جائیگا۔ وہ ختطا کی محافظ دیوار کو توڑ کر نکل جائیگا اور دنیا کی آخری طاقت جو اس کا مقابلہ کر سکتی تھی اسے کو اپنے قدموں میں لائیگا۔

مگر اس نے اپنے افسروں سے اس کے متعلق ذکر نہ کیا۔ موسم کی وجہ سے سرما سے تبریز ہی میں گزارنا پڑا اور اس فرصت کو اس نے امور ملکی کی درستی میں صرف کیا۔ سالہا سال کی جنگوں نے ملک کے حالات ابتر بنا دیے تھے اور ضرورت تھی کہ ان کی طرف توجہ دی جاتی۔ جونہی بہار کے موسم میں گھاس کی پہلی کونپلیں پھوٹیں وہ پھر کوچ میں تھا۔ دنیا کی یہ بڑی فوج اور تیموری دربار سمرقند کی شاہراہ پر اس کے ساتھ تھا۔ اگست کے مہینے میں وہ اپنے شہر میں تھا اور "دلکشا باغ" میں اس نے سکونت اختیار کی۔ جب وہ

شاہی مسجد کے پاس سے سوار ہو کر گزرا تو معماروں کو اندرونی غلام گردش فراخ نہ بنانے پر سرزنش کی۔اس کی غیر حاضری میں جو وزرا امورِ مملکت کے ذمہ دار تھے ان کے کاموں پر نظر ثانی کی گئی۔بعض کے سر قلم ہوئے اور بعضوں نے انعامات پائے۔اس بوڑھے جسم میں سے لامتناہی سی قوت اُبل اُبل پڑتی تھی۔شہزادہ محمد کے لیے نئے مقبرے کے احکام صادر ہوئے۔اس کا گنبد سنہری اور سفید مرمر کا طے پایا۔اس کی ان تھک اور محکم قوتِ ارادی کے تحت ایک نیا محل وجود میں آیا جو سیاہ و سفید مرمر کا تھا اور جس میں آبنوس اور ہاتھی دانت استعمال کیا گیا تھا۔اس کے ستون چاندی کے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وقت سے مقابلہ کر رہا تھا۔گزشتہ دو سال سے اس کی نظر کمزور ہو گئی تھی۔اس کی پلکیں بھی گر چکی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سویا ہوا ہے۔اس کی عمر بھی ایک کم ستر کو پہنچ چکی تھی اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اب خاتمہ قریب ہے۔

"دو ماہ جشن ہوتا رہیگا" اس نے حکم دیا "اور کوئی کسی سے نہ پوچھے گا کہ یہ کام تم نے کیوں کیا ہے۔"

فاتح ایشیا کے اس جشن میں شامل ہونے کے لیے بیس ممالک کے سفیروں نے سمرقند کا رُخ کیا۔ان میں گوبی کے مغلوں کے گندمی رنگ سفیر بھی شامل تھے۔مغل ملک خطا سے نکالے جا چکے تھے۔ان سے تیمور بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔

تیمور نے شاہ ہسپانیہ کے سفیر کالوبخو سے طویل گفتگو کا وقت بھی نکال لیا۔کالوبخو قسطنطنیہ سے تیمور کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ہسپانیہ کے درباری نے اس ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے:

"سفیروں کا قیام جس باغ میں کیا گیا تھا وہاں سے چل کر ۸ ستمبر کو پیر کے دن وہ سب سمرقند روانہ ہوئے۔جب وہ محل کے باغ میں پہنچے تو اپنے گھوڑوں سے

اتر آئے۔ وہ سرداران کے پاس آئے اور ان سے وہ تمام تحائف دینے کے لیے کہا جو وہ امیر کے لیے ساتھ لائے تھے۔ سفیروں نے تحائف ان آدمیوں کے ہاتھ میں دیے جنھیں ان کو مؤدبانہ امیر کی خدمت میں لے جانا تھا۔ سلطان کے سفیر نے بھی اسی طرح کیا۔

اس باغ کا دروازہ نہایت وسیع اور بلند تھا۔ وہ نہایت خوبصورتی سے سنہری اور نیلے رنگ کی اینٹوں سے مزین تھا۔ دروازے پر بہت سے دربان کھڑے تھے جن کے ہاتھوں میں گرز تھے۔ آگے چھ ہاتھی تھے جن کی پیٹھوں پر لکڑی کے ہودے رکھے تھے اور ان میں آدمی تھے۔

اس کے بعد سفیروں[1] کو بغلوں سے پکڑ کر آگے لے جایا گیا۔ جو سفیر امیر تیمور نے کستیلیہ کے بادشاہ کی طرف روانہ کیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ جب اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھا تو وہ ہنس پڑے۔ اس نے کستیلیہ کا لباس پہن رکھا تھا۔

سفیروں کو ایک معمر امیر کے سامنے لے جایا گیا جو پیش گاہ میں بیٹھا تھا۔ تمام سفیر جھک کر اس کے سامنے آداب بجا لائے۔ اس کے بعد وہ چند چھوٹے لڑکوں کے سامنے لائے گئے۔ یہ امیر کے پوتے تھے۔ یہاں سفیروں سے سفارشی خطوط کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ ایک لڑکے کے حوالے کیے گئے اور وہ انھیں اندر امیر کے پاس لے گیا۔ امیر نے سفیروں کو اندر لانے کا حکم دیا۔

امیر تیمور محل کے دروازے کے سامنے ایک محراب کے نیچے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک فوارہ تھا جس میں سرخ سیب تیر رہے تھے۔ فوارے کا پانی خاصی بلندی تک جا رہا تھا۔ امیر ریشمی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے گرد گول گول تکیے تھے۔ وہ ریشمی جبہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر اونچی سفید ٹوپی تھی جس پر لعل جڑا ہوا تھا اور اس کے گرد موتی اور دوسرے قیمتی جواہرات تھے۔

---

[1] کلاویخو اپنے آپ اور اپنے ساتھیوں کو سفیر کہتا ہے۔ تیمور کو وہ "لارڈ" کا خطاب دیتا ہے۔

[illegible] گیا ہے جسے ہکلیوت سوسائٹی نے طبع کیا۔

" جونہی سفیروں نے امیر کو دیکھا وہ تعظیماً جھک گئے۔ گھٹنا زمین پر ٹیک کر اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔ پھر وہ آگے بڑھے اور دوبارہ تعظیم بجا لائے ۔ پھر تیسری بار۔ اس بار ان کے گھٹنے زمین ہی پر رہے "

" امیر نے انھیں کھڑے ہونے اور آگے آنے کا حکم دیا۔ سردار جو اب تک انھیں پکڑے ہوئے تھے انھوں نے ان کو چھوڑ دیا۔ جو شہزادے امیر کے پاس کھڑے تھے اور ان میں نورالدین بھی شامل تھا وہ سفیروں کو آگے لے گئے تاکہ وہ انھیں قریب سے دیکھ سکے۔ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی نظر کمزور ہو چکی تھی۔

" امیر نے بوسے کے لیے اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔ یہاں یہ رسم نہیں۔ مگر اس نے بادشاہ کے متعلق دریافت کیا اور پوچھا:

' میرے بیٹے! بادشاہ کا کیا حال ہے۔ کیا اس کی صحت اچھی ہے؟'

" پھر اس نے سرداروں کو مخاطب کیا جو اس کے گرد بیٹھے تھے۔ ان میں توکتمیش جو پہلے تاتار ممالک کا بادشاہ تھا اس کا بیٹا بھی شامل تھا۔ ان میں سابق بادشاہ سمرقند[1] کے خاندان کے شہزادے بھی تھے۔ اس نے ان سے کہا:

' دیکھو، یہ وہ سفیر ہیں جو میرے لڑکے ہسپانیہ کے بادشاہ نے روانہ کیے ہیں۔ یہ فرنگیوں کا سب سے بڑا بادشاہ ہے اور دنیا کے دوسرے سرے پر رہتا ہے'

" یہ کہہ کر اس نے اپنے پوتے کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اسے کھولا اور کہا کہ وہ اسے اسی وقت سنے گا۔ سفیروں کو قریب ہی ایک کمرے میں لے جایا گیا جو امیر کے

---

[1] اس سے وہ حاجی خان مراد ہے جسے تیمور نے سمرقند سے نکالا تھا۔ کلاویخو نے اپنے قیام کے دوران ایشیا و وسطی ایشیا کے حالات کی اطلاعات اچھی خاصی حاصل کر لی تھیں۔ انیسویں صدی سے پہلے مغربی یورپ کا وہ واحد نمائندہ تھا جو سمرقند تک گیا۔ انیسویں صدی تک تیمور کے بنائے ہوئے محل کھنڈر بن چکے تھے۔ کچھ زلزلوں اور کچھ موسم کا شکار ہوگئے۔

بیٹھنے کی جگہ کی داہنی طرف تھا۔ جن شہزادوں نے انھیں پکڑ رکھا تھا انھوں نے انھیں بیٹھنے کو کہا اور ملک خطا کے شہنشاہ کے بھیجے ہوئے سفیر سے نیچے بٹھایا۔

"جب امیر نے دیکھا کہ ان سفیروں کو خطا کے سفیر سے نیچے بٹھایا گیا ہے تو اس نے حکم دیا کہ انھیں اوپر بٹھایا جائے اور اسے ان سے نیچے بٹھایا جائے۔ اور کہا کہ ہسپانیہ کا بادشاہ میرا بیٹا اور دوست ہے اور خطا کا بادشاہ چور اور برا آدمی ہے۔"

سفید دنیا

بوڑھے فاتح نے خیالی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ ایک معسکر، باغ اور شہر بنایا اور اس میں اس نے شاندار طریقے سے جشن منایا۔ ان دو مہینوں کے دوران میں جب خزاں کا سورج پہاڑیوں کے نیلے سلسلے کے قریب غروب ہوتا تھا سمرقند جنّوں کا سا شہر معلوم ہوتا تھا۔

کم از کم کلاویخو کو تو اسی طرح معلوم ہوا۔ اس نے عجیب و غریب باتیں دیکھیں۔ اس نے وسیع و عریض صحن پھولوں اور پھلوں سے بھرے دیکھے۔ اور کجاوے دیکھے جو جواہرات سے چمک رہے ہوتے اور ان کے اندر لڑکیاں گا رہی ہوتیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بانسری بجاتے ہوئے لڑکے، تیر اور سنہری سینگوں والی بکریاں ہوتیں جو دراصل جانور نہ ہوتے بلکہ لڑکیاں ہوتیں جو ان جانوروں کی کھالیں پہنے ہوتیں۔ وہ ایسے محل میں بھی پھرا جو مسجد کے میناروں سے بلند تھا اور جسے سمرقند کے بافندوں نے قرمزی کپڑے سے تیار کیا تھا۔ اس نے ہاتھیوں کی لڑائی دیکھی اور تاتاری شہزادے ہند اور گوبی سے آتے دیکھے جو امیر کی خدمت میں تحائف پیش کرنے آتے تھے۔

وہ لکھتا ہے: "بغیر دیدے پھاڑ کر دیکھنے اور قدم آہستہ اٹھا کر چلنے کے کوئی ان چیزوں کی تفصیل بیان نہ کر سکتا تھا۔"

پھر اچانک سفیروں کو اجازت دے دی گئی اور جشن ختم ہو گیا۔ تیمور نے شہزادے اور امیر طلب کیے اور ان سے کہا "ہم نے پورا ایشیا ختم کیا ہے۔ صرف ختا باقی رہ گیا ہے۔ ہم نے اتنے زبردست شاہوں کا تختہ الٹ دیا ہے کہ ہمارے کارنامے ہمیشہ یاد

رہیں گے۔ تم کئی جنگوں میں میرے ساتھی رہے اور آج تک فتحمندی نے تمھارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ خطا کے کافروں کو شکست دینے کے لیے زیادہ طاقت کی ضرورت نہ ہوگی اور اب تم میرے ساتھ وہاں جاؤ گے۔"

وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کی بھاری آواز محکم یقین سے گونج رہی تھی اور اس نے انھیں اپنے مقصد کا یقین دلایا۔ اپنے آبا و اجداد کے ملک سے گزر کر خطا کی محکم دیوار سے گزر کر آگے بڑھنا اس کی آخری مہم ہونی تھی۔ اس کے مخاطب وہ تھے جنھوں نے تین مہینوں سے زیادہ آرام نہ کیا تھا مگر انھوں نے یک آواز نعرہ لگایا اور اپنا عَلَم بلند کیا۔

شہسواروں کا ایک جم غفیر سمرقند میں جمع تھا۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ دو لاکھ کی فوج مختلف سپاہیوں اور جیتیوں میں بٹ کر شاہراہ کے معسکروں کی طرف روانہ ہوئی۔ جاڑے کا آغاز تھا اور سقف جہاں کی بلندیوں پر انھیں برف کے پگھلنے کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ مگر تیمور موسم بہار کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اس نے شہزادہ خلیل کو فوج کے میمنہ کے ساتھ شمال کی جانب روانہ کیا اور خود قلب میں رہا۔ یہ قلب وہ کبھی شہزادہ محمد کو سونپا کرتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بڑی بڑی گاڑیاں لے کر چلے جنھیں دیکھ کر شہر کا دھوکا ہوتا تھا۔ تیمور جانتا تھا کہ خوراک کی خاصی مقدار ضروری ہوگی اور وہ اس مہم میں خوراک کے بغیر جانا نہ چاہتا تھا۔

انھوں نے سمرقند کا دریا عبور کیا اور تیمور نے زین میں پلٹ کر دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ سمرقند کے مینار اور گنبد اسے نظر نہ آسکے۔

نومبر کا مہینہ تھا اور سخت سردی تھی جب وہ پہلی گھاٹی میں سے گزرے تو برف باری شروع ہو گئی۔ اس دن سے اس گھاٹی کا نام باب تیمور پڑ گیا۔ شمالی سطح مرتفع کی طرف سے تیز ہوا شروع ہو گئی۔ سردی سے ٹھٹھر کر انھوں نے معسکر ڈال لیا۔

جب دوبارہ روانہ ہوئے تو دنیا برف سے سفید ہو چکی تھی۔ زمین کے اوپر برف

جم چکی تھی اور راستہ برف سے اٹا ہوا تھا۔ کافی گھوڑے اور آدمی سردی سے مر گئے مگر تیمور نے پلٹنے سے انکار کیا۔

وہ جاڑوں کے لیے معسکر ڈالنے پر بھی رضامند نہ ہوا۔ شہر سنگ میں خلیل نے اپنے آدمیوں کو جاڑا ختم ہونے تک روک لیا تھا۔ بوڑھے فاتح نے اسے بتایا کہ وہ خود اُترار جو شمالی سرحد کا قلعہ ہے وہاں تک جانے کا قصد کر چکا ہے۔ اس نے اپنے پوتے کو مزید ہدایات دیں کہ جونہی راستہ صاف ہو جائے وہ اُترار میں آکر اس سے مل جائے۔ انھیں راستے کے اوپر نمدے کی چادریں بچھائی پڑیں تاکہ ان کے اوپر سے گاڑیاں اور اونٹ گزر سکیں۔ آدمی انھیں اپنے پاؤں سے دباتے، پھر گاڑیوں اور اونٹوں کی سیاہ لانبی لکیر آہستہ آہستہ اس میدان میں بڑھتی۔ سیر دریا پر برف کی تہ تین فٹ گہری تھی۔ وہ اس کے اوپر سے گزر گئے۔

پھر جاڑا پوری شدت سے آپہنچا۔ برف، بارش، کیچڑ اور باد تند و تیز۔ پہلی بار جب وہ سنہری غول کے خلاف بڑھے تو نہایت تیز رفتاری سے گئے تھے مگر اس مرتبہ وہ دن میں صرف چند میل سفر کرتے لیکن رخ اُترار اور ختا کی شاہراہ کی طرف ہی رہا۔ تیموری عَلَم آہستہ آہستہ پہاڑوں کے وسط کی طرف بڑھتے گئے۔ پہاڑوں کی گہری سیاہ گھاٹیاں اس برفباری اور دھند میں اور بھی سیاہ نظر آتیں۔ ان کی رفتار لادو جانوروں کی رفتار سے بھی کم تھی اور وہ اسی انداز سے ایک ایک قدم پر زمین کو محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھتے اور آخر کار شمالی میدانوں میں نمودار ہوئے۔ سامنے اُترار کی دیواریں تھیں۔ جاڑوں کے لیے پناہ گاہ۔

یہاں تیمور آرام کرنے کے لیے تیار تھا۔ جونہی موسم میں پہلی گرمی ظاہر ہوگی وہ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوگا۔

عین اس کے حکم کے مطابق مارچ ۱۴۰۵ء میں فوج پھر روانہ تھی۔ عَلَم بلند ہوئے۔

نقارے پر چوٹ پڑی اور رجمنٹیں معاینے کے لیے صف بستہ ہو گئیں۔ لشکروں کے سالار ہر شام امیر کی سلامی کے لیے اپنے بینڈ کو جمع کرتے اور نقاروں، شہنائیوں اور طبلوں کی آواز ہزاروں شہسواروں کے گھوڑوں کے سموں کی آواز سے مل کر امیر کو سلامی دیتی۔

مگر یہ سلامی مردہ امیر کے لیے تھی۔

تیمور کی موت اترار میں واقع ہو چکی تھی۔ اس کی وصیت پر عمل کرنے کے لیے یہ جم غفیر شمال کی راہ پر گامزن تھا۔ اس کے سفید گھوڑے پر زین کسا ہوا اور وہ تیموری علم کے نیچے اپنی جگہ موجود ہوتا۔ مگر زین میں کوئی نہ ہوتا۔

وقائع نگار نے تیمور کے آخری لمحات کی ایک جھلک پیش کی ہے۔ حصار کی چوبی دیواروں کے باہر امیر، سردار اور مختلف رتبوں کے افسر برف میں کھڑے تھے۔ دیوان میں بوڑھی ملکہ سرائے ملک خانم اپنے دربار کے ساتھ بیٹھی تھی۔ تیمور کی علالت کی خبر سن کر وہ سمرقند سے آئی تھی۔

تیمور کے کمرے کے دروازے کے باہر باریش علماء کھڑے تلاوت قرآن کر رہے تھے۔ وہ ہفتوں سے اسی طرح کھڑے شب و روز دعاؤں میں مصروف رہے تھے مگر ان کی دعائیں مستجاب نہ ہوتی تھیں سو نہ ہوئیں۔ ملک الاطباء عالم تبریز کہہ چکا تھا:

"اب کوئی چارہ نہیں۔ معیّن دن آ پہنچا ہے۔"

جھریوں سے پُر چہرہ سفید ہو چکا تھا۔ سفید بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ تیمور آخری وقت بھی ہوش و حواس میں تھا۔ اس نے امیروں کو اپنی آخری ہدایات دیں:

"اپنی تلواروں کو سنبھالے رکھنا۔ آپس میں اتفاق رکھنا۔ نفاق میں تباہی ہے۔ خطا کی مہم سے ہاتھ مت کھینچنا۔"

انگیٹھیاں اس کے سرھانے کے پاس سلگ رہی تھیں۔ فضا خاموش تھی۔ سامعین مبہوت تھے۔ اس کی آواز اب دھیمی سرگوشیوں سے زیادہ نہ تھی۔

"میری موت پر کپڑے پھاڑ کر پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنا شروع نہ کر دینا۔ اس طرح بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔"

نورالدین اور شاہ ملک کو اپنے قریب بلا کر کہا اور اپنی آواز بھی بلند کی۔

"میں جہانگیر کے پسر پیر محمد کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔ وہ سمرقند میں رہے اور اس کے ہاتھ میں فوجی اور انتظامی معاملات مکمل طور پر ہوں۔ میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم تاعمر اس کا ساتھ دینا اور اس کی امداد کرنا۔ سمرقند کی طرح مملکت کے دور دراز صوبے بھی اسی کے تحت ہونے چاہییں۔ جب تک تم پوری طرح اس کے فرمانبردار نہ ہوگے جانشینی کے لیے کشمکش پیدا ہو جائے گی۔"

ایک ایک کر کے تمام اعلیٰ امیروں نے اس کی وصیت پر عمل کرنے کا عہد کیا۔ انھوں نے درخواست کی کہ تیمور کے باقی پوتے بھی بلائے جائیں تاکہ وہ اس کے احکام خود سن لیں۔

اسے تذبذب اور دیر سے ہمیشہ نفرت رہی تھی۔ اس نے اپنی پرانی بےتابی کے رنگ میں کہا۔

"نہیں، یہ آخری دربار ہے۔ خدا کو یہی منظور ہے۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ "شاہ رخ کو ملنے کے بغیر اب میری کوئی خواہش نہیں۔ مگر یہ ناممکن ہے۔"

عمر بھر میں شاید پہلی بار اس نے یہ لفظ استعمال کیا تھا۔ فولادی قوتِ ارادی کا مالک جس نے عمر بھر پہاڑوں کو چیر کر اپنے راستے بنائے اور اس دنیا پر محض اپنی ہمت و استقلال سے چھایا رہا۔ آج دنیا سے جاتے وقت مطمئن تھا۔

چند امیر اپنے آنسو نہ روک سکے۔ عورتوں کی گریہ زاری کی آواز پاس کے کمرے سے آ رہی تھی۔ علماء امیر کے کمرے میں داخل ہوئے۔

لا الہ الا اللہ کی صدا بلند ہوئی اور دنیا کی سرکش ترین روح اپنے خالق کے حضور میں عجز و نیاز سے حاضر ہونے کے لیے پرواز کر گئی۔

مابعد

اس جدوجہد کا ماحصل

جس ہاتھ نے اتنی بڑی مملکت کے مختلف النوع ٹکڑوں کو جوڑ کر یکجا کر رکھا تھا وہ ہاتھ اب کچھ نہ کر سکتا تھا جس قوتِ ارادی نے اس شاہانہ شہر کو آباد کیا تھا وہ اب تاتاریوں کو عمل پر اکسانے کے لیے موجود نہ تھی۔

تاتاری امیروں کا شہنشاہ ہی نہ مرا تھا بلکہ وہ اپنا سب کچھ کھو چکے تھے تیمور ہی کی بدولت وہ اتنی طاقت حاصل کر سکے تھے۔ وہی ان کی رہنمائی کرتا رہا تھا اور مملکت کے نظم و نسق کی باگ ڈور تمام تر اسی کے ہاتھ میں رہی تھی۔ اس کی قیادت میں وہ آدھی دنیا کے مالک بنے تھے۔ ان میں سے اکثر ان لوگوں کے بیٹے تھے جنھوں نے تیمور کی خدمت اس کی زندگی کے مشکل دور میں کی تھی۔ ایسے بھی تھے جو تیمور کے وفادار ساتھیوں کے پوتے تھے۔ پچاس سال سے تیمور کے بغیر وہ کسی اور کے ارادوں سے واقف نہ رہے تھے۔

دارالسلطنت میں اور قومیں بھی آباد تھیں۔ یہاں سنہری غول کے مغل بھی تھے اور ترک و ترکمان بھی۔ یہاں ایرانی، افغان اور شامی بھی آباد ہو چکے تھے اور ابھی تک ان سب پر ایک قوم کا اطلاق نہ ہو سکتا تھا۔

تیمور کی موت کا اس قدر غم اور اس کے احکام کا اتنا احترام تھا کہ فوج اور شہر والوں نے ان سے انحراف کا خیال تک نہ کیا۔ اگر اس کا جانشین پیر محمد ہندوستان

نہ ہوتا ــــ خیال رہے کہ اترار سے ہندوستان ، پھر واپس سمرقند بہت بڑی مسافت ہے ــــ اور اگر شاہ رخ تیمور کا قابل ترین بیٹا خراسان میں اپنی علیحدہ حکومت کا متمنی نہ ہوتا۔ اور ساتھ ہی اگر تیموری امرا اپنے مالک کے احکام کے مطابق چین جانے پر بضد نہ ہوتے تو شاید یہ وسیع مملکت بچ جاتی۔

مگر جس عنانِ حکومت کو تیمور سنبھالے رہا تھا وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ امیر جو اترار میں موجود تھے، انھوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ تیمور کی موت عام نشر نہ کی جائے اور ایک نوجوان پوتے کو فوج کا کماندار چن لیا جائے۔ انھیں یہ امید تھی کہ چینی تیمور کی موت کی خبر ہرگز نہ باور کریں گے خصوصاً جب فوج چین کی دیوار پر موجود ہوگی اور انھیں چین فتح کرنے کا بھی پورا پورا یقین تھا۔

فاتح کی لاش شاہ رخ کے بڑے لڑکے الغ بیگ کی زیر کمان جہاں شہزادیاں منتظر تھیں وہاں بھیجی گئی۔ پیر محمد کی طرف قاصد فوراً روانہ کیے گئے۔ ضروری تھا کہ صوبوں کے حاکموں اور دیگر شہزادوں کو بھی اس خبر کی اطلاع دی جاتی۔ ان کی طرف بھی قاصد روانہ کر دیے گئے۔

مگر جلد ہی فوج کا کوچ روکنا پڑا۔ اطلاع ملی کہ میمنہ کے امیروں نے میراں شاہ کے لڑکے خلیل کو سمرقند کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور عہد دے چکے تھے۔ عین اسی وقت میسرہ کے کماندار نے اپنی فوجوں کو منتشر کیا اور خود سمرقند روانہ ہو گیا۔

اعلیٰ امرا نورالدین اور اس کے ساتھیوں نے ایک اور مجلس مشاورت منعقد کی۔ اب چین کا سفر جاری رکھنا بے سود تھا۔ جب مرکزی حکومت ہی میں انتشار پیدا ہو رہا تھا ملک کے باہر مہم بیکار تھی۔ وہ لوٹ پڑے اور تیز رفتاری سے سمرقند کو روانہ ہوئے۔ جلد ہی وہ دریائے سیر پر جنازے کے ساتھ مل گئے۔

جب وہ سمرقند پہنچے تو دروازے بند پائے۔ تیمور کا تابوت، سرائے ملک خانم

اور تیموری طبل و نقارہ کے باوجود شہر کے حاکم نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ وہ خلیل کی مدد کا عہد کر چکا تھا۔ اس نے امیروں کو لکھا کہ ہندوستان سے پیر محمد کے آنے تک کسی نہ کسی کو تخت پر بٹھانا ضروری تھا۔

نوجوان خلیل، شادی ملک کا چاہنے والا، اپنی والدہ خان زادی کی مدد سے متعدد امیروں سے حلف لے چکا تھا اور اب سمرقند پہنچ چکا تھا۔ سمرقند کے باشندے بے دست و پا بھی تھے اور الجھن کا شکار بھی۔ تیمور مملکت کی سرحد سے باہر فوت ہوا تھا اور انھوں نے اس کی وصیت کے متعلق صرف افواہ سنی تھی۔ اُدھر خلیل تخت پر جلوہ افروز ہو چکا تھا، تسلیم شدہ شہنشاہ۔

آزمودہ کار نورالدین نے نئے دربار کو ان الفاظ میں خط لکھا:

"ہمارے دل غمزدہ ہیں۔ دنیا کا طاقتور ترین شہنشاہ جس کی ذاتِ والا صفات سے اس جہان میں زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی، فوت ہو چکا ہے۔ جاہل، کم عقل نوجوان جنھیں اس نے کل خاک سے نکال کر عزت و دولت بخشی تھی، آج اس سے بدعہدی کر چکے ہیں۔ وہ اپنے فرائض کو بھول چکے ہیں۔ وہ امیر کے احکام اور اپنی قسموں کو بھی بھلا بیٹھے ہیں۔ ہم اس زبردست سانحے پر کس طرح اپنے غم کا اظہار کریں۔ وہ شہنشاہ جس نے دنیا کے بادشاہوں کو اپنا دربان بنایا اور جس نے فاتح عالم کا لقب پایا تھا، جونہی ہم سے جدا ہوا اس کی وصیت کو بھلا دیا گیا۔ غلام اپنے مربی آقاؤں کے دشمن بن گئے ہیں۔ ان کے ایمان کیا ہوئے۔ اگر پتھروں کے دل ہوتے تو وہ بھی آنسو بہاتے۔ ان بے وفا بدبختوں پر آسمان سے سنگ باری کیوں نہیں ہوتی؟

"جہاں تک ہمارا تعلق ہے انشاءاللہ ہم اپنے امیر کی وصیت ہرگز نہ بھولیں گے۔ ہم اس کی وصیت پر پوری طرح عمل کریں گے اور اس کے پوتوں نوجوان شہزادوں کی اطاعت کریں گے۔"

امیروں نے ایک بار پھر مشورہ کیا اور تیموری علم کے سایے میں جو شامیانہ نصب کیا تھا وہاں جاکر تیموری نقارہ توڑ ڈالا۔ جس نقارے نے انھیں بارہا فتح کی طرف بلایا تھا وہ اسے کسی اور شخص کے شامیانے کے سامنے بجتے نہ سننا چاہتے تھے۔

خلیل نے سب سے پہلے شادی ملک کے ساتھ نکاح کیا۔ کنیز اب ملکہ بن چکی تھی۔ ناتجربہ کار نوجوان شہزادہ حکومت و استبداد سے ناواقف تھا۔ اس کے تصرف میں بے اندازہ دولت تھی اور وہ خود حسین ایرانی نوساختہ ملکہ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ وہ محفلوں اور جشنوں کے لامتناہی سلسلے میں پڑ گیا۔ اب وہ شاعر بھی بن گیا اور اپنی محبوبہ کی شان میں نت نئی شاعری ہونے لگی۔ کچھ عرصے کے لیے تو دولت لٹانے کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز بن گیا اور اس کے ساتھیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ مگر اس نے تجربہ کار امراء کو برخاست کر دیا اور اپنے گرد اپنی پسند کے درباری اور امیر جمع کرنے شروع کر دیے۔ شادی ملک جس کی جان بوڑھی ملکہ سرائے خانم نے بچائی تھی۔ اب اپنی مربی کی دشمن بن گئی۔ سمرقند پاگل ہو گیا تھا۔ ہیرے جواہرات زمین پر بکھیر دیے جاتے تاکہ جو ڈھونڈے وہی اٹھالے۔ سمرقند کے فواروں میں سے پانی کے بجائے اب شراب ابلتی تھی۔

خلیل طاقت کے نشے میں مست تھا اور شادی ملک اپنا بدلہ لینے میں منہمک تھی۔ یوں ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہوا۔

پیر محمد ہندوستان سے آگیا مگر خلیل کی فوج کے ہاتھوں شکست کھائی۔ امراء اب آپے سے باہر تھے۔ فوج کا جو حصہ ان کے ساتھ وفاداری سے رہا اسے لے کر انھوں نے سمرقند پر حملہ کیا اور نئے امیر کو شکست دی۔ اسے قید کر دیا گیا اور برسرِ عام شادی ملک کی رسوائی ہوئی۔

تیمور کی موت کے ساتھ ہی تیموری مملکت ختم ہو چکی تھی۔ اب اسے یکجا رکھنے کی امید خیالِ خام تھا۔

شاہ رخ اب تک سمرقند کے معاملات سے بے پروا رہا تھا۔ اس افراتفری نے اسے بھی عمل پر اکسایا۔ وہ خراسان سے ماوراء النہر پر بڑھا اور سمرقند پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد ماوراء النہر اسی کے پاس رہا۔ سمرقند کی دولت اب پہلی سی نہ رہی تھی مگر جو کچھ بھی بچا تھا وہ اس نے اپنے بیٹے اُلُغ خاں کے حوالے کیا۔ دونوں کی کوششوں سے مملکت کے مرکزی حصے ہندوستان سے عراق تک محکم رہے۔

یہ دونوں صلح کُن طبائع کے مالک تھے۔ علم و ادب پرور اور شعر و سخن نواز تھے۔ تیمور جب برباد کر چکتا تو اس کی طبیعت کا ایک رُخ اسے تعمیر پر اکسایا کرتا تھا۔ ان دونوں نے تیمور کی طبیعت کا یہی رُخ ورثے میں پایا تھا۔ وہ جنگ سے احتراز کرتے تھے مگر اتنی عقل ضرور تھی کہ اپنے دفاع کے انتظامات رکھتے تھے۔ ان کے درباروں میں آزمودہ کار سپاہی موجود رہتے۔ جب چاروں طرف بربادی و بدامنی کا دور دورہ تھا ان کے شہر امن و سکون اور پناہ و سلامتی کے خوشنما جزیرے نظر آتے تھے۔

شاہ رُخ اور اُلُغ بیگ کی سرپرستی میں خوشحالی کا دور از سرِ نو شروع ہُوا۔ ریگستان میں نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ایران کے معماروں، فنکاروں اور شاعروں نے خوب فروغ پایا۔ شاہ رخ اس خاندان کا آگسٹس تھا اور اُلُغ بیگ مارکس آریلیس۔ اُلُغ بیگ خود بھی نہایت بلند پایہ منجم، جغرافیہ دان اور شاعر تھا۔ اس نے سمرقند کی مشہور رصدگاہ تعمیر کی اور علوم و فنون کی ترقی میں مصروف رہا۔ یہی اصل تیموری خاندان کہلاتا ہے۔ اس عصر میں چین کے منگ خاندان کے سوا دنیا میں ایسا کوئی خاندان نہیں جو ان کے رُتبے کے قریب بھی پہنچ سکتا ہو۔

ان دونوں کے کارناموں نے تیمور کی خواہشات کی تکمیل کسی حد تک ضرور کی۔ اس لیے کہ سمرقند اب عروس البلاد تھا۔ ایشیا کا روما مگر وہ الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ تیمور کی موت کے بعد جو خانہ جنگی واقع ہوئی تھی اس نے بین براعظمی تجارت کی شاہراہوں کا رخ بدل دیا

تھا۔ ۱۴۰۵ء سے مشرق کے ساتھ سمندری الحاق کے زمانے تک ایشیا کا بیشتر حصہ یورپ
سے الگ ہو گیا۔ اب یہاں سیاحوں کا گزر نہ ہوتا تھا۔ سمرقند نے اب لاآسا کی صورت
اختیار کر لی تھی۔ اپنی علیحدگی میں خوش۔ اجنبیوں کے لیے ممنوع۔ انیسویں صدی میں کہیں
جا کر روسی فوج وہاں تک پہنچی اور سائنسدان جوق در جوق وہاں پہنچے کہ جو بازنطینی کتب خانہ
تیمور وہاں سے گیا تھا اس کی تلاش کریں مگر ان کی جستجو بیکار نکلی۔

امتداد زمانہ، جاڑوں کی کہر اور گرمیوں کی گرد و خاک نے زلزلوں اور طوفانوں کی
مدد سے ریگستان اور بی بی خانم کی عالیشان عمارتوں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیا تھا۔
جن دیواروں کو تیمور نے ابدی پائداری دینی چاہی تھی وہ سال بہ سال گر رہی تھیں۔ آج بھی
سیاح اس مرکزی میدان تک نہیں پہنچ سکتا جسے لارڈ کرزن نے بھی دنیا کا عالیشان ترین
میدان کہا تھا۔ اس کے باوجود ان صدیوں نے ان کھنڈروں کو وہ شاندار کہنگی اور زرسودگی
عطا کی ہے جو ہر شہر کا خاصہ نہیں۔

تاتاریوں کے اس شاندار عہد کا ادب اب تک دوسری زبانوں میں ترجمہ نہیں
ہوا اور اس لیے اس کی پوری نوعیت ابھی معلوم نہیں۔ شاہ رخ اور الوغ خان کے
پوتے اور پرپوتے ایک نئی عظمت کا باعث بنے۔ وہ سمرقند چھوڑ کر ہندوستان پہنچے
اور وہاں انھوں نے ایک نئے خاندان کی بنا ڈالی جسے دنیا عظیم مغل خاندان کے نام
سے جانتی ہے۔

چنگیز خاں کے وجود کی طرح تیمور کی مغربی مہم نے بھی دنیا کا نقشہ بدل دیا اور یورپ
کے مستقبل پر عجیب و غریب اثر ڈالا۔

اس نے براعظموں کے درمیان از سر نو تجارتی شاہراہیں کھول دیں جو ایک سو سال
سے بند پڑی تھیں۔ تیمور نے ایشیا کو جو امن بخشا اس سے تبریز یورپ کے تاجروں کی
پہلی منزل بن گیا اور الگ تھلگ بغداد نے وہ پہلی سی اہمیت کھو دی۔ اس کی موت کے

بعد جو کشمکش اور بدامنی شروع ہوئی اس کی وجہ سے یہ تجارت پھر کم ہوگئی اور یورپ کو دوسرے راستے ڈھونڈنے کا خیال پیدا ہوا۔ کولمبس اور واسکوڈی گاما کی سمندری کوششوں کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی تھی۔

سنہری غول برباد ہو چکا تھا اور روسی اپنی آزادی حاصل کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ ایران میں مظفروں کا خاتمہ ہو چکا تھا اور دو صدیوں کے بعد شاہ عباس کے زیر اقتدار ایران بجائے خود ایک بڑی مملکت بن گیا۔ عثمانی ترکوں کا زور ٹوٹ چکا تھا اور وہ منتشر ہو چکے تھے مگر یورپ اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے اس قدر بے کار و بے مصرف تھا کہ ترکوں نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ باقی ماندہ کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ مصر کے مملوک سلطان کو اپنی وفاداری کا حلف بہت جلد بھول گیا۔ وہ عجیب الخلقت جوڑا، کارا یوسف اور سلطان احمد بہت جلد عراق لوٹ آئے اور از سر نو فتنہ و فساد شروع کر دیا۔

فوج کا کچھ مغل اور تاتاری عنصر نورالدین اور دوسرے امیروں کی سرکردگی میں شمالی سطح مرتفع اور سرحدی قلعوں کی طرف چلا گیا جہاں ان کی اولاد کے قبیلے آج بھی کرغز اور کلموک تاتاریوں کے نام سے اپنے گھوڑوں اور بھیڑوں کے ریوڑ چراتے پھرتے ہیں۔ تیمور کی موت نے توران کے خود پوش سپاہیوں کو جنوب کے متمدن عمامہ پوش ایرانیوں سے جدا کر دیا۔

جہاں تک علمائے اسلام کا تعلق ہے وہ اس صدمے سے آخر تک نہ سنبھل سکے۔ تیمور کی موت کے ساتھ ہی بین الاقوامی خلافت کا خیال بھی بھلا دیا گیا۔ علمائے اسلام کو امید تھی کہ تاتاری فتوحات سے ان کی طاقت کو عروج مل جائے گا مگر انھیں بعد میں معلوم ہوا کہ تیمور کی فتوحات نے اسلام کی بنیادیں ہی اکھاڑ پھینکی تھیں۔ تیمور کے منصوبے علماء کے مشوروں کے مرہون منت نہ ہوتے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ

ان کے مشوروں کی قدر بھی نہ کرتا تھا۔

ایران کی نئی حکومت فرقہ وار تھی اور اسے عثمانیوں سے ہمیشہ اختلاف رہتا۔ تیمور کی اولاد، ہندوستان کے مغل تیمور کی طرح برائے نام مسلمان ہوتے تھے البتہ وہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری سے پیش آتے تھے۔ قاہرہ کا خلیفہ برائے نام بغداد کے امیرالمومنین کا سایہ سمجھا جاتا تھا جو بغداد میں رنگ رلیاں منانے میں شب و روز منہمک رہتا تھا ممکن ہے کہ اب دنیا کے مسلمانوں کو سیاسی وحدت میں ڈھالنے کی قدرت انسان کی دسترس سے بالاتر ہو۔

تیمور کے بعد کسی انسان نے دنیا پر چھا جانے کی کوشش نہ کی اس کی فتوحات سکندر کے کارناموں کے مساوی ہیں۔ سکندر سائرس کے عین بعد آیا تھا اور تیمور بھی اسی طرح چنگیز خاں کے بعد آیا۔ اسے فاتحوں کی صف کا آخری نمائندہ ہونے کا فخر ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اب کوئی انسان تلوار کے زور سے اتنی طاقت حاصل کر سکے۔

اگر آپ ایشیا میں کسی سے بھی پوچھیں تو آپ کو یہی جواب ملے گا کہ دنیا کو تین آدمیوں نے فتح کیا ہے۔ سکندر اعظم۔ چنگیز خاں اور تیمور۔

سمرقند جانے والے سیاح کو درختوں کی چوٹیوں کے اوپر سے ایک بہت بڑا گنبد نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں یہ گنبد اب بھی سبز ہے۔ اور فیروزی رنگ کی ان اینٹوں پر جب سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں تو ان میں اب بھی چمک پیدا ہوتی ہے۔ دیواروں کی اینٹوں میں روسی سپاہیوں کی گولیوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ ایک محراب کے سوا باقی سب کھنڈر بن چکے ہیں۔

حجرے میں تین معمر ملا بیٹھے ہونگے۔ اگر سیاح چاہے تو ان میں سے ایک شمع جلا کر اسے اندرونی کمرے میں لے جائے گا۔

پتھر کی جالیوں کے اندر دو قبریں ہیں۔ ایک پر سفید اور دوسرے پر سیاہی مائل گہرا سبز

سنگِ تربت لگا ہُوا ہے۔ سفید سنگ تربت والی قبر تیمور کے دوست عالم دین میر سید کی ہے۔ ملا سیاح کو بتائے گا کہ سیاہی مائل پتھر یشب سبز ہے جو ایک مغل شہزادی نے بھیجا تھا۔ اس کے نیچے تیمور سو رہا ہے۔

اگر سیاح پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، عمامہ باندھے ملا سے پوچھے کہ تیمور کون تھا تو وہ ٹمٹماتی شمع کی روشنی میں ذرا سی دیر سوچے گا اور غالباً یوں گویا ہوگا۔

"حضرت! ۔ مگر میں اسے نہیں جانتا۔ وہ میرے زمانے اور میرے باپ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے ہو گزرا ہے۔ اسے ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ مگر سچ ہے وہ حقیقی معنی میں امیر تھا۔"

چوتھا حصّہ۔ حواشی

(۱)
میدانِ جنگ میں عقلمند عالم

تیمور تقریب قریب مسلسل کوچ میں رہتا تھا۔ وہ عام طور پر اپنے دربار کا ایک حصہ مہمات پر اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ عرب شاہ لکھتا ہے کہ شام کے وقت وہ اکثر کتابیں پڑھوا کر سنتا۔ بیشتر کتابیں تاریخ سے متعلق ہوتی تھیں۔ سنہری غول کے خلاف مشکل ترین مہمات میں بھی ایک نہ ایک شہزادی اس کے ساتھ ہوتی۔ ہند کی مہم میں جب سلطان محمود شہنشاہ دہلی اور اس کے ہاتھیوں سے مقابلہ ہونے والا تھا فوج میں اک گونہ اضطراب تھا۔ شرف الدین لکھتا ہے:

"فوج ہندوستانی فوج سے چنداں خائف نہ تھی۔ البتہ انھوں نے ہاتھی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تیر اور تلوار ان پر اثر نہیں کر سکتے اور جنگ میں وہ گھوڑے اور سوار دونوں کو ہوا میں اچھال کر پھینک دیں گے جب مقامات تقسیم کیے گئے اور امیروں اور افسروں کو اپنی اپنی جگہ مامور کیا گیا تو تیمور نے عالم فاضل لوگوں سے پوچھا کہ وہ لڑائی کے میدان میں کون سی جگہ پسند کرینگے۔

"ان باعلم اصحاب میں سے جو ہاتھیوں کے متعلق سن چکے تھے، اکثر نے جواب دیا "اگر امیر قبول فرمائیں تو ہم عورتوں کے قریب رہنا پسند کرینگے۔"

تیمور فوج کے اس خوف سے باخبر تھا اور اس نے ہاتھیوں کے مقابلے کے پورے پورے انتظامات کر لیے تھے۔ محاذ کے وسط میں ایک گہری خندق اور پشتہ تیار کیا گیا اور اس کے پیچھے لوہے کی ڈھالیں گاڑ کر اسے مضبوط بنایا گیا۔

سلاخیں زمین میں گاڑی گئیں اور ان کے سروں کے ساتھ سرشاخی کنڈیاں جڑی گئیں سلاخوں کے ساتھ ساتھ قطاریں بھیتیں باندھی گئیں۔ ان کے سینگوں کے اوپر جھاڑیوں اور بھوسے کی گٹھڑیاں باندھ دی گئیں تاکہ جب ضرورت پڑے انھیں آگ دے دی جائے۔ مگر ان دفاعی تدابیر کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ ۔۔۔۔

(۲)

مشرق و مغرب کی کمانیں

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایشیا کا سوار تیر انداز ہلکی کمان استعمال کرتا تھا جو یورپ کی وزنی زرہ کے مقابلے میں بے کار ثابت ہوئی۔ دراصل ترک، تاتار اور مغل سبھی چھوٹی اور بڑی دونوں قسم کی کمانیں استعمال کیا کرتے تھے۔

تیمور اور چنگیز کے زمانے میں سوار کے پاس دونوں کمانیں ہوتی تھیں۔ بڑی کمان پیادہ ہو کر لڑنے کے لیے جس سے دشمن کا زیادہ نقصان مقصود ہوتا تھا۔ اور چھوٹی کمان حملے کے دوران میں تیر اندازی کے لیے جب سوار گھوڑے کی پیٹھ پر موجود رہتا۔ کمان ان کا عزیز ترین ہتھیار تھی اور جب تک گھوڑوں اور آدمیوں کا گھمسان نہ ہو جاتا وہ اس کا استعمال بند نہ کرتے۔ ہمعصر یورپی مؤرخ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایشیائیوں کی تیر اندازی ازحد نقصان دہ ثابت ہوتی تھی اور بیان کرتے ہیں کہ "لڑائی" شروع ہونے سے پہلے ہی بہت سے گھوڑے اور جوان مارے جاتے تھے۔

تاتاریوں کے پاس مختلف لمبائی اور وزن کے تیر ہوتے تھے۔ تیروں کی نوک بھی مختلف اقسام کی ہوتی تھی۔ کچھ تو زرہ کو چیرنے کے لیے بنائے گئے ہوتے۔ اور کچھ تیری بم اور نارِ رومی پھینکنے کے لیے۔ مصنف نے مانچوؤں کے پیکن گارڈ کے امیدواروں کی شرطی کمانیں دیکھی ہیں۔ ان میں بارہ "طاقتوں" یعنی ایک سو چھپن پاؤنڈ

کے کھچاؤ کی کمانیں شامل تھیں۔ یہ خاصی وزنی تھیں اور ان کی لمبائی پانچ فٹ سے زائد تھی۔
زیادہ سے زیادہ فاصلے پر تیر ترک سفارت متعینہ انگلستان کے ایک فرد نے
۱۷۹۵ء میں پھینکا تھا۔ اس کا فاصلہ ۴۶۷ یا ۴۸۲ گز تھا۔ چند سال ہوئے ایک تیرانداز
نے قریب قریب اتنے ہی فاصلے پر تیر پھینکا تھا مگر اس نے بھی ترکی کمان استعمال کی تھی۔
منجنیق اور گوپیا خیری طاقت کے حامل ہوتے تھے اور نہایت وزنی ہوتے تھے مگر مغل اور
تاتاری انھیں مختلف حصوں میں بانٹ کر باربرداری کے جانوروں پر سے جایا کرتے تھے۔
ان کا انضباط بے لچک تھا۔ وہ لڑائی کی تدبیرات کے ماحول میں پیدا ہوتے اور پروان
چڑھتے تھے۔ فوج سے باہر بھی ان کی زندگی مسلسل لڑائی سے شناسا رہتی۔ ان کے قائد
وہی بنتے جو لڑائی کے ڈھنگ اور اصول وارکان کی واقفیت میں کما حقہ ماہر ہوتے۔ ہتھیار
کارگر، انضباط اعلیٰ وارفع، سپاہی جنگجو اور فطرتاً تدبیرات سے واقف اور قائد قابل و با تدبیر۔
جب ایشیا کی یہ فوجیں یورپ کے خام شکروں اور نا اہل لشکر سالاروں کے مقابلے پر آئیں
تو اس کا نتیجہ یورپ کے حق میں پے بہ پے شکست کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ درست کہ
عیسائی سپاہی کا جذبہ نہایت بلند ہوتا تھا مگر جب وہ میدانِ جنگ کا رخ کرتا تو
اس طرح جاتا جیسے ایک بڑے ٹورنامنٹ میں شامل ہو رہا ہے۔ وہ نہایت آرام
سے کوچ کر کے وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اور بے روک ٹوک وہاں اپنا معسکر قائم کرنا چاہتا
تھا۔ پھر وہ نہایت آرام سے تیار ہو کر ایک مرد گھنٹے کی دست بدستی لڑائی میں شریک
ہونا چاہتا تھا۔ اہلِ یورپ کے ذہن میں انفرادی لڑائی کا تصور تو ضرور تھا مگر جنگ کے
وسیع تخیل سے وہ ابھی آشنا نہ ہوئے تھے۔ توپخانے کی تیاریاں، شبخون اور ہارے
ہوئے دشمن کا تعاقب جو مخالف فوج کو کاملاً تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ان
کے ذہن سے ابھی دور تھے اور وہ ان باتوں سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح ایامِ
جاہلیت کے لوگ بدشگونیوں اور آسیب سے خوف کھاتے ہیں۔ یورپی سپاہی لڑائی

میں جان دے دیتا اور بے وجہ بھاگتے ہوئے بھی مارا جاتا مگر اکثر و بیشتر اسے اپنے ہتھیار استعمال کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ ان کے قائد تزویرات جنگ سے کلیتہً ناواقف تھے اور بعض اوقات تو جب وہ دیکھتے کہ اب میدان ہاتھ سے جا رہا ہے اپنی جان بچانے کی غرض سے اپنے سپاہیوں کو وہیں چھوڑ دیتے۔ مثال کے طور پر ۱۲۴۱ء میں ہنگری کے بادشاہ بیلا اور ۱۳۹۹ء میں لیتھوانیا کے ڈیوک وٹولڈ کے واقعات ہیں۔

۱۲۲۱ء میں چنگیز خاں کے سپاہ سالاروں کے ہاتھوں روس کی شکست سے لے کر لوئی فرانس کے مملوکان مصر کے ہاتھوں شکست اور بایزید کے سامنے یورپ کے سرداروں اور شہسواروں کے خاتمے تک ایشیائی علم بلند رہے۔ اس عرصے میں چند مستثنیات بھی تھیں یعنی کیٹالانیوں کی پیشہ ور فوج جس کے رہنما بھی تجربہ کار تھے اس کا ۱۳۰۹ء میں قسطنطنیہ کے ارد گرد کامیاب ہونا اور ہسپانیہ میں عربوں کی شکست۔

ان پُر شکست صدیوں میں یورپی افواج کے پاس صرف ایک ہتھیار کارآمد تھا۔ وہ ٹیڑھی کمان تھی اور مغل و تاتاری اسے وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مگر سوا محاصروں کے وقت اور بعض اوقات وینس و جنیوا والوں کے ہاتھوں میں کارآمد ثابت ہونے کے اسے ایشیا و یورپ کی کشمکش میں استعمال نہ کیا گیا تھا۔ لانبی کمان اولین صلیبی جنگوں میں استعمال نہ کی گئی تھی۔ اور اس کے اثر کا زمانہ ۱۳۰۰ء سے ۱۴۵۰ء تک کا ہے جب کریسی اور آگن کورٹ عہد میں وہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔

مصنف سے یہ سوال کیا گیا ہے کہ انگریز تیر انداز اس عہد کے تاتاری سوار تیر انداز سے کس طرح ٹکر کھاتا ہے۔ مصنف صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ میدان جنگ میں ایک دوسرے کے مقابلے پر کہیں بھی نہ آئے تھے اس لیے اب صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ ایک دوسرے کے مقابل آ جاتے تو کیا نتیجہ نکلتا۔

انگریزی لانبی کمان کی مار بھی اتنی ہی تھی جتنی تاتاری کمان کی۔ دو سو سے تین سو گز تک نشانہ کُن اور انگریز سوار بھی اپنی کمان اسی سرعت سے چلا سکتا تھا جس سے تاتاری۔ تیمور کے سپاہیوں کی زرہ اتنی مکلف نہ تھی جتنی فرانسیسی سواروں کی تھی۔ مگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس ہوشمندی سے فرانسیسی نائٹ ہلہ بول دیتے تھے اس طور پہ تاتاری سوار تباہی کا سامنا ہرگز نہ کرتے۔

انفرادی جرأت اور طاقت یا تیر اندازی کے کمال کے سوا انگریز سپاہی تاتاری سے مقابلہ کرنے کے لیے ٹیوٹانک نائٹوں اور سینٹ جان کے نائٹوں سے چنداں بہتر نہ تھے۔ تیار شدہ فیر اور پہلوؤں اور عقب پر سنگین حملوں کے خلاف بلیک پرنس کا حشر بھی وہی ہوتا جو اس کے یورپی پچیرے بھائیوں کا ہوا تھا۔

---

(۳)

شعلہ بار

یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ تیموری فوج مختلف قسم کے شعلہ باروں کا استعمال کرتی تھی۔ ہمعصر تاریخیں اس ہتھیار کی نوعیت اور ساخت کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ اور تراجم سے "آگ کا برتن" کے سوا کچھ ظاہر نہیں ہوتا۔

یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ تیمور سے صدیوں پہلے چینی بارود کو جنگی استعمال میں لا چکے تھے۔ عام طور پر اس بات کو محسوس نہ کیا جاتا تھا کہ چینی بارود کے جنگی اثر سے بھی ناواقف نہ تھے۔ اس کے متعلق بہت سے حوالہ جات موجود ہیں۔ چینی وقائع نگار کیفنگ کے محاصرے کے متعلق لکھتا ہے۔ یہ محاصرہ مغلوں نے ۱۲۳۲ء میں کیا تھا:

"چونکہ مغلوں نے زمین دوز خندقیں کھود لی تھیں جن میں وہ ہمارے ہتھیاروں سے محفوظ تھے ہم نے فیصلہ کیا کہ چن تن کی نامی مشین (ایک قسم کا شعلہ بار) کے لوہے سے

مضبوط جکڑ دیں۔ پھر ہم نے اس کو ان جگہوں کے نیچے کیا جہاں مغل خندق کن تھے۔ ان کے آدمی اور ان کی ڈھالیں ان سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔"

مغلوں نے اس قسم کی چینی ایجادات کا استعمال کیا اور ۱۲۲۰ء میں جب چنگیز خاں مغرب پر حملہ آور ہوا تو اس کے ساتھ چینی توپچیوں کی بڑی تعداد تھی اور اس کے پاس "ہو پاؤ" نام کے ہتھیار تھے جو ایک قسم کے شعلہ بار تھے۔ تیمور کے تاتاری ان سے واقف تھے۔ وہ ایرانیوں اور عربوں کے استعمال نفت سے بھی واقف تھے۔

صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں نے متعدد ایجادات کا استعمال کیا۔ مثلاً ایک آتشی گرز ایجاد کیا گیا جس کے سر پر شیشے کا گیند سا ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فلیتہ ملحق ہوتا تھا جسے آگ دے کر گرز کو دشمن کی طرف پھینکا جاتا تھا اور بعض اوقات اس کا سر دشمن کی زرہ سے ٹکرا کر توڑا جاتا تھا۔ شیشے کے پھوٹنے سے آتشیں نفت دشمن کے بدن پر پھیل جاتا۔ ان کے منجنیق اور گوپیے نفت اور نار رومی سے پُر وزنی گولے دشمن پر پھینکا کرتے۔ ان کا استعمال عام طور پر محاصروں میں ہوتا۔

ایک محاصرے کی دردناک سی کہانی کہی جاتی ہے۔ اس محاصرے میں صلیبیوں نے قلعے کی دیواروں کے باہر اونچے اونچے چوبی مینار تعمیر کر لیے تھے۔ عرب محصورین نے مشینوں سے ان میناروں کے اوپر ایک مائع شے پھینکی جس سے مینار اور سب آدمی تو بھیگ گئے مگر اس سے کچھ نقصان نہ ہوا۔ صلیبیوں نے محصورین کی ان ناکام کوششوں پر خوب قہقہے بلند کیے مگر عرب برابر اس مائع شے سے مینار کو بھگوتے رہے۔ آخر ایک جلتی ہوئی مشعل باہر پھینکی گئی اور معاً بھڑک کر تمام مینار شعلہ بدامن ہو گئے۔ یہ مائع شے نفت تھا۔

لہ مکمل تفاصیل کے لیے جان ہیرٹ کی کتاب "عہد قدیم کے ہتھیار" اور کپتان فاوے اور

انقرہ

تیمور کی سپاہیانہ خصوصیات غیر معمولی تھیں مگر اس کا صحیح مقام اسے آج تک نہیں دیا گیا۔ یورپی مصنفوں نے انقرہ کی لڑائی کے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ تمام کے تمام متعصبانہ ہیں۔ ان کی ماخذ بیشتر عثمانی اور یونانی کتب تھیں اور تاتاری بیانات کی طرف بالکل رجوع نہ کیا گیا تھا۔ پروفیسر کریزی کی مرتب کی ہوئی فان ہیمر کی کتاب "دنیا کی پندرہ فیصلہ کن جنگیں" وہ عام طور پر سامنے رکھتے تھے۔ اس کتاب کے بنیادی نقاط کچھ اس طرح ہیں:

"عثمانی معسکر میں جو بڑی تعداد تاتاری سپاہیوں کی تھی ان کی طرف جاسوس روانہ کیے گئے اور انھیں اس بات پر اکسایا گیا کہ چونکہ تیمور ہی تاتاریوں کا واحد اور اصلی سردار تھا اس لیے اس کے خلاف نہ لڑیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باجزات[1] نے ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں کے ساتھ اپنے سے بہت بڑی تعداد کے تیموری لشکر کے خلاف پیش قدمی کی جو اس وقت سیواس میں تھا مغل شہنشاہ نے اپنی فوجوں کو اس طرح حرکت دی کہ لڑائی ایسی زمین پر ہو جہاں سوارہ کا استعمال ہو سکے اور جہاں اس کی زیادہ تعداد بھی استعمال میں لائی جا سکے۔ تیز رفتار اور زمین کے مدبرانہ استعمال سے وہ باجزات سے بچ کر قیصریہ اور کرچ شہر کے راستے انقرہ کے شہر کے سامنے میدانی علاقے میں پہنچ گیا۔ جیسا کہ اس کا اندازہ تھا عثمانی سلطان جلدی سے انقرہ کو بچانے کے لیے

حـ۔ ایم۔ رینالڈ کی کتاب LE FEU GREGEOIS ملاحظہ کیجیے۔

[1] ہیمر نے بایزید کو باجزات لکھا ہے۔ ترکی حروف تہجی میں بھی قریب قریب اسی طرح ہے "باجزیت"۔ وہ تیمور کو بھی مغل حکمران کہتا ہے۔

لوٹ آیا . . . . . باوجودیکہ تعداد کے لحاظ سے اس کا پلّہ بہت بھاری تھا مغل شہنشاہ نے جنگی حفاظتی تدابیر کا بہت زیادہ خیال رکھا . . . ایسا معلوم ہوتا ہے کہ . . . باجزات اپنی پرانی اور آزمودہ کار سپہ سالاری کے داؤ بھول گیا تھا . . . . پہلے تو اس نے تیمور سے شمال کی جانب معسکر لگایا۔ مگر پھر اپنے دشمن کی طرف سے نفرت کا اظہار کرنے کے لیے قریب ہی اونچے مقام پہ اپنی فوج لے گیا اور وہاں بہت بڑے شکار میں مشغول ہو گیا۔ بدقسمتی سے جس مقام پر اس نے آخری تعاقب کیا تھا وہاں پانی کی قلت تھی اور اس کے پانچ ہزار سپاہی پیاس اور تھکان سے مر گئے۔ اتنی بڑی غلطی کے بعد باجزات دشمن کی طرف پلٹ آیا مگر واپسی پر اسے معلوم ہوا کہ جو معسکر وہ چھوڑ کر گیا تھا اس میں اب دشمن بیٹھا ہوا ہے۔ اور پانی کی ندی جس سے عثمانی فوج پانی لے سکتی تھی اس پر بند باندھ کر اس کا رخ تیمور نے بدل دیا تھا۔

"اب باجزات لڑائی شروع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مغل فوج کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی تعداد آٹھ لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ اتنا صحیح ہے کہ وہ باجزیت کی فوج سے بہت زیادہ تھی جو میدان میں ایک لاکھ سے زائد آدمی نہ لایا تھا۔ صرف تعداد ہی نہیں بلکہ جذبہ، ہتھیاروں اور کمان کی خوبی میں بھی مغلوں کا پلّہ بھاری تھا۔"

فان ہیمر اور کریزی مزید لکھتے ہیں کہ عثمانی فوج کے بہت سے ایشیائی شہزادے تیمور سے مل گئے اور صرف سربی سپاہی اور جنیسری جم کر لڑے اور صرف وہی مغل فوج کے حملوں کو کسی قدر روکنے میں کامیاب ہوئے۔

اسی بیان کی صحت قبول کرتے ہوئے لین پول اپنی کتاب "ترکی" میں یوں رقمطراز ہوتا ہے:

"ایک طرف تو تھکے ماندے پیاسے سپاہی تھے جو تعداد میں کم اور اپنے افسر سے بددل تھے۔ دوسری طرف ایک بے پناہ غول جسے چیدہ چیدہ مقامات پہ متعین کیا گیا

تھا جن کے سپہ سالار غیر معمولی تھے۔ جہاں کوئی بھی جنگی حفاظتی تدبیر نظر انداز نہ کی گئی تھی۔ اور تعداد، انضباط اور جسمانی حالت کے تمام فوائد جن کے حق میں تھے۔ جنیسریوں اور سربوں کی جرأت تیمور کی تعداد کے سامنے بے اثر ثابت ہوئی اور نتیجہ مکمل بھگدڑ کی صورت میں ظاہر ہوا۔"

لڑائی کے متعلق لین پول نے نولز کی عجیب و غریب شخصیت کا حوالہ دیا ہے جس نے اس بارے میں سنہ ١٦٠٣ء میں کچھ لکھا تھا۔

ترکی فوج کا یوں بیابانی علاقے میں عین تاتاریوں کی نگاہوں کے سامنے شکار کے لیے استعمال کیا جانا بعد کے ترک مؤرخوں کی اختراع ہے۔ جن کے پیش نظر سلطان کی شکست کی خاطر خواہ وجہ بیان کرنا تھی۔ اس کی تائید میں کوئی ہمعصر روایت موجود نہیں۔ عقل کہتی ہے، اگر بایزید اتنا اندھا تھا کہ عین دشمن کے سامنے شکار کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا تو تیمور اسے کسی طرح لوٹ آنے کا موقع نہ دیتا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ خان ہیمر۔ کریزی اور لین پول جیسی شخصیتیں اس کہانی کو مان گئی ہیں۔

بایزید کے تاتاری ساتھیوں کی بے وفائی کے متعلق تاتاری تذکروں میں کہیں ذکر نہیں کہ تیمور نے اطاعت بدلنے والے سرداروں کی طرف جاسوس یا نمائندے روانہ کیے تھے۔ سیاہ پوش تاتاریوں کے ایشیائے کوچک منتقل ہو جانے کا بھی کہیں ذکر نہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ بایزید کی فوج میں شامل تھے اور عین لڑائی کے بعد بھی تیمور اور ان کے درمیان نامہ و پیام ہوتے رہے اور آخر وہ انھیں جبراً اپنے ساتھ سمرقند لے گیا۔

جہاں تک تیمور کے آٹھ لاکھ غول کا تعلق ہے یہ اصلاً غلط ہے۔ اس تعداد کی فوج نہ تو ایشیائے کوچک میں زندہ رہ سکتی تھی اور نہ اتنی بڑی فوج جنگی حرکات ہی کے قابل ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں عثمانی تذکرے صاف کہتے ہیں کہ بایزید تاتاری فوج کو اس وقت تک نہ دیکھ سکا تھا جب تک وہ اس کا پہلو بچا کر نکل نہ گئے تھے۔ کہیں

بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے یہ ظاہر ہو کہ تیمور نے کسی بھی مقام پر دو لاکھ سے زائد فوج مجتمع کی ہو۔ تاتاری تذکرے تعداد کا ذکر ضمناً کرتے ہیں۔ مثلاً ایران کی مہم میں بہتر ہزار کا ذکر ہے۔ ہندوستان کی مہم میں ایک لاکھ اور تیمور کی آخری مہم یعنی چین کے خلاف دو لاکھ کی تعداد درج ہے۔

جب تیمور نے ایشیائے کوچک میں پیش قدمی کی اس وقت وہ مسلسل چار سال سے لڑائی میں مصروف رہا تھا۔ شہزادہ پیر محمد کے آنے کے بعد بھی سمرقند میں فوج چھوڑی گئی تھی اور طویل مواصلی خطوط کی نگہداشت بھی از حد ضروری تھی۔ ایک سپاہ تبریز میں تھی اور کچھ لشکر شام میں بھی چھوڑے گئے تھے۔ سرداروں اور امیروں کی فہرست جو انقرہ کی لڑائی سے متعلق مرتب کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کی تعداد اسی ہزار اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار کے درمیان تھی۔

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ بایزید کی فوج کی تعداد زیادہ تھی۔ اگر یوں نہ ہوتا تو ابتدائی مراحل میں تیمور دفاعی تدابیر ہرگز نہ اختیار کرتا۔ جو لنز یہ بھی لکھتا ہے کہ ترک نیم دائرے کی شکل میں آگے بڑھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے بازو تیمور فوج کے بازوؤں کے باہر پھیلے ہوئے تھے اور یہ امر بھی ترک فوج کی کثرتِ تعداد پر دلالت کرتا ہے۔

ہربرٹ ایڈمز گبن لکھتا ہے۔ "اگر بایزید اسی حالت میں ہوتا جس میں وہ نکوپولس کے میدان میں تھا تو یقیناً تیموری طوفان کا مقابلہ بخیر و خوبی کر لیتا۔ تیمور کے حملے کی مدافعت کے وقت ہر بات بایزید کے حق میں تھی۔ اس کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما اور قابلیت اگر اپنے عصر کے تمام کمانداروں اور شاہوں سے بلند نہ تھی تو کم از کم اس سے بہتر اس وقت کوئی نہ تھا۔ اس کی ناکامی کی اصل وجہ یہ تھی کہ عیاشی کی زندگی نے اس کی یہ طاقتیں سلب کر لی تھیں۔"

اگر بایزید انقرہ کے مقام پر فتح مند ہو جاتا اور بعد میں قسطنطنیہ فتح کر لیتا جو

یقینی امر تھا تو پھر بایزید تاریخ کے صفحات میں پندرھویں صدی کی بلند ترین شخصیت بن کر نمودار ہوتا اور اوائلی ایام کے نپولین کا مقام پاتا۔ تاتاری فاتح کی عمر ستر سال کے قریب تھی اور وہ اپنے مرکز سمرقند سے دو ہزار میل سے بھی زیادہ مسافت پر تھا مگر یہ صاف ظاہر ہے کہ سپہ سالاری میں تیمور کا مرتبہ بایزید سے کہیں بلند تھا۔ تاتاری تذکروں میں انقرہ کی لڑائی کو معمولی اور مقامی حیثیت دی گئی ہے اور سپہ سالاری میں بایزید کو توک تمیش سے کمتر مقام دیا گیا ہے۔

تیمور کا نیدار کلے ویجو اپنے مخصوص انداز میں یہ واقعہ یوں بیان کرتا ہے:

"جب ترک کو معلوم ہوا کہ امیر تیمور اس کی مملکت میں داخل ہو چکا ہے تو وہ انقرہ کے مضبوط قلعے کی طرف بڑھا۔ جونہی امیر تیمور نے ترک کی اس دلیرانہ پیش قدمی کے متعلق سنا اس نے راستہ چھوڑ دیا اور اپنی فوج کو پہاڑیوں کے بیچ میں سے لے آیا۔ جب ترک نے یہ سنا کہ تیمور راستہ چھوڑ گیا ہے تو اس نے خیال کیا کہ تیمور بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اس نے تیزی سے اس کے تعاقب میں پیش قدمی کی۔

"امیر تیمور پہاڑوں میں سے آٹھ دن کے کوچ کے بعد میدانی علاقے میں انقرہ کے مقام پر پہنچ گیا۔ ترک اپنا تمام سامان یہاں چھوڑ گیا تھا جو تیمور نے لوٹ لیا۔ جب ترک نے یہ سنا تو وہ نہایت سرعت سے وہاں پہنچا مگر اس کے آدمی تھک چکے تھے۔

"امیر تیمور نے یہ اس لیے کیا تھا کہ اس کا دشمن بے ترتیب ہو جائے۔ دونوں میں لڑائی ہوئی اور ترک قید کر لیا گیا۔"[1]

---

[1] کلاویجو نے یہ بیان دو ہسپانوی سفیروں سے سنا جو وہاں موجود تھے۔ مزید تفاصیل کے لیے مندرجہ ذیل ملاحظہ ہوں: پروفیسر کریسی کی کتاب "عثمانی ترکوں کی تاریخ"، سٹینلے لین پول کی "ترکی"، "عثمانی مملکت کی بنیاد" از ہربرٹ ایڈمز گبن۔ ان کے علاوہ کلاویجو، شریف الدین اور عرب شاہ کو دیکھیے۔

(۵)

ڈیوک وٹیولڈ اور تاتاری

مغربی یورپ کے شاہسواروں کو بایزید کے ہاتھوں نکوپلس کے مقام پر شکست کھائے ابھی تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ مشرقی یورپ کی فوجیں عجیب وغریب طریقے پر تاتاریوں کے مقابلے پر آگئیں۔ یہ ۱۳۹۹ء کا واقعہ ہے۔

لیتھوانیا کا ڈیوک میڈ وٹیولڈ[1]، پولینڈ کے بادشاہ کا حلیف تھا۔ اور جنوبی روس میں بڑھ کر کیف (کیو) اور سمالنسک پر قبضہ کر چکا تھا۔ توک تمیش سے تیمور کی آخری لڑائی نے اسے تاتاریوں کے بالمقابل کر دیا۔ توک تمیش اپنی شکست کے بعد وٹیولڈ اور اس کی عیسائی فوج کے پاس پناہ لینے کی غرض سے آچکا تھا مگر اس دوران میں تیمور روس سے پلٹ گیا تھا۔

دو تاتاری سرداروں نے توک تمیش کے خلاف تیمور کی مدد کی تھی اور کئی سال اس کے دربار میں رہ چکے تھے۔ انھوں نے اب والگا اور سطح مرتفع پر قبضہ کر لیا۔ ایک توعید کو نامی ناگوئی قبیلے کا تھا اور دوسرا اسی کا پروردہ تیمور کوتلک خان تھا۔ انھوں نے وٹیولڈ کے دربار میں پیغام بھیجا کہ توک تمیش ان کے حوالے کر دیا جائے۔ وٹیولڈ بڑا آدمی تھا۔ وہ پولینڈ کے بادشاہ کا رشتے میں بھائی تھا اور ماسکو کے گرانڈ پرنس کا خسر۔ وہ یہ بات کیسے مان لیتا۔ بلکہ اسے تاتاری خان کے خلاف صلیبی جنگ لڑنے کا خیال پیدا ہوا۔

پولینڈ کی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وٹیولڈ اپنی طرف سے تیمور حاکم سمرقند کے خلاف لڑنے جا رہا تھا۔ بہرکیف اس نے لیتھوانیا کے شہزادوں کو جمع کیا اور پولینڈ کے حلیفوں کو بھی ساتھ لیا۔ ان کے علاوہ اس کے ساتھ پانچ سو نائٹ آف دی کراس بھی تھے۔

تیمور کوتلک نے اس سے کہا "میں نے کبھی تمھاری مملکت پر حملہ نہیں کیا۔ پھر تم

---

[1] "وٹیوٹ (وٹیولڈ) یقینی طور پر یورپ کا طاقتور ترین بادشاہ تھا۔" سر ہنری ہاؤ ورتھ۔

کس لیے میرے خلاف پیش قدمی کر رہے ہو۔"

"خدا نے مجھے دنیا کا بادشاہ مقرر کیا ہے۔" ڈیوولڈ نے مزید جواب میں کہا "فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔ میرے بیٹے بن کر میرے تحت ہو جاؤ یا پھر میرے غلام بنو۔" اس کے علاوہ اس نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ لیتھوانیا کا طغرا اپنے سکوں پر ضرب کرے۔

تاتاری خان نے اس کے پاس تحائف ارسال کیے مگر شرائط ماننے میں عجلت نہ کی۔ اب دونوں فوجیں بالمقابل تھیں۔ خان نے اپنے بزرگ اور ساتھی ایدیکو کے آنے کا انتظار کیا۔ جب ایدیکو اپنی قوم کے نوگائیوں کے ساتھ پہنچ گیا تو اس نے ڈیولڈ سے ملاقات چاہی۔ دونوں سردار ایک چھوٹے سے دریا کے کنارے ملے۔

ایدیکو نے کہا "شہزادے! ہمارے خان سے تم عمر میں بڑے ہو۔ اس نے تمھیں باپ کا رتبہ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ مگر تم چونکہ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو اس لیے بہتر ہوگا کہ تم میرے بیٹے بن جاؤ اور لیتھوانیا کے سکوں پر میری تصویر ضرب کرو۔"

ڈیوولڈ غصے سے بھرا ہوا اپنے معسکر کو لوٹا۔ کراکاؤ کے شہزادے نے اسے سنبھل کر عمل کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ اور خفا ہو کر کہنے لگا:

"اگر تم موت سے ڈرتے ہو تو میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں بلند نامی کی تلاش میں ہوں۔"

ڈیوولڈ اور لیتھوانیا کی فوج کی بات قبول کی گئی اور وہ تاتاریوں کے خلاف بڑھے۔ عیسائیوں کے پاس کچھ دستی چھوٹی توپیں بھی تھیں اور انھیں یقین تھا کہ وہ اس نئے ہتھیار سے تاتاریوں کی صفیں منتشر کر دیں گے۔ مگر ان مشکل قسم کے ہتھیاروں کا سریع رفتار تاتاریوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ حرکت کے علاوہ وہ نہایت پھیلاؤ سے لڑ رہے تھے۔ جب تیمور کو تک نے ان پر عقب سے حملہ کیا تو عیسائی گنجان صفوں میں انتشار پھیل گیا۔

انتشار بڑھتا گیا۔ آخر و یٹولڈا اپنے لیتھوانیا کے سرداروں کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا اور اپنی قبل از جنگ لن ترانیاں بھول گیا۔ اس کی فوج کے دو تہائی سپاہی میدان میں کھیت رہے۔ کراکاؤ کا دلیر شہزادہ اور سمالنسک اور گیلیشیا کے شہزادے بھی میدان ہی میں کام آئے۔ نہایت بے جگری سے تعاقب ہوا اور دریائے ڈنیپر تک جاری رہا۔ تیمور نے تاتاریوں کو خراج دیا۔ مگر تاتاری پولینڈ تک و یٹولڈ کی مملکت تباہ کرکے ہی واپس آئے۔

باوجودیکہ تاتاریوں نے اپنی تواریخ میں اس لڑائی کی طرف توجہ نہیں دی مگر اس لڑائی نے یورپ کی سیاسیات کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ پولوں اور لیتھوانیا والوں کی شکست سے روسیوں کے سب سے بڑے دشمن تباہ ہو چکے تھے۔ روسی ہمیشہ تاتاریوں کی نسبت ان سے زیادہ خائف رہتے تھے۔ دوسری طرف و یٹولڈ نے پولینڈ کے بادشاہ کو ساتھ لیا اور پرشیا اور ٹیوٹانک نائٹوں پر حملہ آور ہوا اور ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے کچل دیا۔

---

(۶)

فنونِ جنگ کے دو اُستاد

سر پرسی سائیکس تیمور کے متعلق لکھتا ہے: "تاریخی دور میں ایشیا کے کسی انسان نے اپنی تلوار سے ایسے کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے۔ اس لیے تیمور کے مقام تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی کامیابی بعض اوقات فوق البشر معلوم ہوتی تھی۔"

تیمور اور چنگیز خاں کو قدرت نے ایسا جنگی دماغ عطا کیا تھا کہ وہ بعض حالات میں فوق الانسان معلوم ہوتے تھے۔ ہم تیمور کی مہمات کی کتنی ہی تعریف کیوں نہ کریں۔

یا ہنی بال کے کارناموں کو سراہیں اور نپولین کی فطری تزویراتی قابلیت کی داد دیں لیکن غور و فکر کرنے سے ظاہر ہوتا جا رہا ہے کہ دنیا کی بساط پر مشرق کے یہ دو فاتح اور سکندر فنونِ جنگ کے استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر ممکن ہے کہ ان کے بعض کارناموں کی مثال کسی اور کے یہاں بھی نظر آجائے البتہ دنیا کی تاریخ جنگ کو اگر بحیثیت مجموعی لیا جائے تو یہ ہرگز ممکن نہیں۔

چنگیز خاں کسی حد تک آج بھی راز معلوم ہوتا ہے اور تیمور کے حالات میں بھی ایسا بہت سا مواد ہے جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ آیا چنگیز خاں نے دنیا کی فتح کا ایک مکمل منصوبہ بنا لیا تھا یا وہ محض قدرت کی عطا کردہ بربریت کا مجسمہ تھا، ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ از حد عقلمند تھا۔ اسے ایسی عقل و دبعیت کی گئی تھی جو ہماری اس دنیا کے لیے آفت ثابت ہوئی۔ ہم جتنا بھی چاہیں تیمور کی فتوحات کا جائزہ لیتے رہیں، انھیں ترازو میں تولتے رہیں مگر ہم اس کی کامیابی کے راز کی جستجو میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ہم سکندر کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا باپ مقدونیہ کا بادشاہ فلپ تھا۔ اس نے ورثے میں ایک زبردست فوج پائی تھی۔ وہ اپنی فتوحات کے سلسلے میں ایران کی عظیم مملکت کا وارث بنا اور جن علاقوں پر ایرانی مسلط تھے وہ اس کے قدموں میں آگئے۔ مگر ایشیا کے ان دو فاتحوں کے اور ہمارے درمیان وقت، ماحول کا دبیز پردہ اور مختلف سی دنیا کی وسیع خلیج حائل ہے۔

بعض ایسی باتیں ضرور ہیں جن پر ہم یقینی طور سے رائے قائم کر سکتے ہیں۔ سکندر کی طرح انھیں ان تھک ذہن و جسم، غیر مسدود تگاپو طبیعت اور بے پناہ اندرونی طاقت ودیعت ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر مشابہت ختم ہو جاتی ہے۔ چنگیز خاں میں صبر و انتظار کا مادہ تھا۔ تیمور خود دلپسند واقع ہوا تھا۔ مغل اعظم آخری ایام کے بعد اپنی مہمات کی نگرانی اپنے مرکز

سے کیا کرتا تھا۔ مگر سمرقند کا والی عام طور پر محاذِ جنگ پر بنفسِ نفیس نظر آیا کرتا تھا۔ صحرائے گوبی کا خانہ بدوش تمام ذمہ داریوں میں اپنے وزیروں اور سپہ سالاروں کو شامل کرتا تھا۔ اس کے برعکس تاتاری سردار تمام ذمہ داریوں کا حامل خود بنا کرتا تھا۔

کیا یہ طریقۂ کار تھا؟ یا یہ کہ چنگیز کو بہتر مشیر میسر آ گئے تھے۔ بظاہر تو یونہی ہوتا ہے۔ اس کے چینی وزیر اور اس کے وہ چار جنگجو بیٹے، سبوتائی جیسے نویون، بایان اور مُہولی اس قابل تھے کہ کسی مہم کو خود ہی انجام دیتے۔ اس کی موت کے بعد ان میں سے جو بچ رہے تھے انھوں نے مملکت کو مزید وسعت دی۔ سیف الدین، شیخ علی بہادر اور جاکو برلاس نے تیمور کے لیے کوئی ایسا کارنامہ تکمیل تک نہ پہنچایا۔

تیرھویں صدی کے مغل فطرتاً جنگی قیادت کی طرف راغب تھے اور ان میں اتفاق اور تنظیم شہد کی مکھیوں کی سی تھی۔ اس کے برعکس پندرھویں صدی کے تاتاری سپاہی آپس میں پوری طرح یک جان نہ ہوتے تھے۔ تیمور کی غیر موجودگی میں ان کی تمام قابلیت کافور ہو جاتی تھی۔ مغل زبردست دشمن کے مقابلے میں مختلف سپاہیوں اور جیشوں میں بٹ کے دُور دراز علاقوں میں ایک ہی مقصد کے لیے نقل و حرکت کر سکتے تھے مگر تیمور ہمیشہ ایک ہی فوج سے کام نکلتا۔

چنگیز خاں غیر معمولی قسم کا منتظم تھا۔ وہ لاتعداد فوج کی دُور دراز حرکات کے منصوبے کی باریک ترین تفصیلات میں جاتا تھا۔ وہ مہم کے مختلف پہلوؤں کا مکمل منصوبہ تیار کرتا اور ہفتوں اپنے سپہ سالاروں کو بحث میں شریک رکھتا۔ وہ تزویرات کا اُستاد تھا۔ اور جب تک لڑائی ناگزیر نہ ہوتی۔ ہرگز اس طرف رجوع نہ کرتا۔ وہ ہمیشہ دشمن کی تباہی کے مرکزی نقطے پر ضرب لگاتا اور مخالف کمانڈر کو مارنے کے درپے ہوتا۔ اس کی حرکات کے اردگرد خوف اور اسرار کا ایک جال ہوتا اور جہاں سے گزر جاتا وہاں مُردوں کی تعداد بے اندازہ چھوڑ جاتا۔

مغلوں کی آمد سے خوف کے باعث جو مُردنی اور ناکارگی چھا جایا کرتی تھی اس کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مفتوح شہر میں ایک مغل سپاہی نے بیس آدمیوں کو اسیر کیا تاکہ انھیں قتل کرے۔ اسیر کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ اپنی تلوار لانا بھول گیا تھا۔ اس نے ان بیس قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ وہیں رُکے رہیں اور اس کے تلوار ڈھونڈ کر لانے تک انتظار کریں۔ سوا ایک کے باقی سب نے اس کا انتظار کیا۔ اور وہی ایک یہ کہانی سنانے کے لیے بچ رہا۔

تیمور کے تاتاری مختلف تھے۔ یہ درست کہ اک بوگا کا چالیس ایرانی سپاہیوں کا تعاقب کرنا اپنی قسم کا واحد واقعہ نہ تھا یہ درست کہ اس کے سپاہی اپنے آپ کو ناقابلِ شکست سمجھتے تھے۔ مگر ان کا یہ خیال اس کی ذاتی بلند بختی اور اس کی موجودگی کی وجہ سے تھا۔

تیمور بھی اپنے منصوبوں کی تیاری میں چنگیز خاں کی طرح احتیاط سے کام لیتا تھا مگر تدبیرات کی پختگی میں وہ مغل اعظم کے پائے کا نہ تھا۔ چنگیز خاں دشواریوں سے پہلو تہی کرتا تھا اور تیمور اس کے برعکس ان کا سامنا کرتا تھا اور ان پہ فتح پاتا تھا۔ شاید اس فتح میں اسے مزید خوشی محسوس ہوتی تھی۔ مغل اعظم چند سو سواروں کی سرکردگی میں اپنی فوج سے میلوں آگے ہرگز بغداد کی دیواروں کے سامنے نمودار نہ ہوتا اور نہ کرتی کی دیوار پر تن تنہا چڑھ جاتا۔

چین میں چنگیز خاں پہلے پورے صوبوں کو تباہ و برباد کرتا تاکہ پھر اس تباہی میں سے ہو کر نقل و حرکت کامیابی سے کر سکے۔ تیمور پہلے دشمن کو یکجا ہونے کا موقع دیتا، پھر پیش قدمی کر کے اس پہ حملہ آور ہوتا۔ آخری ایام میں وہ ہمیشہ فتحمند رہا۔ نپولین کی طرح وہ ہر مشکل مقام کے لیے تیار رہتا اور اس مشکل کے مقابلے کے لیے وہ ذاتی مشکل کشائی پہ بھروسا رکھتا۔ اسے دشمن کو تباہ کرنے کا ہمیشہ یقین ہوتا تھا اور مشکل سے مشکل مقامات پر بھی وہ کبھی ہراساں نہ ہوتا۔

ہمیں یہ معلوم نہیں کہ چنگیز خاں نے صحرا کی وسعتوں میں تزویراتی نگاہ کس طرح حاصل کی اور اس نے جنگی تنظیمات کو کس طرح تشکیل دی۔ اسی طرح تیمور کی فتوحات کا راز آج بھی سربستہ راز ہے۔

---

(۷)

شعراء

تیمور کے یک لخت یورپ کی دہلیز پر نمودار ہونے، پھر اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ اسی سرعت سے پلٹ جانے پر شعرائے یورپ کے تخیل کو جنبش ہوئی۔ "تیمرلین" اور "تمبرلین" افسانوی کردار بن گیا۔ یونانیوں اور ترکوں کی اختراع کردہ کہانیوں کے گرد رنگ آمیز افسانے بننے لگے۔

سولھویں صدی کے جرمن عثمانی سلطان کو "باجسزات" کہتے تھے۔ اور ہمیں بعض پرانی کتب میں "تمبرلین" اور "باجزات" کی طرف اشارات نظر آتے ہیں۔ ہمعصر تاریخوں میں وہ عظیم "تاتاری چام" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا شجرۂ نسب ہیروڈوٹس کی اولاد کے چرواہوں سے لایا جاتا تھا۔ مگر ایک عرصے تک یورپی ذہن تیمور کو ترکوں سے ملاتے رہے۔ ایک موہوم سا خیال "اناطولیہ" کی فتح اور "مصر کے سولڈن"، "بیت المقدس اور بابل" کی فتوحات کی طرف بھی جاتا تھا۔

ملکہ الزبتھ کے اوائلی دور کا کرسٹوفر مارلو صرف اتنا جانتا تھا کہ تیمور کی طاقت کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا اور اس کی شان و شوکت مشرق کی روایتی شوکت و حشمت کی حامل تھی۔ اس نے اس تخیل کو رنگین شاعری کا جامہ پہنایا۔ انگریزی زبان کا یہ پہلا ڈرامہ تھا۔ اس کا "تمبرلینِ اعظم" محض تخیل کی پیداوار ہے اور اس کی بنیاد قدیم ایرانی، یونانی قصوں

پر رکھی گئی ہے۔[1]

ٹمبرلین سٹیج پر آتا ہے اور بہت کچھ کہتا ہے۔ یہ ڈرامہ جو ۱۵۸۶ء میں لکھا گیا اب غیرفانی بن گیا ہے۔ مگر صرف انگریز شاعر کے جوش و خروش کی وجہ سے ٹمبرلین کی مشابہت تیمور کے ساتھ صرف اس کی قوت ارادی اور شان و شوکت پسندی میں ہے۔ اور یہ بھی اس لیے کہ مارلو خود طاقت اور شان و شوکت پسند کرتا تھا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نے کانو کیحو کا رسالہ جو ۱۵۸۲ء میں شائع ہوا تھا، نہ دیکھا تھا۔ اس رسالے میں تیمور کے متعلق بھی تفصیلات تھیں۔

اس کے بعد تیمور کا ذکر یورپ کی تاریخوں میں زیادہ نظر آتا ہے اور واقعات کو خوب مسخ کیا گیا ہے۔ لیوان کلیو کیس ۱۵۸۸ء میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ اور پیر آنڈلیس ۱۶۰۰ء میں۔ جین ڈی بیک نے افسانوی رنگ میں نامعلوم شخص الحزن (الحسن) کا تذکرہ ۱۵۹۵ء میں شائع کیا۔ ہمارا دوست رچرڈ نولس اس تذکرے کو ترکوں کی تاریخ میں شامل کر دیتا ہے جو ۱۶۰۳ء میں شائع ہوئی۔ ان میں سے بہت سے پرانے تذکرے

۱۔ اگر اس ڈرامے میں واقعات یا حقیقی کرداروں کی تلاش کریں تو وہ بے سود ہوگا۔ تیمور اور بایزید کے نام البتہ ضرور ہیں۔ ان کے علاوہ صرف ایک نام کرداروں کی فہرست میں ایسا ہے جس میں مشرقیت کی جھلک ہے۔ وہ نام اسوم کسین کا ہے۔ برگرٹن اپنی TRACITEDESSARASINS میں ایک اسوم کسین کا ذکر کرتا ہے جو تیمور کی ملازمت میں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی سفید بھیڑوں کی قوم کا سردار تھا۔ مارلو اناطولیا اور سوریا جو شاید شام سے مراد ہے ان کے بادشاہوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اناطولیا اور شام صوبے ضرور تھے مگر ان کا حکمران کوئی نہ تھا۔ ازون حسن سفید بھیڑوں کے قبیلے کا سردار تھا اور اس نے ایک یونانی لڑکی سے شادی بھی کی تھی مگر وہ تیمور سے کم از کم دو پشت بعد ہوا ہے۔

میں جمع کیے گئے ہیں۔ اس کی اشاعت سنہ ۱۶۲۵ء His Pilgrims
میں ہوئی۔ میک نان نے اپنی عجیب و غریب کتاب "تیمور اعظم اور بایزید"
کو سنہ ۱۶۴۷ء میں شائع کیا۔ سنہ ۱۶۳۴ء میں پیرے برگرسن کی کتاب "تاتار علاقے میں سفر"
شائع ہوئی جس میں تاتاریوں کے متعلق کسی قدر صحیح تفصیلات بھی
تھیں اور مسلمان اقوام کے حالات بھی درست تھے۔ صحیح اطلاعات کا یہ آغاز تھا اس
کے جلد بعد وٹیبیر نے ابن عرب شاہ کی تاریخ کا ترجمہ کیا اور اسے پیرس سے سنہ ۱۶۵۸ء
میں شائع کیا۔

افسانوی تمبرلین کی ہلکی سی جھلک ملٹن کے "شیطان" میں بھی ملتی ہے۔ نقارہ و
طبل مسلح غولوں کو جنگ کی دعوت دیتے ہیں۔ بلند علم صف بستہ ٹائین کے بعد
ٹیالین جو ظلمت کی طاقت کا نبع ہیں اور بہشت کے دروازوں پر مجتمع ہیں اور ساتھ
ہی ساتھ مشرق کی شان و شوکت کے متعلق اس عصر کے یورپ میں مروجہ خیالات کا
ذکر زور شور سے ہے۔ ایک عرصے تک تمبرلین یورپ کے ادب میں مشرقی استبداد کا
نمونہ بن کر ظاہر ہوتا رہا۔ فوراً بعد مثل کے تخیل نے اس کا ساتھ دیا۔ پھر والٹیر کے
زمانے میں چینی بادشاہوں کو بھی اسی صف میں لا کر کھڑا کیا گیا۔ مارکو پولو کا پیدا کردہ کردار
"تاتاری کا کا آن اعظم" اپنی جگہ تمبرلین کو دے چکا تھا۔ مگر یہ سب کچھ تاریخ، اصل
واقعات اور افراد سے کاملاً غیر متعلق تھا۔

جب اٹھارھویں صدی کے اوائل میں "پیٹی ڈی لا کرا ـــــئے" نے شریف الدین
کی تاریخ "امیر تیمور کی فتوحات" کا ترجمہ کیا تو صحیح واقعات کا علم ہوا۔
پو کی نظم جو دراصل انسانی محبت دکھاتی ہوئے تمبرلین کو ان سطور سے زیادہ ظاہر
نہیں کرتی۔

بادشاہت کی شان و شوکت

اور نقارے کی رعد و برق کی سی آواز
صرف ظاہر کرتے ہیں
جنگ میں انسان کے پھینکے ہوئے
تیروں کی پرواز

---

(۸)

مغل

مغل "منگول" کا لفظ یورپی مصنف ایشیا کی اتنی زیادہ چیزوں کو دیتے رہے ہیں کہ اس لفظ کا ماخذ سمجھنا ضروری ہے۔

اوائل میں یہ لفظ "منگ کو" تھا جس کے معنی "بہادر لوگ" تھے۔ اس کے معنی "چاندی کے لوگ" بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ سائبیریا کی پرانی قوم "ٹنگ سوئی" کی نسل اور قدیم ترکوں کی نسل میں سے تھے۔ سوا اس بات کے کہ انھوں نے چین فتح کیا اس عصر کے چینیوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

وہ بلند قامت، مشقت پسند اور ان پڑھ خانہ بدوش تھے۔ ان کی گزر اوقات اپنے ریوڑوں اور شکار پر تھی۔ ان کا مسکن صحرائے گوبی اور ٹنڈرا تھے اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ گھاس کی تلاش میں چلتے رہتے۔ ہیروڈوٹس نے انھیں سیتھین کہا ہے۔ وہ ہنوں اور السیتوں کی برادری کے تھے۔ جنھوں نے یورپ کی بدبختی سے مغرب کا رخ اختیار کیا۔ وہ اس وقت بھی شہسوار تھے اور ان میں سے جو باقی بچے ہیں وہ آج بھی شہسوار ہیں۔

عرصہ ہوا چینی انھیں ہیونگ نو اور دوسرے مختلف دیوؤں کے نام دیتے تھے۔

مغل

اور انھیں روکنے کے لیے مشہور دیوار تعمیر کی۔ کہانیوں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سکندر نے بھی بحیرۂ خزر کے پاس ان کی روک تھام کے لیے دیوار تعمیر کی تھی۔ وہ ایشیا کی بلندیوں کے شہسوار تھے۔ فاتح پیدا کرنے والی سرزمین کے خانہ بدوش، گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانے والی گوشت خور اور دودھ پینے والی صحرانشین قوم کو ہیروڈوٹس نے سیتھین کہا ہے۔ بعد کے رومیوں نے ہن اور چینیوں نے ہیونگ نو کا نام دیا ہے۔

ہیونگ نو ان پورے خانہ بدوشوں پر عائد ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ جنگ آزما رہتے تھے اس لیے ان پر حلفاء کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ۱۱۶۲ء میں جب چنگیز خاں نمودار ہوا اس وقت یہ غول کوئی بیس قبیلوں پر مشتمل تھا مشرق سے مغرب جاتے ہوئے یہ پانچوں تاتاری مغل، کرائت، جلایر اور اوگیور قبائل کے باپ دادا تھے۔ چنگیز خاں جو مغل قبیلے کا سردار تھا باقی قبائل کو زیر کر لینے کے بعد ان سب کی شمولیت سے ایک نئی مملکت استوار کرنے کا موجب بنا۔

چنگیز خاں اس مملکت کا بانی تھا اور مغل اس کے جانشین تھے۔ اس کی پہلی فتوحات ان خانہ بدوش قبائل ہی کے خلاف تھیں۔ ان کی مدد سے اور چینیوں کو ساتھ لے کر اس نے وسط ایشیا کے ترکوں کو شکست دی اور اس کے بعد دنیا کے بہت بڑے حصے کو زیر کیا۔

آج لفظ مغل سے دو باتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ یا تو بارھویں اور تیرھویں صدی کی وسیع مغل مملکت کے ساکنوں کو مغل کہا جائیگا یا پھر مغل قوم کی اولاد کو۔ اس کتاب میں مغل صرف اسی دوسرے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے[1]

---

[1] مزید تفاصیل و مباحث کے لیے ای۔ایچ پارکر کی کتاب "تاتاریوں کے ایک ہزار سال" ملاحظہ ہو۔ اس کے علاوہ فریڈریچ ہرتھ کی قدیم چین کی تاریخ، ابوالغازی بہادر خاں کی سلسلۂ سلاطینِ تاتار، اور قرونِ وسطیٰ کی کیمبرج تاریخ جلد چہارم دیکھیں۔

تاتار

تاتار (ٹاٹر) کا لفظ مغل سے بھی زیادہ غلط استعمال ہوتا رہا ہے۔ شروع میں مغلوں کے مشرق کی طرف رہنے والے ایک چھوٹے سے قبیلے کو یہ نام دیا جاتا تھا۔ وہ مغلوں سے کافی ملتے جلتے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ اس لفظ کا آغاز کس طرح ہوا۔ ممکن ہے ان کے ایک سردار تاتور نامی سے ہوا ہو یا پھر چینی لفظ تا۔تا۔ سے[1]

چینیوں سے قریب ترین قبیلہ یا خوم تاتاری تھے۔ اس لیے وہ باقی خانہ بدوشوں کو بھی تاتار ہی کہتے تھے۔ ان کا صحیح تلفظ تا۔تا۔ارہ تھا۔ اس نام نے دوامی صورت اختیار کی اور اب اکثر چینی یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تمام یورپی باشندوں نے بھی تاتار کا لفظ وسط ایشیا کے سب خانہ بدوشوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انیسویں صدی میں جو یورپی پہلے پہل خانہ بدوشوں کی وسیع مملکت میں پہنچے انھیں مغلوں نے کہا کہ ان پر تاتاری کا اطلاق نہ کریں اس لیے کہ وہ تاتاریوں کے فاتح رہ چکے ہیں۔ بارھویں صدی میں برطانیہ کے نارمن بھی سیکسن کہلانا پسند نہ کرتے تھے۔

مغلوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سنہ ۱۲۰۲ء سے تاتاری بالکل گم ہو گئے

---

[1] آج کے مؤرخ چاہتے ہیں کہ اصلی لفظ "تاتار" کو پھر فروغ دیا جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ مغلوں کے ہاں لفظ "تا" سے کوئی شے مراد ہے اور اس لفظ کو تا تار کے طور پر دہرانے سے اہمیت دینا مراد ہے۔ اور چونکہ چینی "ٹر" نہ بول سکتے تھے اس لیے انھوں نے تا۔تارارہ کی صورت میں اس نام کو اپنایا۔ اوائل کے تمام یورپی سیاحوں نے اسے تارتار ہی لکھا ہے۔ اس کے برعکس عرب اور ایرانی مؤرخوں نے اس طرح نہیں کیا۔ موجودہ دور کے تاتاری بھی اس کا تلفظ اس طرح نہیں کرتے۔ لفظ "تورانی" اور "ترک" جو "تور" کا حصہ ہے شاید اس سے اخذ ہوا ہو مگر یہ یقینی نہیں۔

اور مغل مملکت کے مختلف مسلح قبیلوں میں مدغم ہو گئے۔

ایشیا میں نام سے زیادہ اہمیت واقعیت کو دی جاتی ہے۔ یورپی مؤرخوں کی نگاہ میں چنگیز خاں مغلوں کا شہنشاہ تھا۔ مگر اپنی رعیت کے لیے وہ دنیا کا خاخان خاقان، تھا۔ اس کا نام لینا اچھا نہیں سمجھا جاتا - اس کی مملکت کو نام سے بحث نہ تھی۔ جو کچھ اس کے زیر اقتدار تھا وہ اسی کا تھا۔ اس زمانے میں مغل اور تاتار لکھنے پڑھنے سے نابلد تھے۔ اس کام کے لیے وہ غیر ملکی منشی رکھا کرتے۔ علاوہ ازیں بولنے کی زبان تحریری زبان سے مختلف تھی۔ یورپی ممالک کی خط و کتابت میں ان پروانہ نویسوں نے خان کے نام اور القاب کچھ اس طرح درج کیے ہیں:

(۱) خاں

(۲) زمین پر آسمان کا نمائندہ

(۳) شاہِ جہاں اور شہنشاہِ بنی نوع انسان۔

اور مغل کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ مارکو پولو جب اپنی سیاحت سے لوٹا تو وہ "ٹارٹار" اور "ٹارٹاری" کے الفاظ اپنے ساتھ لے کر آیا۔

روسیوں کے تعلقات ان خانہ بدوشوں کے ساتھ سب سے پہلے قائم ہوئے اور زیادہ دیر پا بھی رہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص وجوہ کی بنا پر انھیں تاتار کا نام دیا اور اسی نام پر قائم رہے۔ ہاورتھ کا خیال ہے کہ جو مغل فوج روس پر پہلے پہل حملہ آور ہوئی ممکن ہے اس کا مقدمۃ الجیش تاتاریوں کا ہو۔ روس کے ساتھ روابط کے ذریعے یورپ نے چین کو خطائی۔ یا کتھائی کا نام دیا۔ کتھائی بعد میں چھوڑ دیا گیا۔ البتہ جو خانہ بدوش قبیلے مغلوں کی زیر قیادت دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے۔ انھیں تاتار ہی کہا گیا۔ اب اسے بدلنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

جو قدیم تاتاری پہلے پہل جھیل بوبار کے اردگرد اور دوسری جگہوں پر شکار کیا کرتے تھے ان سے تیمور کے برلاس قبیلے کا کوئی تعلق نہیں۔ برلاس قبیلے کا تعلق اس قوم سے ہے جسے قدیم ترک کہا جاتا رہا ہے۔

مگر تاتار سے بہتر ان کا اور کوئی نام بھی نہیں۔ شرف الدین بھی اسی کو استعمال کرتا ہے۔ میرخوند اور خوندامیر بھی یہی استعمال کرتے ہیں۔ یہی حال ابو الغازی کا ہے۔ بعد کے ایرانی اور عرب مصنف انھیں تاتار اور ترک کہتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے ذی علم اصحاب میں سے ہاورتھ کا خیال ہے کہ تاتار سب سے بہتر لفظ ہے۔ ایڈورڈ۔ جی براؤن بھی تائید کرتا ہے۔ لیون کہون اور ارمینس ویمبری ترک زیادہ موزوں سمجھتے ہیں۔ ان کے وجوہ مختلف ہیں۔

اس کتاب میں تیمور کے قبیلے کے لیے تاتار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ نسلی اور تاریخی اعتبار سے یہ کاملاً صحیح ہے بلکہ صرف اس لیے کہ باقی ناموں سے یہ بہتر ہے۔ آخر نام میں کیا رکھا ہے۔ جاٹوں اور سنہری غول کو مغل اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اب بھی مغل سرداروں کے تابع ہیں۔[1]

---

[1] مزید تفاصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ ہاورتھ جلد دوم۔ وسطی ایشیا کے ترک از ایم سی زیپ لیکا۔ لیین پول کی کتاب سلاطین اسلام KUZNIETZAFF کی کتاب وسطی ایشیا کے تمدن اور زبانیں،

اور ترک و تاتار پر ایس۔ ڈبلیو۔ کوئل کی جے آر۔ اے ایس۔ نیو سیریز جلد چہاردہم میں بحث۔

ترک

زبان دانوں نے ترک کے لفظ کو گیند کی طرح بار بار اچھالا اور پھٹکا ہے۔ مؤرخ، ماہر آثار قدیمہ، ماہر عمرانیات اور پان ترکی تحریک کے بانی بھی حسب استطاعت اس سے کھل کھیلے ہیں۔ یہاں تک کہ گرد اور گیند میں تفریق مشکل ہو گئی ہے۔

مادہ بھیڑیے کے بطن سے "ترک ابن جافت" کی کہانی اور گمشدہ مملکت کے افسانے جہاں تہذیب و تمدن بلند تھا گھوڑے پالے جاتے تھے اور دھاتوں کا استعمال عام تھا دلچسپ ضرور ہیں البتہ قابل یقین نہیں۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ ترکی ہلال کی جگہ اب سنہری بھیڑیے کا سر استعمال کرنے کی تحریک جاری ہے۔ مگر اس سے ان کہانیوں کی صداقت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ پانچویں صدی عیسوی سے پہلے ترکوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں اس کے بعد "ہیونگ نو" کی قوم کے سواد اعظم سے ایک قبیلہ علیحدہ ہوا اور چلین، صحرائے گوبی کے درمیانی سنہری پہاڑوں میں سکونت اختیار کی۔ اس قبیلے کے خاندان "اسینا" اور بعض اوقات ترک کہلاتے تھے۔ ترک کے معنی خود کے ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ قبہ نما پہاڑی کے قریب رہتے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود پہننے کی وجہ سے یہ نام پڑ گیا ہو۔ چونکہ چینی "ر" کا تلفظ صحیح طور پر ادا نہ کر سکتے تھے اس لیے وہ انھیں "توکی" کہتے تھے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ چینیوں نے "اسینا" خانہ بدوشوں سے یہ لفظ سنا تھا یا خود ہی اختراع کر لیا تھا۔

بہرکیف چینی تذکروں کی بنا پر یورپی مصنفوں نے ان تمام قبائل کو ترک کہنا شروع کر دیا جو "اسینا" (ترک) سے وابستہ تھے۔ مشرقی حصوں میں اوگیور اور جلائیر بھی ترک کہلاتے ہیں۔ مغرب میں کرلوک، کنکالی، کاراکلپک، کپچاک، برف نورد، بلند گاڑیاں، کاراتوپ اور صحرائی وہ جو بعد میں سنہری غول میں شامل ہو گئے، سبھی

ترک کہلاتے تھے۔

انھیں یہ نام ملنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سب ایک ہی یا ایک ہی سی زبان بولتے تھے۔ یہی زبان اب ترکی کہلاتی ہے۔ مگر یہ قسطنطنیہ کی ترکی سے مختلف ہے۔ اوائل میں اس کی بعض بولیاں مغل زبان سے ملتی جلتی تھیں۔

یورپی مصنفوں نے ایک قبیلے کا نام لے کر اسے بہت سے قبیلوں پر چسپاں کر دیا ہے۔ لیتھوانیا کے شہزادے کا وہ واقعہ یاد آتا ہے جب وہ عیسائی ہوا تو اپنی پوری قوم کو بپتسمے کے لیے گروہ در گروہ بلایا اور اس رسم کے دوران میں ایک گروہ کا نام پیٹر رکھا اور دوسرے کا پال۔

بہر کیف ترک موجود ضرور تھے۔ چین کی پچھلی طرف حریر پوش، گوشت خور اور دودھ دہی کے پلے ہوئے۔ ان کے جنگ آزما دلیر جوان "یگانز" کہلاتے۔ ان کی شہزادیوں کو "خاتون" کہا جاتا اور سرداروں کو "خاقان"۔ ان کی کمانیں سینگ کی بنی ہوتی تھیں۔ ان کے تیر جب ہوا میں اڑتے تو ان کی سنسناہٹ سے سیٹیوں کا گمان ہوتا اور ان کے جسم زرہ سے ڈھکے ہوتے۔ ان کے علم پر "دُغ تغ" سنہری بھیڑیے کا سر کشیدہ ہوتا۔ یہ نشان "لن خاخان" "بھیڑیئے سردار" کا تھا۔ صرف بادشاہ ہی ایسا علم رکھ سکتا تھا۔ اور اسی کو دن میں پانچ مرتبہ طبل بجوانے کی اجازت ہوتی۔ یہ تھے تیمور کے آباد اجداد۔

یہ ساتویں صدی کا ذکر ہے جب مغل کھالیں پہنتے تھے۔ کبھی جانوروں کی کھال اور کبھی مچھلی کی کھال اور جب وہ انتہائی گندگی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اس وقت سبتیر میں شمال کی طرف رہتے تھے۔ جسے آج سائبیریا کہتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ از حد الجھا ہوا ہے اور واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان مختلف قبائل میں صرف زبان کا مسئلہ مشترکہ تھا جسے آج ترکی کہا جاتا ہے۔ اس وقت یہ زبان سنسکرت اور آسوری قسم کے رسم خط میں لکھی جاتی تھی۔ خیال ہے کہ خانہ جنگی یا اور کسی ایسی ہی

وجہ سے یہ اپنے آبائی مسکن کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔
مغرب کی طرف حرکت کر کے یہ وسیع پیمانے پر منتشر ہو گئے۔ واقعات سرعت سے عمل پذیر ہوتے رہے مملکتیں بنیں اور برباد ہوئیں۔ نئے قبیلے برسرِ اقتدار ہوئے، پھر ان کی جگہ اوروں نے لے لی۔ اس اندرونی خلفشار پر عربوں نے بھی اثر ڈالا ترک اس وقت لامذہب تھے۔ ان کی ہر شاخ نے روشن دن دیکھے ہیں۔ اُوگیور، کرگز اور کاراخطا سبھی یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے، پھر چنگیز خاں کے مغل آئے انھوں نے انھیں مزید منتشر کیا مگر بالآخر ان سب کو سنہری غول میں شامل کر کے یکجا کر دیا۔
ہر قبیلے نے اپنا نام قائم رکھا۔ مگر ہر نئے اختلاط اور علیحدگی پر ناموں میں تبدیلی بھی آجاتی۔ کرغز اور کراٹ کی طرح کے چند نام ابھی قائم ہیں۔ برلاس قبیلہ ان تمام جنگوں میں شامل تھا اور جب وہ ماوراءالنہر پہنچا تو وہاں آکر رُک گیا۔ ایک روایت ہے کہ ان کا ایک سردار مغل حکمران کا کاراچار یعنی کمانڈر اعلیٰ تھا۔
چنگیز خاں کی موت کے بعد اور تیمور کی پیدائش سے پہلے پڑھے لکھے اور سمجھ والے لوگ ان قبائل کو ترک کا نام دیتے، البتہ ان کے پڑوسی انھیں تاتاری کہتے۔ گو وہ سب مغل مملکت کے شریک بھی تھے اور ساکن بھی جس طرح سکاٹ لینڈ کے خاندان اپنے قبائلی ناموں سے وابستہ رہے اسی طرح انھوں نے ان قبائلی ناموں کو نہ چھوڑا۔ ان میں سے کچھ آدمیوں نے مختلف زبانوں میں لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا اور ان میں اکثر برائے نام اسلام میں شامل ہو گئے۔ کچھ بدھ مذہب اختیار کر چکے تھے مختلف ممالک کی تاریخوں میں وہ ظاہر ہوتے ہیں اور قریب قریب ہر جگہ وہ باعثِ تکلیف ثابت ہوئے۔ تیمور نے ان سب کو ایک بار پھر یکجا کیا۔
ایسا معلوم ہوتا کہ ترک مملکت کا وجود کبھی نہیں ہوا اور نہ کوئی متحدہ ترک قومیت ہی تھی عثمانی ترک خانہ بدوش ترکمان تھے اور حکمران قبائل سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

انھوں نے یورپ فتح کیا اور وہاں شادیاں کیں۔ یہی رویہ انھوں نے مشرق قریب میں رکھا۔ ان کی زبان میں عربی اور فارسی کا بہت بڑا جزو تھا۔ وہ ترک ہرگز نہ تھے۔

ولیم آف ٹائر جو صلیبی جنگوں کا وقائع نگار کہلا سکتا ہے۔ ایک حد تک اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب ہوا۔ اس نے کہا تھا ترک کے معنی حکمران کے ہیں اور ترکمان سے مراد آوارہ گرد ہوتا ہے۔

عثمانیوں کی حالت عجیب تھی۔ یورپی انھیں ترک کہتے تھے اور وہ ترک کہلانے پر مجبور ہو گئے۔ مغربی تاریخیں جیسے ترکی کہتی تھیں وہ وہاں کے ساکنوں کے لیے ترکی نہ تھا۔ اسے وہ عثمانی ولایت کہتے تھے یعنی عثمانیوں کا ملک[1]۔

---

(۱۱)

شیخ الجبل

جب مارکو پولو ایران میں سے گزر رہا تھا تو اس نے حسن بن صباح کے ساتھیوں کے متعلق جنھیں حشاشین کہا جاتا تھا مختلف قسم کی کہانیاں سنیں۔ اس بیان میں افسانے کی نسبت حقیقت زیادہ معلوم ہوتی ہے اور وہ ملاحظے کے قابل ہے[2]:

---

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں گیبن گیبون۔ ای۔ ایچ پارکر۔ ابو الغازی بہادر خان اور آرمینیس ویمبری کی ''ترک لوگ''۔ ای۔ چوائس کی ''یورپ کے ترک''۔ ہربرٹ اینڈ مز گبن کی ''سلطنت عثمانی کی بنیادیں''۔

[2] OLD MAN OF THE MAUNTAIN شیخ الجبل کا لفظی ترجمہ ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو قاتل کے خنجر کا ڈر اور خوف دلا کر پہاڑی قلعوں پر قابض ہو چکے تھے۔ مارکو پولو کی کہانی کا اقتباس یُول کا ڈیریہ کی اشاعت سے لیا گیا ہے۔

شیخ الجبل

"شیخ کو وہ اپنی زبان میں علاءالدین کہتے تھے۔ اس نے دو پہاڑوں کے درمیان کی ایک وادی کو دونوں طرف سے بند کر دیا تھا اور اسے باغ میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس میں ہر قسم کے پھل تھے اور اس سے زیادہ خوشنما اور بڑا باغ آج تک نہیں دیکھا گیا۔ اس میں بڑے بڑے شامیانے اور عالیشان محل تعمیر کیے گئے تھے اور انھیں خوبصورت رنگوں سے مزین کیا گیا تھا۔

"اس میں ندیاں بھی تھیں جن میں پانی، شہد اور دودھ بہتا تھا۔ وہاں حسین ترین لڑکیاں اور عورتیں تھیں جو ہر ساز بجا لیتی تھیں۔ ان کا گانا دلنواز اور ان کا رقص مسحور کن تھا۔ شیخ چاہتا تھا کہ اس کے آدمی اسے حقیقی بہشت سمجھیں۔

"اس نے اسے بہشت کی تفاصیل کے مطابق تعمیر کیا تھا یعنی اس میں دودھ، شہد اور پانی کی ندیاں تھیں اور حسین ترین عورتیں تاکہ وہاں کے ساکن زندگی کے لطف اٹھا سکیں یقین مانو کہ وہاں کے سراسانی اسے بہشت ہی تصوّر کرتے تھے۔

"اس باغ میں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے جنھیں وہ حشاشین بنا لینا چاہتا تھا۔ باغ کے دروازے پر ایک قلعہ تھا۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا اور یہ قلعہ اتنا مضبوط تھا کہ پوری دنیا کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس کے دربار میں بارہ سال سے بیس سال کے ایسے نوجوان رہتے تھے جنھیں سپاہیانہ زندگی کا شوق تھا اور وہ انھیں بہشت کے متعلق باتیں بتاتا رہتا تھا۔ پھر وہ انھیں چار، چھ یا دس کی ٹولیوں میں بہشت میں لے جاتا۔ اس سے پہلے وہ انھیں کوئی ایسی دوا پلا دیتا کہ وہ سو جاتے۔ وہ نیند ہی میں انھیں اٹھوا کر باغ کے اندر لے جاتا۔ جب وہ جاگتے تو باغ کے اندر ہوتے۔

"آنکھ کھلتے ہی جب وہ اپنے آپ کو اتنی دلفریب جگہ میں دیکھتے تو انھیں یقین ہو جاتا کہ وہ بہشت میں ہیں۔ حسین لڑکیاں ان کا دل بہلاتیں اور وہ ان کے ساتھ جوانی کے کھیل جی بھر کر کھیلتے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ ہرگز وہاں سے واپس نہ آتے۔

"یہ سردار جسے ہم شیخ کہتے ہیں نہایت عالیشان طریقے سے رہتا تھا اور ان سادہ لوح

کوہستانیوں کو اس نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ پیغمبر ہے۔ جب وہ حشاشین[1] میں سے کسی جوان کو مہم پر بھیجنا چاہتا تو اسے وہی دوا پلا دیتا۔ پھر وہاں سے نکال کر اسے اپنے محل میں لے آتا۔

"جب یہ جوان جاگتا تو وہ اپنے کو بہشت کے بجائے قلعے میں پاتا۔ وہ اس بات سے چنداں خوش نہ ہوتا۔ پھر اسے شیخ کے سامنے لے جایا جاتا۔ وہ چونکہ اسے پیغمبر سمجھتا تھا اس لیے اس کے سامنے ادب سے جھک جاتا۔ شیخ اس سے پوچھتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور وہ جواب دیتا کہ بہشت سے آیا ہے جنھیں وہاں جانے کی ابھی اجازت نہ ملی تھی مگر وہاں موجود ہوتے ان پر بہت گہرا اثر پڑتا۔

"جب کبھی شیخ کسی شہزادے یا بادشاہ کو قتل کرانا چاہتا وہ اپنے ایک جوان سے کہتا "جاؤ، اور فلاں ابن فلاں کو قتل کر آؤ۔ جب تم واپس آؤ گے تو میرے فرشتے تمہیں بہشت میں لے جائیں گے،" انھیں اس پر کامل یقین تھا۔ اس کا ایسا کوئی بھی حکم نہ ہوتا تھا جسے وہ خطروں میں سے گزر کر پورا نہ کرتے۔ انھیں یقین تھا کہ واپس آکر وہ بہشت میں چلے جائیں گے۔ اس طرح اس نے جسے چاہا اپنے آدمیوں سے مروا دیا۔ اسی وجہ سے تمام شہزادے اس سے خائف رہتے تھے اور اس کے باجگزار بن جاتے تھے کہ کہیں وہ ان سے خفا نہ ہو جائے[2]۔"

---

[1] حشاشین۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے ASSASIN کا لفظ نکلا ہے۔ اس لفظ کو صلیبی اپنے ساتھ واپس لے گئے۔ جیمز برٹ کے بیان میں جو ۱۳۳۲ء میں لکھا گیا تھا اسی طرح پایا جاتا ہے۔

[2] ایشیا کے برسر اقتدار لوگ جنھیں حشاشین نے قتل کیا ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ مصر کا ایک خلیفہ، حلب، دمشق اور موصل کے شہزادے، ٹریپولی کا کاؤنٹ ریمنڈ، مانٹ سیراٹ کا کانرڈ (گو آخرالذکر کے متعلق ایک عرصے تک مشہور رہا کہ اسے رچرڈ نے قتل کرایا تھا) سبھی اس میں شامل تھے۔ حشاشین

(۱۲)

تبریز

ایشیا کے اس مرکزی شہر کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے تخیل کو پرواز میں لانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بحیرۂ خزر اور ارمینیا کے درمیان چھپا ہوا تبریز آج کھنڈروں سے پُر اپنی گزشتہ سطوت کے خوابوں میں گم نظر آتا ہے۔ اس کا نام اس کے پڑوسی موصل سے بھی زیادہ غیر معروف ہے جو کم از کم تیل کے معاہدوں کے لیے تو بین الاقوامی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

تبریز جیسے بعض یورپی مصنف توریز لکھتے تھے تیمور کے عہد میں دنیا کے تجارت کا مرکز تھا۔ یہیں عظیم خراسانی شاہراہ بغداد، ایران اور خلیج فارس کو جاتی ہوئی جنوبی شاخ سے آکر ملتی تھی۔ جن لوگوں نے اسے اس زمانے میں دیکھا ان کی نگاہوں سے اگر دیکھا جائے تو تبریز کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔

مارکو پولو سنہ ۱۲۷۰ء کے قریب اس کے متعلق کہتا ہے: "توریز نہایت بڑا اور شاندار شہر ہے۔ اس کا محل وقوع اتنا عمدہ ہے کہ یہاں بغداد، ہندوستان اور گرم ممالک سے مال تجارت آتا ہے۔ یہاں ارمنی، نسطوری یعقوبی، جارجی اور ایرانی سبھی نظر آتے ہیں۔ اس شہر کے اصل باشندے علاوہ ہیں۔ یہ سب مسلمان ہیں۔"

وینس کی کتب کا ملاحظہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سنہ ۱۳۴۱ء میں جینوا

۵۔ نے غلطی یہ کی کہ مغلوں کے ایک شہزادے کے قتل کا باعث بنے۔ اس پر ان کے تمام قلعے منہدم کردیے گئے۔ تیمور نے اس کام کی تکمیل کی۔ مزید تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہوں بول کارڈیر کا مارکو پولو اوڈوڈ ویک کا سفرنامہ، جان ویل کا روزنامچہ اور رشیدالدین کی تاریخ "ایران کے مغل" کا کوآٹرے میرے کا کیا ہوا ترجمہ۔

والوں کا ایک کارخانہ موجود تھا۔ جو بیس تاجر اس کی مجلس کے رکن تھے۔ کارخانے سے مراد یہاں صرف مال گودام ہے۔

مشہور ایرانی مؤرخ رشید الدین لکھتا ہے: "تبریز میں شہنشاہ اسلام (غزن۔ ایل خان) کے سایے کے نیچے فیلسوف، منجم، ادیب اور مؤرخ جمع تھے جو ہر مذہب و ملت سے متعلق تھے۔ خطا، ہند، کشمیر، اور تبت کے لوگ۔ اویگور اور دوسرے ترک قبیلے۔ عرب اور فرنگی (یورپی)۔"

ابن سید اور مصطوفی کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مضافات کو شامل کر کے اس کا محیط پچیس ہزار قدم تھا۔ اس کی مساجد، دارالعلوم اور شفاخانوں کی دیواریں سنگ مرمر کی یا کم از کم سامنے کی دیواروں پر منقش کانسی کی اینٹوں کا کام ضرور ہوتا تھا۔ سراؤں اور مہمان خانوں کے علاوہ دو لاکھ گھر تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی آبادی بارہ تیرہ لاکھ کے قریب تھی۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایک زلزلے کی وجہ سے چالیس ہزار کے قریب آدمی مر گئے۔

ابن بطوطہ کہتا ہے کہ مشک و عنبر فروشوں کے بازار علیحدہ تھے اور جب وہ جوہریوں کے بازار سے گزرا تو جواہرات کی چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہاں نفیس لباس پہنے غلام تاتاری خواتین کو ہیرے جواہرات پیش کر رہے تھے۔

پادری سیاحوں میں سے جورڈاین ڈی سیوارک جو ۱۳۲۰ء میں وہاں گیا اس شہر کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

فرا اودورک بھی اسی زمانے میں وہاں گیا۔ وہ لکھتا ہے: "میں تم سے کہتا ہوں یہ شہر تجارت کے لحاظ سے دنیا میں لاثانی ہے۔ ہر شے بافراط ملتی ہے۔ یہ اتنا عظیم الشان ہے کہ دیکھنے کے بغیر باور نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں کے عیسائی کہتے ہیں کہ جتنا مالیہ یہ شہر اپنے بادشاہ کو ادا کرتا ہے وہ پورے فرانس کے مالیے سے زیادہ ہے۔"

سترھویں صدی میں جب اس کی آبادی بتدریج گھٹ چکی تھی اس وقت بھی اس کی

آبادی چارٹون کے مطابق ساڑھے پانچ لاکھ سے زائد تھی۔

سمرقند جس کا محیط مضافات کو چھوڑ کر دس ہزار قدم تھا تبریز سے چھوٹا تھا۔ کالویخو لکھتا ہے کہ سمرقند اراک میں ڈیڑھ لاکھ کی آبادی تھی۔ اراک سے مراد یہاں صرف حصار ہے۔

---

(۱۴)

کالویخو تبریز میں

کسنیلیہ کے بادشاہ کا حاجب کالویخو بھی تبریز سے گزرا اور وہاں کے حالات چھوڑ گیا ہے۔ تیمور پہلی مرتبہ تبریز میں کالویخو کے جانے سے کوئی پندرہ سال پیشتر داخل ہوا اور تاتاری فاتح کے اور شہروں میں سے تبریز کے حالات اس سیاح نے زیادہ وضاحت سے دیے ہیں۔

کالویخو کے درج کردہ حالات صرف اسی وجہ سے اہم نہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے، یورپی اشخاص پر مشرقی شہروں کا اثر کس طرح پڑتا تھا بلکہ ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تیمور مفتوحہ شہروں کی نگہداشت اور ترقی کا کس قدر خواہاں تھا۔ یورپی مصنفوں نے بعض ایسی عمارتوں کے جل جانے کا ذکر بھی کیا ہے جن کے پتھروں پر آج بھی کسی آتش زدگی کے نشان نظر نہیں آتے۔ یہ درست ہے کہ تیمور کے حملوں سے خاصی تباہی و بربادی ہوئی تھی اس کے باوجود جو شہر مدافعت کے بغیر مطیع ہو جاتا وہاں تیمور کسی قسم کی سختی نہ کرتا تھا۔ رفاہ عامہ کی عمارتیں مثلاً مساجد، دار العلوم، مدرسے، مزارات اور آب پاشی کے وسائل کو وہ ہر صورت میں بچانے کے احکام دیا کرتا تھا۔ جن شہروں کو اس نے برباد کیا ان میں سے اکثر کے متعلق اس نے دوبارہ تعمیر کرنے کے احکام جاری کیے۔ تیمور کی موت کے بعد بھی ہم مشرقی تاریخوں میں ان شہروں کی آبادی کی تفاصیل دیکھتے ہیں جن پر تیمور حملہ آور

ہوا تھا حالانکہ یورپی تاریخیں انھیں شہروں کو کوٹلے اور کھنڈروں کے ڈھیر بتاتی ہیں۔

اس غلط فہمی کی بھی وجہ یہ ہے۔ یورپی تذکرہ نویس صرف ان صوبوں سے واقف تھے جو سمرقند سے بہت دور تھے۔ مثلاً جنوبی روس، مغربی ایشیائے کوچک، شام کا ساحل، ایران کا جنوبی حصہ اور ہندوستان۔ تیمور کے لیے ان ممالک کے برباد شدہ شہروں کی مرمت یا تعمیر نو کے لیے کوئی فائدہ نہ تھا۔ بلکہ وہ جو کچھ یہاں سے حاصل کر سکا اسے اٹھا کر سمرقند لے گیا۔ اس کی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ مملکت کے سرحدی علاقوں کو غیر آباد رکھنا چاہتا تھا اور اندرونی علاقوں کی آبادی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ شاہ رخ کی شاندار حکومت کی یہی بنیاد تھی۔ ایران، سمرقند اور موجودہ افغانستان اس میں شامل تھے۔ ایران کی ساختمانی کا سنہری دور بھی انھیں بنیادوں سے شروع ہوا۔ دو ہزار میل کی مسافت یعنی غزنی سے تبریز تک جو پورے یورپ کے طول کے برابر ہے، یہ خوشحالی پھیلی۔ اور اسی علاقے کو تیموری تعمیرات کا علاقہ کہا جا سکتا ہے۔ صدیوں تک تبریز کے سوا یورپی اقوام کے لیے یہ تمام علاقہ موجود ہی نہ تھا۔ انھیں اس کا مطلق علم نہ تھا[1]۔

---

[1] اس کتاب میں جان بوجھ کر تیمور کے کردار کے ظالم پہلو یا جو بربادی اس نے کی اسے چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ہمارے سامنے وہ اتنی مرتبہ صرف کلہ میناروں کے معمار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اس کی بربریت کو اتنا اجاگر کیا گیا ہے کہ اصلی تیمور کو پیش کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ آج کل کے ایک مصنف نے اس کے متعلق لکھا ہے "چنگیز خان سے زیادہ خوفناک" مگر ہمارے سامنے مستشرق یہ بھی پیش کر رہے ہیں کہ تیموری تہذیب کتنی بلند تھی۔

اس کے برعکس داستان ہزار و یک شب کے ذریعے ہم ہارون الرشید کے متعلق یہ سمجھتے رہے ہیں کہ وہ از حد رحمدل بادشاہ تھا۔ حالانکہ ایشیائی تاریخ سے ظاہر ہے کہ اس کے مظالم تیمور سے تعداد میں کم ہوں تو ہوں، نوعیت میں ہرگز کم نہ تھے۔ تیمور کہتا ہے "مشرقی رومانی ہارون الرشید کے نام کے گرد جادو اور سحر کا ایک ہالہ بنا دیا ہے۔"

کالو بخو تبریز میں

کالو بخو کہتا ہے ،

" داہنی طرف کی پہاڑیوں سے نکل کر ایک دریا بہتا ہے اور اسے بہت سی نہروں ندیوں اور نالیوں میں تقسیم کر کے گلیوں کے بیچ میں سے گزارا جاتا ہے۔ گلیاں صاف ستھری ہیں۔ ان کے دونوں طرف بلند عمارتیں ہیں جن کے بہت سے دروازوں کے اندر دکانیں ہیں۔ ان کی خبر گیری کے لیے افسر مقرر ہیں۔ یہاں وہ کپڑا، ریشم، روئی اور باقی اشیاء بیچتے ہیں۔ اس شہر کی تجارت بہت وسیع ہے۔

" ایک جگہ ایسی ہے جہاں لوگ خوشبوئیں اور عورتوں کے لیے غازہ و سرخی بیچتے ہیں اور یہاں بہت سی عورتیں خوشبو اور رنگ لگانے آتی ہیں۔ باہر جاتے ہوئے یہ عورتیں سفید چادر میں لپٹی ہوتی ہیں۔ گھوڑوں کے بالوں کی جالی ان کی آنکھوں کے سامنے لٹک رہی ہوتی ہے۔

" بڑی عمارتوں کو کاشی کی اینٹوں سے مزین کیا گیا ہے اور یونان میں بنا ہوا سنہری اور نیلا کام ان پر ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عمارتیں بڑے بڑے امیروں نے تعمیر کرائیں جو ایک دوسرے سے مقابلہ کیا کرتے تھے اور اپنی دولت اس طرح خرچ کرتے تھے۔ ان عمارتوں میں سے ایک بہت بڑی ہے۔ اس کے گرد دیوار ہے۔ یہ نہایت خوبصورت ہے اور اس پر بہت دولت صرف ہوئی ہے۔ اس میں لاتعداد کمرے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسے اویس نے اس خزانے سے بنوایا تھا جو شاہ بابل سے اس نے حاصل کیا تھا۔

" جو تجارت تبریز میں سے گزرتی ہے اس کی وجہ سے یہ شہر بہت دولتمند ہے کہتے ہیں کہ پہلے اس کی آبادی زیادہ تھی مگر اب بھی اس میں دو لاکھ آباد گھر موجود ہیں۔ یہاں بہت سے بازار ہیں جن میں مختلف قسم کا پکا ہوا گوشت اور مختلف پھل بکتے ہیں۔

" یہاں کے میدانوں اور گلیوں میں فوارے چلتے ہیں۔ گرمیوں میں وہ انھیں برف سے بھر کر تانبے کے جگ پاس رکھ چھوڑتے ہیں تاکہ لوگ ٹھنڈا پانی پی سکیں۔ تبریز کے مجسٹریٹ

نے جسے داروغہ کہتے ہیں سفیروں کا نہایت احترام سے استقبال کیا۔

"یہاں خوبصورت مسجدیں اور حمام ہیں جن کے مقابلے کے میرے خیال میں کہیں نظر نہیں آسکتے۔ جب سفیروں نے روانگی کا خیال ظاہر کیا تو ان کے لیے اور ان کے ساتھیوں کے لیے گھوڑے حاضر کیے گئے۔ یہاں کے بادشاہ نے یہاں گھوڑے رکھ چھوڑے ہیں تاکہ جو کوئی اس کے پاس جانا چاہے وہ جا سکے۔ راستہ بھر اسے گھوڑے مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح یہاں سے سمرقند تک ڈاک کا انتظام ہے۔"

---

(۱۴)

امیر کا شامیانہ

تیمور کے ایک خیمہ محل کی تفصیلات کلاویخو نہایت خوبی سے پیش کرتا ہے۔ وہ اسے بڑا اور بلند شامیانہ کہتا ہے:

"اس کی چوڑائی ایک سو قدم تھی اور اس کے چار کونے تھے۔ اس کی چھت گرجے کے مینار کی طرح گول تھی۔ اسے بارہ چوبوں پر لگایا جاتا تھا۔ ان کی گولائی آدمی کے سینے کے برابر ہوگی اور ان کے گرد سنہری، نیلا اور دوسرے رنگ تھے۔ جب اسے لگایا جاتا تو گاڑی کے پہیوں جیسے پہیے استعمال کرتے۔ انھیں آدمی گھماتے اور جہاں جہاں ضروری ہوتا اسے باندھے جاتے۔

شامیانے کی چھت سے کمخاب کے کپڑے لٹکے ہوتے جن کی وجہ سے ایک طرف سے دوسری طرف تک قوسیں بن جاتیں۔ اس مربع شامیانے کے باہر برآمدے بنے ہوتے تھے اور ان سے قریب پانچ سو فیتے لٹک رہے ہوتے۔ اندر قرمزی رنگ کی قالین تھی جس پر زربافی کا کام کیا ہوا تھا۔ چاروں کونوں میں پر سنبھالے ہوئے شہبازوں کے

مجسمے تھے۔ شامیانے کے باہر سفید، سیاہ اور زرد رنگ کی ریشمی دھاریاں تھیں۔

" چاروں کونوں پر اونچی اونچی چوبیں تھیں جن کے اوپر تانبے کے گنبد تھے اور ہلال بنے ہوئے تھے۔ شامیانے کے اوپر ریشمی کپڑوں کا انبار تھا اور ان کے مینار سے بنے ہوئے تھے۔ اس کا ایک دروازہ تھا۔

" یہ شامیانہ اتنا بڑا اور بلند تھا کہ دُور سے قصر نما تھا۔ یہ عجیب و غریب چیز دیکھنے کے قابل تھی۔ اس میں اتنی دلکشی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔"

---

(۱۵)

عظیم الشان گنبد

تیمور سے پہلے ایرانی ساتستانی کے گنبد نوک دار قسم کے تھے جو باہر کی طرف پھیلے ہوئے نہ ہوتے تھے۔ تیمور کے اوائل دور کی عمارتوں میں ان سے کسی قسم کا اختلاف نظر نہیں آتا۔ البتہ بی بی خانم اور اس کے اپنے مزار گورِ امیر میں پھیلتے ہوئے شاندار وضع کے گنبد ہیں جو بعد میں ہندوستان کے مغل عہد میں وہاں بھی پہنچے۔ بہت عرصہ بعد روسیوں نے بھی ان کی نقل اتاری مگر ان کے پھیلاؤ میں وہ تناسب قائم نہ رکھ سکے اور زیادہ بڑھا دیا۔

کے۔ اے۔ سی۔ کریس ویل اپنی کتاب "ایران میں گنبد کی ایجاد اور ترقی کی تاریخ" میں لکھتا ہے کہ تیمور کے لیے اس قسم کے گنبد ہندوستان میں دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے کہ شمالی ہندوستان کے مزاروں پر اس قسم کا کوئی نقشہ موجود نہ تھا۔ اس قسم کا صرف ایک ہی گنبد موجود تھا جو دمشق کی امیہ مسجد کے اوپر تھا۔ وہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور جس آتش زدگی سے شہر تباہ ہوا وہ بھی اسی میں جل گیا تھا۔ وہ بہت بڑا تھا اور نہایت شاندار۔ پورے میدانی علاقے پر چھایا ہوا تھا۔ اسی میدان میں تیمور نے ایک مہینے تک

ٹراڈ کیا تھا اور وہ اسے ہر روز دیکھتا تھا۔

"تیمور فنِ ساختمانی کا دلدادہ تھا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس پر اس عالیشان عمارت نے اثر نہ کیا ہو جو اسلام کے وسطی دَور کی عظمت کا عجیب و غریب نمونہ تھی۔ اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ اس نے اس عمارت کو از سرِ نو سمرقند میں تعمیر کرنے کا حکم دیا ہو۔ بہ نسبت اس کے کہ اس نے ہندوستان کے کسی ٹوپے کی نقل اتروائی ہو۔ اس بات کا خاصا ثبوت ہے کہ تیمور فنِ ساختمانی کا گرویدہ تھا۔ پرانی دہلی کی جامع مسجد کا اس پر خاصا اثر ہوا اور اس کا ایک نمونہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے قطب مینار کو سراہا اور معماروں کو اپنے ساتھ لیتا گیا تاکہ وہاں اسی قسم کا مینار تعمیر کرائے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔"

مسٹر کریسویل مزید وضاحت کے طور پر کہتا ہے کہ بی بی خانم کے گنبد اور دمشق کے برباد شدہ گنبد کی پیمائشیں باہم برابر ہیں۔ علاوہ ازیں دمشق سے تیمور کی واپسی کے بعد بی بی خانم پہلی عمارت تھی جو تعمیر کی گئی۔ اس کی تعمیر میں دو تین سال صرف ہوئے۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ تیمور نے دمشق کی واحد مثال سے اسے نقل کیا۔

ابن بطوطہ اس کے متعلق لکھتا ہے "چاہے آپ شہر کو کسی سمت سے کیوں نہ آئیں سب سے پہلے یہی گنبد آپ کو نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہوا میں معلق ہے۔"

یہ بلب جیسا پھولا ہوا گنبد تیمور کی پسند کی وجہ سے دنیا میں محفوظ رہ گیا۔ اس کی دوبارہ تعمیر صرف تیمور ہی کر سکتا تھا جس کے تصرف میں اس عصر کے تمام ذرائع تھے۔ اس کی اولاد نے اس کے بعد اس کو تکمیل تک پہنچایا۔ اس کی اولاد جو ہندوستان کے شاہانِ مغل کے نام سے مشہور ہے اسے اپنے ساتھ اس سرزمین میں لے گئی۔ وہاں وہ سب سے پہلی بار ہمایوں کے مقبرے پر نمودار ہوا اور آخر اس اعجوبۂ روزگار شاہکار عمارت تاج محل میں اپنے عروج کو پہنچا جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔

۱؎ ایشیاٹک سوسائٹی کا رسالہ ۱۹۱۴ء

کلہ مینار

یورپی تاریخ میں دشمن کے مقتولین کے سروں سے تاتاریوں کا کلہ مینار تعمیر کرنا ہمیشہ تیمور کے نام سے وابستہ کیا گیا ہے۔ وہ خوفناک ہوتے تھے اور گھناؤنے طریقے پر دلکش بھی اور اکثر تواریخ کے صفحات میں انھیں اسی صورت میں بیان بھی کیا گیا ہے۔ مگر تیمور پر آج کی نرم رَو تہذیب کی رُو سے خونی لگانا درست نہ ہوگا۔

اگر اس عصر کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہرات کے ملک اور دوسرے شہزادے اس طرح فتح کی یادگاریں عام طور پر تعمیر کیا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ تیمور کے کلہ میناروں سے چھوٹے ہوتے تھے۔

قتل و خون کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ خیال رہے کہ تاتاری فاتح اس ماحول کی پیداوار تھا اور اس گردوپیش میں رہتا تھا جہاں رحم کو عام طور پر کمزوری کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس عصر کے یورپی شہزادے تیمور سے زیادہ رحمدل ہرگز نہ تھے۔ سیاہ شہزادہ (بلیک پرنس) نے لموگس کو تاراج کیا۔ ڈینانٹ کے مقام پر چارلس آف برگنڈی نے اس طرح قتل و خونریزی کی جس طرح بھیڑوں میں بھیڑیا کرتا ہے۔ آگن کورٹ کے مقام پر انگریزوں نے صرف اس لیے فرانسیسی قیدی قتل کر دیئے کہ آخری معرکے میں ان سے فارغ ہو جائیں۔ نکوپلس کی لڑائی سے پہلے انگریز، جرمن اور فرانسیسی صلیبیوں نے سرویوں اور ترک قیدیوں کو قتل کر دیا۔ تیمور کے قتل صرف اتنی بات میں مختلف تھے کہ ان کا پیمانہ وسیع ہوا کرتا تھا۔

کرنل سائکس بیان کرتا ہے کہ تیمور جب کبھی قتل کا حکم دیتا وہ جنگی ضرورت کی وجہ سے ہوتا تھا۔ اس کے متعلق گو شک ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ سمرقند کا حکمران اس عصر کے اکثر

حکمرانوں سے زیادہ رحمدل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر محاصرے کے پہلے دن اس کے خیمے پر سفید جھنڈا لہرایا کرتا۔ اس سے یہ مراد ہوتی تھی کہ اگر شہر کے باشندے چاہیں تو اطاعت پیش کر کے تباہی سے بچ سکتے ہیں۔ دوسرے دن سرخ جھنڈا لہرایا جاتا یعنی اگر شہر اب مطیع ہونے پر رضامند ہو جائے تو صرف اس کے سرداروں کا سر قلم کیا جائیگا۔ اس کے بعد کالا جھنڈا لہرایا جاتا تاکہ اب کفن دفن کے سوا اور کسی بات کی توقع نہ رکھیں۔ اس کہانی کی سچائی ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت موجود نہیں البتہ یہ تیمور کی طبیعت کو خوب ظاہر کرتی ہے۔

ہرات پہلی بار معمولی سرزنش کے بعد چھوڑ دیا گیا البتہ دوسری بار ازحد سختی کا سلوک کیا گیا۔ لیف اور پہلی دفعہ خراج دے کر بچ گیا مگر دوسری دفعہ برباد کر دیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اندر گنج کو کھنڈروں کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا مگر ہم آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ اسے از سر نو آباد کرنے کا حکم بھی دیا گیا۔

اگر تیمور میں چنگیز خاں کا ظلم اور غصہ ہوتا تو کسی بھی شہر کا دوبارہ محاصرہ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تیمور بغاوت فرو کرنے میں حد درجہ بے رحمی سے پیش آتا تھا۔

اس کے دوست اور ساتھی اس میں بے رحمی کا شائبہ بھی نہ پاتے تھے۔ اس کے دشمن اس میں فروگذاشت کا مادہ بیکار ڈھونڈتے تھے۔ ایشیا کی تواریخ اس کے کارنامول اور اولوالعزمیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ کہ اس کی بے رحمی کی طرف۔ عرب شاہ جیسے تیمور سے نفرت تھی اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ تیمور نے اوروں کی زندگیوں کو فراخدلی سے استعمال کیا۔ مگر وہ اپنی جان سے بھی ہمیشہ بے پروا رہا۔

---

(۱۷)

تیمور کا کردار

دنیا کی تاریخ میں ایسے آدمی کم ہونگے جن کے ساتھ تیمور سے زیادہ محبت اور نفرت کی گئی ہے۔ دو وقائع نگار جو اس کے دربار میں رہتے تھے، ان میں سے ایک اسے شیطان کا لبادہ پہناتا ہے اور دوسرا بے مثل انسان کا۔

ابن عرب شاہ اسے بے رحم قاتل، دغابازوں کا استاد اور شیطان کہتا ہے۔

شریف الدین کہتا ہے:

"جرأت اور دلیری نے اسے تاتاریوں کا شہنشاہ اور چین کی سرحد سے یونان تک پورے ایشیا کا مالک بنایا . . . . . وہ خود حکومت کرتا تھا۔ اس کا کوئی وزیر نہ تھا۔ وہ ہر بات میں کامیاب رہا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ فراخدلی اور اخلاق سے پیش آتا تھا۔ سوا ان لوگوں کے جو اس کے احکام کی تعمیل سے انکار کرتے۔ انھیں وہ سخت سے سخت سزائیں دیتا۔ وہ عدل پرست تھا۔ اس کی مملکت میں اگر کوئی ظلم ڈھاتا تو وہ سزا پائے بغیر نہ بچتا۔ وہ علم دوست تھا اور عالموں کی قدر کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ فنونِ لطیفہ کو ترقی دینے کی فکر میں رہتا۔ وہ منصوبہ بنانے میں، پھر اس پر عمل کرنے میں پوری جرأت سے کام لیتا۔ جو اس کی خدمت کرتے تھے ان پر وہ ہمیشہ مہربان رہتا۔"

موجودہ زمانے کے مصنفوں میں سے سر پرسی سائکس اور لیون کہون شریف الدین کی رائے سے متفق ہیں۔ آرمینیس ویمبری کا بھی یہی خیال ہے۔ ایڈورڈ جی۔ براؤن نے سر جان میلکم سے یہ اقتباس پیش کیا ہے:

"جس طرح کا قائد تیمور تھا ضروری ہے کہ اس کے سپاہی اس کی پرستش کریں. . . . ملک کے دوسرے طبقوں کی آراء سے وہ بالکل بے پرواہ تھا۔ اس بادشاہ کا نصب العین

فاتح کی شہرت تھا۔ وہ عظیم الشان شہر کو برباد کر دیتا اور پورے صوبے کی آبادی کو تہ تیغ کر دیتا۔ اگر اس کے خیال میں اس اقدام سے لوگ خوفزدہ ہو کر اس کے ارادوں کی تکمیل پر رضامند ہو جائیں گے ...... گو تیمور دنیا کے بہترین فاتحوں میں شامل ہے مگر حکمرانی کے لحاظ سے وہ اتنا ہی ناقابل تھا۔ وہ دلیر، فراخدل اور قابل تھا مگر ساتھ ہی ساتھ ظالم، سخت گیر اور خود پسند۔ اپنی خوشی اور سطوت و عزت کے مقابلے میں وہ تمام انسانوں کی خوشیوں کو پرکاہ سمجھتا تھا۔ اس کی طاقت بے بنیاد تھی۔ وہ اس کی شہرت کے بل بوتے پر قائم رہی اور جونہی اس کی موت واقع ہوئی یہ مملکت پگھل گئی۔ اس کے لڑکوں نے اس کے کچھ ٹکڑے چن لیے مگر صرف ہندوستان ہی میں وہ زیادہ عرصے کے لیے اقتدار قائم رکھ سکے۔ اس ملک میں ہم اب بھی اس خاندان کا چراغ ٹمٹماتا ہوا دیکھ سکتے ہیں جہاں ایک مغل مسند نشین ہے۔ یہاں اب ان کی پہلی سی سطوت کی معمولی سی جھلک موجود ہے۔ اس میں ہمیں انسانی عظمت کے بتدریج تنزل کی مثال ملتی ہے اور ہم حیران ہوتے ہیں کہ صرف چند صدیوں نے تیمور کی نسل کے نمائندوں کو کہاں سے کہاں لا کر کھڑا کیا ہے[1]۔"

---

[1] مصنف نے اس وقت لکھا تھا جب نام نہاد مغل شہنشاہ ابھی دہلی کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ برآؤن کی طرح یہ بھی ایران سے متعلق تھا اور وہ تیمور کو فاتح کے رنگ میں دیکھتا ہے۔ اس تصنیف میں ذی شان تیمور کو اس کی رعایا اور اس کی قوم کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اور ان لوگوں کی نظر سے نہیں دیکھا گیا جو اس کے قیدی تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے۔ نہ اسے یورپ، ایران اور ہندوستان کے مؤرخوں ہی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔

(۱۸)

تیمور اور علماء

یہ صاف ظاہر ہے کہ تاتاری فاتح قانون اسلام کا زیادہ پابند نہ تھا۔ وہ اپنی مرضی سے ہر بات کرتا تھا۔ مذہب کے متعلق ہم اس کے صحیح نقطۂ نظر سے واقف نہیں ہو سکتے۔ اتنی بار یہ کہا گیا ہے کہ وہ مذہب کے جوش کے تحت اسلام کے فروغ کے لیے سب کچھ کرتا تھا کہ اس نظریے پر غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے اپنے اعمال ہی اس بات کی دلیل کا کام دے سکتے ہیں۔

اس نے آخر تک اسلامی نام نہیں لیا۔ مثال کے طور پر ہارون الرشید کا نام یا نورالدین کا نام ہے۔ اس نے اپنے بیٹوں کو بھی اسلامی نام نہیں دیے۔ ان کے نام جہانگیر اور شاہ رُخ وغیرہ تھے۔ صرف اس کے پوتوں کے وقت اسلامی نام پیر محمد وغیرہ شروع ہوتے ہیں اور یہ نام اس نے نہ دیے تھے۔

اس نے کبھی سر نہ منڈایا تھا، نہ کبھی عمامہ ہی باندھا یا شرعی قسم کا لباس پہنا۔ ان کے پڑوسی تاتاریوں کو نیم مسلمان اور بعض اوقات لامذہب اور کافر کہتے تھے۔ اسلام کے صحیح حکمران خلیفۂ مصر اور عثمانی سلطان تھے۔ ان کی نظر میں تیمور لامذہب اور جنگلی تھا۔ اگر حقیقت میں وہ ایسا نہ تھا، وہ اسے خوفناک دشمن سمجھتے تھے۔ تاتاری حال ہی میں اسلام کے حلقے میں شامل ہوئے تھے اور مذہب سے زیادہ وہ خنگ کو مقدم سمجھتے تھے۔

تیمور نے یورپ کے عیسائی بادشاہوں سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کی کوشش کی۔ ترکوں نے اس وقت اس بات سے احتراز برتا تھا۔ اپنے خطوط میں کبھی اس نے اپنے آپ کو اسلام کا بادشاہ نہیں کہا جو عام طور پر مسلمان بادشاہوں میں رواج ہے۔ اس نے اسلام کے مقدس شہروں مشہد، مکہ اور بیت المقدس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اتنا ضرور ہے کہ

کوچ کے دوران میں جو مزار آجاتے ان پر وہ ضرور جاتا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ دکھاوے یا شرق کی وجہ جاتا تھا۔
اس کا مذہبی احکام کا کسی حد تک پابند ہونا اور مساجد کی حرمت کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔
اس عصر کے یورپ میں بھی روزمرہ کی زندگی مذہب کی عائد کردہ پابندیوں کی قیود میں جاری رہتی تھی۔
رفاہِ عامہ کی عمارتیں اکثر مساجد اور دارالعلوم ہی کی شکل میں تھیں اور انھیں تباہ کرنا مذہب کی صریح
بے حرمتی کے مترادف ہوتا۔ تیمور کے سپاہیوں کی اکثریت پابند شرع مسلمانوں کی تھی، اس لیے
اس نے اپنی روزمرہ کی زندگی کو ان کے رجحانات کے مطابق ڈھالنا بہتر سمجھا تھا۔

دو بار اس طرح ہوا کہ اس نے ایک قلعے کی فوج کے مسلمانوں کو بخش دیا اور عیسائیوں
کو قتل کرا دیا۔ ان قلعوں نے اطاعت سے انکار کیا تھا۔ یوں تو یہ دو واقعات اس کی عصبیت
پر دلالت کرتے ہیں مگر اتفاقاً یہ عیسائی اس کی تاتاری فوج کو بے اندازہ نقصان پہنچانے کا موجب بنے
تھے اور یہ ان کے قتل سے مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس کم از کم تین مرتبہ یعنی ماسکو،
قسطنطنیہ اور جنوبی ہندوستان میں اگر وہ چاہتا تو غازی کا لقب پا سکتا تھا۔ اگر وہ ذرا سا بھی راستے
سے ایک طرف جاتا تو عیسائیوں اور ہندوؤں سے لڑ کر اسلام کا فاتح کہلا سکتا تھا۔ اس نے
ایسا نہ کیا۔ جارجی عیسائی اس کے راستے میں آئے اور روند ڈالے گئے۔ سمرنا ایشیائے کوچک کا
مضبوط مقام تھا اور اسی لیے اس نے اسے مطیع کیا۔

خاصا ثبوت موجود ہے کہ سمرقند اور تبریز میں یہودیوں، نسطوری عیسائیوں، مالکیوں اور
ایسے ہی غیر مسلموں کی آبادیاں موجود تھیں۔ اور ان کے گرجے ابھی موجود تھے۔ کم از کم ایک مرتبہ اس نے
عیسائی بشپ کو سفیر کے طور پر استعمال کیا۔ سب سے زیادہ ثبوت اس کے مسلمان مداحوں نے پیش
کیا ہے جو ہر ممکن طریقے سے اسے اسلام کا شیدائی ثابت کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے بعض
کہتے ہیں کہ وہ سنی تھا۔ دوسرے یہ کہتے ہیں کہ وہ شیعہ تھا۔ اس نے خود صرف اتنا لکھا:
"میں تیمور ۔ خدا کا بندہ"

کتب نامہ

۱

مآخذ

حکومت کے آخری برسوں میں تیمور نے دربار کے اصحاب قلم کو حکم دیا کہ وہ واقعات قلم بند کرتے رہا کریں*۔ ان میں بیشتر اوگیور اور فارسی میں لکھے گئے ۔

بغداد کا صاحب قلم نظام شمس ۱۴۰۰ء میں شامل دربار ہؤا تھا ۔ اسے حکم دیا کہ وہ اس تمام مسالے سے ایک سادہ اور بلا مبالغہ تاریخ مرتب کرے ۔ نظام نے تیمور کی وفات سے ایک سال قبل یہ کام ختم کیا اور اس کا نام 'ظفر نامہ' رکھا ۔ یہ تاریخ فارسی زبان میں تھی ۔

* براؤن ۱۸۳ — بووات ۲۰ — بلوچیٹ ۸۸ — شریف الدین لکھتا ہے کہ تیمور کے ساتھ ہمیشہ وقائع نگار موجود رہتے جو واقعات قلم بند کرتے رہتے ۔ جو افسر اور امیر کسی واقعے کے وقت موجود ہوتے انھیں اس کی تفصیلات پیش کرنی پڑتی تھیں ۔ اور "تیمور میں اتنی برد باری تھی کہ وہ ان واقعات کی تفصیلات کی ترتیب و تالیف خود کرتا ۔ پھر اپنی موجودگی میں اس طرح ان کی صحت کا یقین کراتا : ایک آدمی انھیں بہ آواز بلند پڑھتا اور جب وہ کسی اہم مقام پر پہنچتا تو رک جاتا ۔ اب عینی شاھد اپنا بیان پیش کرتے اور واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ۔ پھر بادشاہ خود واقعے کی سچائی پر غور کرتا ، یادداشت کو گواھوں کے بیان کے ساتھ رکھ کر موازنہ کرتا اور کاتبوں کو بتاتا کہ واقعے کو پیش کرنے کا کون سا طریقہ بہترین تھا ۔ دوبارہ قلم بند ہونے کے بعد وہ اسے پھر سنتا تا کہ یقین ہو جائے، اب کسی کمی بیشی کی ضرورت نہیں ۔"

Histoire de Timur-Bec. مصنف کا دیباچہ

اب اس کا صرف ایک نسخہ دستیاب ہوتا ہے جو برٹش میوزیم میں ہے اور تا حال اس کا ترجمہ نہیں ہؤا ۔

یزد کا ایک معروف ایرانی باشندہ شریف الدین نامی جو تاتاری فاتح کے ساتھ اکثر سفر میں رہا اور آخری دور کی اکثر جنگوں میں موجود تھا ، اس نے ایک اور تاریخ لکھی ۔ یہ بھی فارسی میں تھی اور اس کا نام بھی 'ظفر نامہ' ہی تھا ۔ شریف الدین نے قریب قریب نظام کی تاریخ کو دھرایا ہے اور ساتھ اپنی رائے پیش کی ہے ۔ اس نے وفات تیمور کے واقعات مابعد بھی شامل کیے ہیں ۔ شریف‌الدین بعد ازآں شاہ رخ کے دربار میں رہا اور اسی کے زیر سایہ یہ تاریخ مرتب کی ۔ اس کی تاریخ میں یہ نقص ہے کہ وہ تیمور کے ہر عمل کی تعریف کرتا ہے اور مبالغہ آمیزی و رنگ آمیزی نمایاں ہے ۔ اس کے باوجود وہ تیمور کے دور حکومت کی بے اندازہ تفصیلات پیش کرتا ہے ۔ اسے ۱۴۲۵ء میں مکمل کیا گیا ۔ اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں P'etis de la Croix نے کیا اور ۱۷۲۲ء میں پیرس سے L'Histoire du Timur-bec connu sous le nom du gran Tamerlan کے نام سے شائع کیا ۔ ۱۷۲۳ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی سے انگریزی میں کیا گیا اور The Histoy of Timur-Bec, Known by the Name of Tamerlane the Great, Emperor of the Moguls and Tatars کے نام سے لندن میں شائع ہؤا ۔

اس سے قبل ایک شخص محمد ابن فضل‌اللہ موسوی نے ۱۴۱۲-۱۳ء میں اصحۃ‌التواریخ کے نام سے اپنی کتاب ختم کی تھی ۔ اس کے بعد حافظ ابرو کی زبدۃ‌التواریخ نکلی ۔ حافظ ابرو تیمور کی آخری مہمات میں اس کے ساتھ تھا اور یہ کتاب اس نے تیمور کے ایک پوتے کے حکم سے ۱۴۲۳-۲۴ء میں لکھی ۔ یہ کتاب ضخیم ہے اور نہایت سادہ انداز میں لکھی گئی ہے مگر اب تک اس کا ترجمہ نہیں کیا گیا ۔

اس کے بعد ابن عرب شاہ کی کتاب منظرعام پر آئی ۔ ابن عرب شاہ اس سے قبل سلطان احمد کے دربار میں منشی تھا اور اسے تیمور سمرقند لے گیا تھا ۔ اس کی کتاب 'عجب‌المقدور فی نواب تیمور' حد درجہ تیمور کے خلاف ہے اور بعض مقامات پر تو صریحاً ھجو ہے ۔ انداز بیان صاف اور مختصر ہے ۔ اس کتاب کی قدر آخری مہمات کے لحاظ سے خاصی

ہے ۔ تیمور کا کردار اور تیمور کی وفات کے بعد سمرقند کے حالات قابل دید ہیں ۔ اس کا لاطینی ترجمہ Ahmedis Arabsiadae Vitae by Samuel Manger, Leovardiae 1767—1772 کے نام سے مل سکتا ہے ۔ فرانسیسی میں اس کا غلط سا ترجمہ Histoire du Gran Tamerlan avec la suite de son histoire, by Pierre Vattier, paris 1658 کے نام سے بھی کیا گیا ہے ۔

ان چار تاریخوں پر بعد کے ایشیائی مؤرخوں نے اور کتابیں لکھیں ۔ ان میں سے زیادہ معروف میر خوند کی کتاب 'روضۃ الصفا' ہے ۔ میرخوند کی وفات ۱۴۹۸ء میں ہوئی ۔ اس کے پوتے خوند امیر نے ۱۵۲۰ء میں 'حبیب السیر' لکھی ۔ اس میں تیمور پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے ، خصوصاً مصر اور شام سے جو تعلقات تھے ۔ اس کا خلاصہ D'Herbelot نے ۱۷۸۰ء میں La Bibliotheque orientale میں کیا ۔

تیمور کی 'تزک تیموری' اور 'ملفوظات' کے متعلق ابھی تک مستشرقین کچھ فیصلہ نہیں کرسکے ۔ سترھویں صدی کے شروع میں ایک شخص ابوطالب حسینی نے دعویٰ کیا کہ اس کے پاس تیمور کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یادداشتیں اور حواشی ہیں (تزک تیموری اور ملفوظات) ۔ یہ ضخیم سی کتاب تھی اور سادہ و واضح زبان میں لکھی گئی تھی ۔ واقعات بھی صحیح تھے، البتہ ڈیڑھ سو سال سے اس کی سچائی کے متعلق بحث کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکی ۔

اس کی حمایت میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ اجمالاً یہ ہیں کہ اس میں جو واقعات درج ہیں وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں اور ابوطالب کو اتنی ضخیم کتاب لکھنے اور تیمور کے ساتھ منسوب کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا ۔ علاوہ بریں مشرقی فضلاء نے بھی اسے درست تسلیم کر لیا تھا ۔ اس کا اسلوب بیان بھی نہایت واضح اور بلند تھا جو کبھی کسی ایرانی نے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کسی ایشیائی مؤرخ نے بھی یہ انداز کبھی اختیار نہیں کیا ۔

اس کے خلاف یہ دلائل ہیں ۔ اول تو یہ کہ نظام اور شریف الدین وغیرہ ، جو تیمور کے ہم عصر مصنف ہیں ، اس کا ذکر نہیں کرتے ۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ تیمور کی وفات سے دو سو سال

تک یہ مسودہ چھپا رہا پھر بھی اتنا تو ہونا چاہیے تھا کہ اسے ڈھونڈنے والے نے جس اصل سے ترجمہ کیا تھا کبھی اسے بھی منظر عام پر لاتا ۔

'ملفوظات' اور 'تزک تیموری' کا مسودہ یورپ لایا گیا ۔ ۱۷۸۳ء میں انگریزی ترجمہ مع متن شائع کیا گیا ۔ ترجمہ کرنے والے میجر ڈیوی اور جوزف وائٹ تھے اور یہ Institutes Political and Military written originally in Mogul Language by the Great Timour, improperly called Tamerlane. کے نام سے شائع ہؤا ۔ پروفیسر لینگلے نے ۱۷۸۷ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ بھی شائع کیا ۔

اس کے بعد The Mulfuzat Timury or Autobiographical Memoirs of the Moghul Emperor Timur, written in the Jagtay Turkey Language, turned into Persian by Abu Talib Hussainy. کے نام سے میجر چارلس سٹیورٹ نے ایک ترجمہ لندن سے ۱۸۳۰ء میں شائع کیا ۔

انیسویں صدی کے آخر تک انھیں عموماً صحیح سمجھا جاتا رہا ۔ آر می ٹی اس ویمبری اور لیون کہون کو ان پر اعتراض نہ تھا ۔ بعد کے فضلاء انھیں قبول نہیں کرتے ، ریو انھیں رد کرتا ہے اور براؤن اور بووات کو ان پر اعتراض ہے ۔

اس سلسلے میں کوئی نیا ثبوت پیش نہیں کیا گیا ۔ یہ ناممکن سا نظر آتا ہے کہ تیمور خود اپنے سوانح حیات لکھتا اور اس کا علم شریف الدین اور دوسرے اہل قلم درباریوں کو نہ ہوتا ۔ اگر یہ بات ان کے علم میں ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا ذکر نہ کرتے ۔ اس کی سچائی کے متعلق جو دو دلیلیں پیش کی گئی تھیں ان کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا ہے ۔ ابوطالب نے یہ کتاب شاہ جہان کے عہد میں پیش کی ۔ شاہ جہان ایسے نوادر کا قدردان تھا اور تیمور کی اولاد ہونے کے باعث اس کی قدردانی میں اور اضافہ ہو سکتا تھا ۔ جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'تزک بابری' کی نقل کی گئی ہے ۔

تیسری دلیل یعنی تزک کے واقعات کی درستی اپنی سچائی پر دلالت

کرتی ہے البتہ قدرے محکم ہے اور اس کا جواب نہیں دیا جاسکا ۔ اس کا جواب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب تیمور کے وقائع نگاروں کی تحریریں دیکھی جائیں جن کے متعلق خیال ہے کہ انھوں نے یہ تحریریں نظام کے حوالے کر دی ہوں گی ۔ اور اب ان کا دستیاب ہونا قریب قریب ناممکن ہے*۔

* مصنف نے 'ملفوظات' کو 'تزک بابری' کے ارسکین ۔ لیڈن کے ترجمے سے ملا کر دیکھا ہے اور بعض واقعات کا بیان بالکل مطابقت کرتا ہے ۔ اگر ہم ان ملفوظات کو دو سو سال بعد کی اختراع مانیں تو پھر بعض باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ۔ اول یہ کہ بعض واقعات دھرائے گئے ہیں ۔ اگر وہ اختراع کر رہا ہوتا تو یوں نہ دھراتا ۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہیں سے ترجمہ کر رہا تھا ۔ دوم یہ صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ تیمور 'طرہ' یعنی حکمران خاندان کا فرد نہ تھا ۔ یہ چیز شریف الدین نے نظر انداز کر دی ہے ۔ یہ ایک ایسے شخص کی اختراع نہیں ہوسکتی جو تیمور کی اولاد کے طاقت ور بادشاہ (شاہ جہاں) کو اس کے جد امجد کی تعریف سے خوش کرنا چاہتا ہو ۔

اس کتاب میں 'ملفوظات' سے نقل کیے ہوئے واقعات کو تیمور کے قلم سے منسوب نہیں کیا گیا البتہ بعض واقعات کی درستی تسلیم کی گئی ہے ۔

۲

یورپی مآخذ اور سیاح

برگراں ، پیرے - ' ملک تاتار کے سفر کا تذکرہ اور تاتاریوں کی اصل نسل ، ان کی عادات ، رسوم ، مذہب ، فتوحات اور مملکت وغیرہ کے حالات ۔' پیرس ۱۶۳۴ء

(اپنے وقت کے لحاظ سے نہایت اچھی کتاب ہے مگر از حد کمیاب ہے - مصنف کے پاس ایک نسخہ موجود ہے جس کی وہ انتہائی قدر کرتا ہے ۔ اس فہرست کتب کی اکثر سرخیاں اس میں شامل ہیں)

کلے ویجو ، رائے گونزیلزدی - رائے گونزیلزدی کلے ویجو کی سفارت تیموری کا بیان ۶-۱۴۰۳ء
ترجمہ از کلیمنٹ - آر - مارکھم - ہکلویت سوسائٹی ۱۸۵۹ء

(ہسپانوی درباری جس نے تیمور کے اواخر عہد میں اس کے دربار تک سفر کیا اس کا بیش قیمت بیان)

کانتارینی - 'جوزفا بار بارو اور ایمبروگیو کانتا رینی کے تانا اور ایران کے سفر ' ہکلویت سوسائٹی ۱۸۷۳ء

دی سیسی ، سلویسترے - ' تیمور اور چارلس ششم کی غیر مطبوعہ خط و کتابت پرمبنی یادداشت' ادبی اکیڈیمی کے میموائر چھٹی جلد - پیرس ۱۸۲۲ء

(یہ اُن خطوط کا تجزیہ ہے جو تیمور اور فرانسیسی بادشاہ کے درمیان بھیجے گئے ۔ دی سیسی کا خیال ہے کہ تیمور کا خط انقرہ کی لڑائی سے پہلے لکھا گیا تھا)

فروئے سارت - 'بیانات -' پیرس ۱۸۳۵ء
(ترکوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا تفصیلی بیان)

ہیتھن ، جان - 'مشرق دنیا کے حالات کی تاریخ -'
مؤلفہ فریر ہیتھن : ' ارمینیا کے بادشاہ کا چچیرا بھائی ' ترجمہ
از نکولس سالکن - پیرس ۱۳۷۵ء
(اس زمانے کے مشرق حالات کا مفید خلاصہ)
' تاتاری تاریخ' - مسودات - لیڈن

پیران ڈینو ، پیٹرو - "Magni Tamerlanis Scytharum
imperatoris vita." — فلارنس ۱۵۵۳ء

پوڈیسٹا ، بپٹسٹا - "De gestis Tamerlanis."
(مذکورۂ بالا کتاب کی طرح یہ بھی پرانے یورپی نظریات کی حامل ہے اور ترکی ماخذ پرمبنی ہے - غیر مفید سی چیز ہے)

ریو ، سی - پی - ایچ - 'برٹش میوزیم میں فارسی مسودات کی فہرست -' لندن ۱۸۷۹—۸۳ء
(فارسی ماخوذات اور تاریخیں جن کے متعلق بحث کی جاچکی ہے)

شلٹ برگر ، جوھنس - فرنکفرٹ ۱۵۵۷ء
ہکلویت سوسائٹی کی اشاعت ۱۸۷۹ء ' شلٹ برگر کا سفراور قید -'
(ایک نوجوان جرمن کی الھڑ سی کہانی - یہ شخص نکوپولس کی لڑائی میں اسیر ھوگیا تھا اور بعد میں تیمور کے لڑکے اور تاتاری خان عیدکو کا ملازم رہا)

سعید الدین - 'تاج التواریخ -' ترجمہ از کولر - وئینا ۱۵۷۷ء

سیورک ، جورڈین کیٹالینی - "Mirabilia Descripta
Seqeuitur de Magno Tartaro." فرانسیسی ترجمہ
از کاردیر - پیرس ۱۹۲۵ء

ٹرنر، ٹی۔ ہڈسن ۔ ' ایڈورڈ اول کے غیر مطبوعہ اعلانات اور روس کے مغل بادشاہوں کے ساتھ اس کے تعلقات۔' آرچ جرنل۔ جلد ۸، لندن ۱۸۵۱ء

۳

ثانوی مشرقی مآخذ

ابوالغازی بہادر خان - "Historia Mongolorum et Tatarorum nunc primum tatarice." کازان ۱۸۲۵ء
(بحیرۂ خزر کے خطے کے تاتار خوانین کی تاریخ - تیمور کی وفات کے دو سو سال بعد ایک آزبک خان نے لکھی)

بابر - ' تزک - ' ترجمہ لیڈن اور ارسکن - لندن ۱۸۲۶ء
(یہ خود نوشت سوانح عمری تیمور کی اولاد اور مغل خاندان کے بانی بابر کی لکھی ہوئی ہے - اس میں کہیں کہیں تیمور کے کارناموں کی طرف اشارہ ہے البتہ تیمور کے بعد سمرقند نے علم و فن کا جو سنہری باب دیکھا اس کے لحاظ سے نہایت اہم ہے)

حیدر مرزا - ' تاریخ راشدی -'
تالیف : این - الیاس - ترجمہ : ای - ڈینیسن راس - لندن ۱۸۹۵ء
(چغتائی یا جاٹ شاخ کے مغل خان نے اپنی قوم کے حالات لکھے ہیں - ترجمہ خوب ہے)

ابن بطوطہ - 'سفر نامہ -' ترجمہ : دیفریمری اور سنگوینیتی - پیرس ۱۸۵۳ء
(ابن بطوطہ ایران اور ماوراء النہر سے ہو کر گزرا تھا - یہ تیمور کی ولادت کا زمانہ تھا)

ابن خلدون - از بیرن دی سلین - جرنل ایشیا تک ۴ - سیری - ۳
(دمشق میں تیمور اور اس مشہور زمانہ مؤرخ کی ملاقات کا بیان)

خوند امیر - 'ماوراء النہر کے مغل خوانین کی تاریخ -'
ترجمہ : دیفریمری - پیرس ۱۸۵۳ء

مینارد، بار بیر۔ دی - "Extraits de la Chronique Persane D'Herat."
جرنل ایشیاٹک ہ - سیری - ۱۷
(ہرات کے ملک خاندان کا تذکرہ)

میر الغیر نوائی - جرنل ایشیاٹک ہ - سیری ۷

٤

عام تواریخ

مغل مملکت (دوسرا دور)

بووات ، لوشین - 'مغل مملکت -' پیرس ۱۹۲۷ء
(چنگیز خان کے بعد مغل مملکت کے واقعات کا تذکار)

کہوں ، لیوں - 'ایشیا کی تاریخ سے تعارف : ترک اور مغل - ان کے آغاز سے ۱۴۰۵ء - تک -' پیرس ۱۸۹۶ء
(نہایت عالم شخص کے نظریات ہیں مگر تیمور کے متعلق جو باب ہے اس میں ترکوں کے بار بار ذکر نے اس کی قدر کم کردی ہے)

دی گوئز - 'ہنوں، ترکوں او رمغلوں کی عام تاریخ -' پیرس ۱۷۵۶ء
(اپنے دور کے متعلق نہایت مفصل اور سیر حاصل تذکرہ)

فرشتہ - 'ہندوستان میں اسلامی سلطنتوں کے عروج اور زوال کی ۱۶۱۲ء تک کی تاریخ -' ترجمہ : جے - برگز - کلکتہ ۱۹۱۰ء
(ہندوستان کے حکمران خاندانوں کے مکمل حالات)

گبنز ، ہربرٹ ایڈمز - 'عثمانی مملکت کی بنیادیں -' نیو یارک ۱۹۱۶ء
(موجودہ عصر میں لکھی ہوئی عثمانی بادشاہوں اور خصوصاً بایزید کے حالات کی نہایت اعلیٰ تاریخ)

ہیمر - پرگ سٹال ، جے وان - 'عثمانی مملکت -' ویئنا ۱۸۳۵ء
'سنہری غول کی تاریخ -' بوڈا ۱۸۴۰ء
(بازنطینی اور ترک تذکروں پر مبنی ہے اور اس میں سنہری غول کے خوانین کے حالات ہیں)

هو ورتھ ، سر ھنری - 'مغلوں کی تاریخ ۔' لندن ۸۸—۱۸۷٦ء
(دوسری جلد میں سنہری غول کے خوانین کا مکمل حال اور تیسری جلد میں مظفروں اور سلطان احمد کے حالات ھیں)

لین پول ، سٹینلے - 'سلاطین اسلام ۔' لندن ۱۸۹۴ء
(مسلمان حکمران خاندانوں کے شجرہ ھائے نسب - جہاں تک تاتاریوں کا تعلق ھے هوورتھ سے مدد لی گئی ھے)

لیوچینے ، الیکسنزدی - 'کرغز ، قازق سطح مرتفع اور غولوں کے حالات' روسی سے ترجمہ از ایم - فیری - دی پگنی - پیرس ۱۸۴۱ء

مقریزی - 'مصر کے مملوک سلطانون کی تاریخ ۔'
ترجمہ : ایم - کواترے میرے - پیرس ۱۸۳۷ء

میلکم ، سر جان - 'تاریخ ایران ۔' لندن ۱۸۲۹ء
(تیمور کے کردار کا بہترین اندازہ)

میور ، سر ولیم - 'خلافت ، اس کا عروج ، زوال اور تباھی ۔' لندن ۱۸۹۲ء
(تیمور سے قبل کی عرب طاقتوں کے حالات)

پرائس - 'تاریخ وار جائزہ ۔' لندن ۲۱—۱۸۱۱ء
(تیسری جلد کے پہلے حصے میں تیمور کی مہمات کا خلاصہ پیش کیا گیا ھے)

رمبؤ ، الفرد - 'روس کی تاریخ ۔' پیرس ۱۹۱۴ء
(لیتھوانیا اور پولینڈ کے شہزادوں سے شہزادگان روس کے جو تعلقات تھے ان کا بہترین تذکرہ)

سکرین ، اور ڈینے سن راس - 'وسط ایشیا - روسی ترکستان اور وسط ایشیائی خوانین کی سلطنتوں کی اوائلی ادوار کی تاریخ ۔'
(وسط ایشیا کے سیاسی تغیرات کا نہایت اچھا خلاصہ ھے)

سائکس، لفٹنٹ کرنل - پی - ایم - 'تاریخ ایران۔' لندن ۱۹۱۵ء
(* تیمور کے حالات جو موجودہ ایام میں لکھے گئے ہیں - تیمور کی مہموں اور اس کے عہد کے فن تعمیر کا اچھا جائزہ پیش کیا گیا ہے)

ویمبری، آرمینی اس - 'عہد قدیم سے موجودہ دور تک بخارا کی تاریخ۔' لندن ۱۸۷۳ء
(دو باب جو تیمور سے متعلق ہیں غیر یکساں سے ہیں - اس کے باوجود انسانی فطرت کے سمجھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں)

ویل، گستاو - "Geschichte der Chalifen." مین ہیم - ۶۲-۱۸۴۶ء

ولف - "Geschichte der Mongolen." بریسلاؤ - ۱۸۷۲ء

* اس گروہ کے مؤرخوں نے تیمور کے متعلق بہت کم کہا ہے ۔ صرف میلکم اور ویمبری ذرا تفصیل سے ذکر کرتے ہیں ۔

۵

سمرقند اور آثار قدیمہ

بلینک ، ای - "Antiquites de Samarkande. Revue des Deux Mondes," 1893.
"Mausolee de Tamerlan a Samarkande. Academie des Inscriptions et Belles-Lettres," 1896 pp.272—303.

کریسویل ، کے - اے - سی - 'ایران میں گنبد کی تاریخ اور اس میں تبدیلیاں ۔'
جرنل ، آر - اے - ایس ۱۹۱۴ء

کروزیر - 'سمرقند میں تیموری عہد کی یاد گاریں ۔' پیرس ۱۸۹۱ء

کرٹس ، ولیم ایلی رائے - ' ایشیا کا قلب ۔' نیویارک ۱۹۱۱ء

خانی کاف ، این - ڈی - 'سمر قند ۔'
جغرافیائی سوسائٹی کا بلیٹن ۱۸۹۶ء : ٥ - سیری : ٹ ۱۷

لیکلرک ، جولز - 'سمر قند کے آثار قدیمہ'
رائل بلجیم جغرافیائی سوسائٹی بلیٹن ۱۳ - ۱۸۹۰ء - ٦
صفحہ ۳۲—٦۱۳

لے سٹرینج ، گائی - 'مشرقی خلافت کے ممالک : عراق اور وسطی ایشیا - اسلامی فتوحات سے تیمور کے عہد تک ۔'
(نہایت کار آمد کتاب ہے - اس میں تیموری مملکت کے شہروں ، سڑکوں اور تجارت کی تفصیل دی گئی ہے - اس کے ماخذ ایشیائی مصنف ہیں مثلاً ابن بطوطہ ، مسطوفی ، ابوالفداء وغیرہ)

مارڈ واٹزف، ڈی - ' تیمور کے دارالسلطنت میں - رنگین روس' ۱۹۰۱ء - I (* روسی زبان میں)

ریڈلاف، ڈبلیو - ڈبلیو - 'سمرقند کی تاریخی عمارتیں -' امپیریل رشین جیوگرافیکل سوسائٹی - ۱۸۸۰ء جلد ٦ (روسی زبان میں)

شیولر، ایوگین - ' ترکستان، روسی ترکستان، خوخند بخارا اور کاجا کے سفر کے حالات -' نیویارک ۱۸۷٦ء (کھنڈروں کی تفصیلات بیان کرنے کے علاوہ شیولر نے ویمبری کی تاریخ پر بھی بحث کی ہے)

* مصنف کی خوش قسمتی ہے کہ ڈینیل مارڈواٹزف کے کچھ غیر مطبوعہ مسودات اس کے حوالے کیے گئے -

٦

متفرق

بیزلی، چارلس ریمنڈ۔ 'موجودہ جغرافیے کی ابتدا'
لندن ۱۹۰۶ — ۱۸۹۷ء
(ایشیا میں جن سیاحوں نے چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں سفر کیا ان کے حالات — تھوڑا سا ذکر شہروں کا بھی کیا ہے)

بیل، ایم۔ ایس۔ 'پیکن سے کاشغر تک عظیم مشرقی تجارتی شاہراہ'
رائل جیوگرافیکل سوسائٹی۔ ۱۸۹۰ء

بلاچٹ، ای۔ 'فضل اللہ راشدالدین کی تاریخ مغل کا تعارف'،
لیڈن ۱۹۱۰ء
(تیمور اور منگ خاندان کے درمیان خط و کتابت کی تفصیلات)

بریش نیڈر، ای۔ 'زمانۂ متوسط اور وسطی و غربی ایشیا کی تاریخ پر حواشی'
(شمالی چین سے متعلق آر۔ اے۔ ایس کی شاخ کا رسالہ)

براؤن، ایڈورڈ۔ جی۔ 'تاتاری مملکت ایران کی ادبی تاریخ ۱۲۶۵ء سے ۱۵۰۲ تک۔' کیمبرج ۱۹۲۰ء
(انتہائی کارآمد کام ہے۔ تاتاریوں اور ایرانیوں میں فرق ظاہر کیا گیا ہے۔ تیمور پر بھی مختصر سی بحث شامل ہے)

کہوں، لیوں۔ "Formation territoriale de l'Asie. Timur et le Second Empire Mongol." (L'Histoire Generale—E. Lavisse and A. Rambaud.)

زپلیکا ، ایم - اے - ' ترک وسطی ایشیا میں ' آکسفورڈ ۱۹۱۸ء
(کتب نامہ نہایت مکمل ہے)

دوبیو ، لوئی - ' تاتاری ' - پیرس ۱۸۴۰ء

اینسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا - گیارھویں اشاعت
(مغل ، سنہری غول ، ترک ، سمرقند ، انگلستان کا ہنری چہارم ،
بغداد اور ماسکو پر مضامین)

ہیلولڈ ، فریڈرک وان - ' روسی وسط ایشیا میں - وسطی
ایشیا کے جغرافیے اور تاریخ پر موجودہ زمانے تک تفصیلی تنقید - '
ترجمہ : تھیوڈور ورگمن - لندن ۱۸۷۴ء

ہولڈن ، ایڈورڈ ایس - ' ہندوستان کے مغل شہنشاہ - '
نیو یارک ۱۸۹۵ء

منوچی - ' تیمور اعظم : مغلوں اور تاتاریوں کے بادشاہ کی تاریخ
مع اس کے درباری حالات کے - ' لندن ۱۷۲۲ء
(چنداں مفید نہیں)

مرگٹ - ' مغلوں کے بادشاہ اور ایشیا کے فاتح تیمور کی تاریخ '
پیرس ۱۷۳۹ء
(نیک نیتی سے عرب شاہ اور شریف الدین کی تاریخوں کو یکجا
کرنے کی کوشش کی گئی ہے)

نیو ، فیلکس - "Expose des guerres de Tamerlan et
de Schah-Rokh dans l'Asie Centrale." بروکسل ۱۸۶۰ء
(صرف اس لیے اہمیت دی جاسکتی ہے کہ اسے 'میزڈاف کے تھامس'
کے بیانات پر مبنی کیا گیا ہے)

پاپاؤسکی - ' وسطی ایشیا میں مخالف طاقتیں - ' لندن ۱۸۹۳ء

رکمرس ، ڈبلیو - رکمر - ' ترکستان کا دوآبہ - ' کیمبرج ۱۹۱۳ء
(تیمور کے ملک کا طبعی جغرافیہ)

سٹین ، سر مارکس - 'سیری نیڈا -' آکسفورڈ ۱۹۲۱ء
(وسطی ایشیا اور مغربی چین کے آثار قدیمہ کے حالات)

یول ، سر ہنری - ' خطا اور وہاں جانے کا راستہ -'
ہکلویت سوسائٹی - دوسرا سلسلہ - شمارہ ۳۳ ، ۳۷ ، ۳۸ اور ۴۱
(زمانۂ قدیم کے سیاحوں اور راستوں پر کارآمد بحث)

زمی نے ، ایل - ' وفات تیمور کی تفصیلات -'
ترکستان کی آثار قدیمہ سوسائٹی کے مذاکرات - آٹھواں سال

(خاص فہرستیں : بووات میں ایرانی ماخذ پر بحث کی گئی ہے - ترکوں اور تاتاریوں کی ابتدائی تاریخ اور سمر قند کے آثار قدیمہ پر زپلیکا میں تفصیلات درج ہیں - گبن نے عثمانی سہموں کے اور یورپی حالات دیے ہیں - نقشوں کے لیے لے سترینج سب سے زیادہ کار آمد ہے - ہاؤ ورتھ کی پہلی جلد میں تیمور سے قبل کے عہد کا نقشہ ہے - مرزا حیدر بھی اپنے عہد کے وسطی ایشیا کا بہت اچھا نقشہ دیتا ہے)

فوجی اصطلاحات (غیر مانوس)

Heavy cavalry	بوجھل سوارہ	Discpline	انضباط
Advance Point	قادم نقطہ	Infantry Battalion	بٹالین
Centre	قلب	Reveille	بیداری بگل
Column	کالم	Out Post	بیرونی چوکی
Division	* لشکر	Tactics	تدبیرات
Reserve	محفوظہ	Strategic	تزویرات
Base	مستقر	Surprise	تحیر
Camp	معسکر	Army Corps	جیش
Main Body	معظم الجیش	Mobility	حرکیت
Advance Guard	مقدمۃالجیش	Cavalry Regiment	رجمنٹ
		Explosive	رنجکی
Rear Guard	مؤخرالجیش	Corps	سپاہ
Left Flank	میسرہ	Mine	سرنگ
Right Flank	میمنہ	Scout	سکاؤٹ
Observer	ناظر	Cavalry	سوارہ (رسالہ)

* کہیں کہیں لشکر کا لفظ اس کے عام مفہوم (forces) میں بھی استعمال کیا گیا ہے جو متن سے واضح ہو جاتا ہے -